زمامِ ملکِ ایام در دستِ ہمایوں
نوید دورِ خوش کامی انیسِ طبعِ موزوں سے

بیادگارِ علامہ فصیح آنریبل میاں سر محمد شاہ دین صاحب ہمایوں (مرحوم)

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

مرتبہ

میاں بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ ایڈیٹر

مولانا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق مینیجر رسالہ ہمایوں نے

مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

محمد انور خوشنویس چوک متی لاہور

پیدا کرتا ہے

اُردو اگرچہ سب سے پیچھے ہے مگر کسی سے نیچے نہیں۔ الحمد للہ کہ انجمن ترقیٔ اُردو نے آخر اپنی زبان کھولی اور مُلک کو ترقیاتِ ادب سے رُوشناس کرنے کا بیڑا اُٹھایا

ہُمایُوں بھی اِس محفل میں ہم عصری کی تمنا رکھتا ہے اگرچہ وہ ہمسری کا دعویدار نہیں!

ہم اپنے احباب کے عموماً اور اہلِ قلم کے خصوصاً منّت گذار ہیں جن میں سے اکثر نے علاوہ وعدۂ اعانت کے ہُمایُوں کی نسبت جو آج پردۂ عدم سے نکل کر دُنیائے وجود میں ظہور پذیر ہوتا ہے یہ کہہ کر اپنے حُسنِ ظن کا ثبوت دیا کہ رسالہ یقیناً اچھا ہو گا۔ یہ ایک خوفناک پیشین گوئی ہے جس سے ہم کانپ رہے ہیں کہ بارِ خدایا! تو ہُمایوں کے ننھے وجود کو احباب کی آرزوؤں کے برداشت کرنے کی طاقت بخشیو!

آنریبل جناب شیخ عبداللہ درا اور علامہ ڈاکٹر اقبال نے بہ التزامِ فرصت مسلسل قلمی اعانت کا وعدہ فرمایا ہے۔ "ترجمانِ حقیقت" سے بجائے پُرانی غیر مطبوعہ نظمیں حاصل کرنے کے اُن کے ارشاد کے مطابق ہم اُن کے تازہ ترین کلام کے طالب و منتظر رہیں گے۔

مرزا اعجاز حسین صاحب اپنے عنایت نامہ میں فرماتے ہیں "جناب میاں صاحب مرحوم کی یادگار میں ایک ادبی رسالہ جاری کرنا نہایت ہی مُبارک خیال ہے۔ ہمایوں نام بھی نہایت موزوں اور مناسب ہے بالخصوص اُن لوگوں کے لئے جن کو مرحوم کی خدمت میں شرفِ نیازمندی حاصل تھا یہ نام نہایت ہی محبوب و دلکش ہو گا۔ مرحوم سے نسبتِ ہم نامی ہونا مجھ کو رسالے کا دلدادہ بنانے کے لئے بالکل کافی ہے"

جناب نیرنگ لکھتے ہیں "رسالۂ ہمایوں کا اجرا مُبارک! میں عرصہ دراز بہت کم اور شاذ و نادر ہی نظم لکھتا ہوں لیکن یہ یقینی ہے کہ جو کچھ بھی کسی وقت جائے گا وہ اسی رنگ میں ہو گا ع سے نتراندز دروں آنچہ درآوندمن است!

حضرتِ گرامی فرماتے ہیں "گرامی ہفتاد سالہ بوڑھا ہے۔ پنجاب نے گرامی کے حواس خمسہ باطل کر دیئے۔ غزل کہنے کا زمانہ نہیں رہا۔ غزالانِ شہری کا تصرف نہیں رہا ؎

جوانے گفت پیرے را چہ تدبیر
کہ یار از من گریزد چوں شوم پیر

جوابش داد پیرِ نغز گفتار
کہ در پیری تو خود بگریزی از یار

گرامی عاشقانہ غزل سے خود بھاگ رہا ہے اور آپ کا حکم ہے کہ کوئی غزل بھیج دو۔ وہ بھی نئی۔ ہاں طبعِ بہانہ خیز و غمزہ فروش کو مجبور کروں گا۔ کچھ کلامِ گرامی خدمت میں پہنچ جائے گا۔

ادب آموزِ گرامی حضرت ڈاکٹر اقبال کا کلامِ معجز نظام ہمایوں میں درج کر دیجئے پھر کلامِ گرامی کی ضرورت نہیں رہے گی ؎

برومند باد آں ہمایوں درخت
کہ در سایۂ اُو تواں برد رخت

کلامِ اقبال معنی خیز ہے کلامِ گرامی بے معنی۔ مگر سرسام نے حملہ کیا، سخت جان گرامی پھر زندہ ہے مگر دل و دماغ مُردہ ہو گئے۔ کلام بے معنی ہو گیا۔ والسلام گرامی"

جناب آنریبل ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ممبر ایگزیکٹو کونسل وائسرائے ان گرانقدر الفاظ میں حوصلہ افزائی فرماتے ہیں:۔

"مَیں گرامی نامہ کا جلد تر جواب دینے سے بوجہ اپنی علالت کے قاصر رہا۔ ۲ نومبر سے دسمبر تک متواتر میں علیل رہا۔ اور ۲ دسمبر کو تو حالت نہایت خراب ہو گئی تھی۔ مگر اب بفضلہ اچھا ہوں اور رفتہ رفتہ اُمید ہے کہ بالکل تندرست ہو جاؤں گا۔ میں آپ کو اجرائے رسالہ پر مبارک باد عرض کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ رسالہ شاندار اور مفید ثابت ہو گا۔ میں ضرور آپ کی فرمائش کے مطابق کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجتا مگر اس وقت حالت ایسی ہے کہ کچھ دیر تک کوشش کر سکوں۔ علاوہ بریں عرصہ سے مجھے عادت بھی نہیں رہی۔ دست بدعا ہوں کہ آپ کو کامیابی حاصل ہو اور جو کچھ خدمت آگے چل کر بندہ میں دریغ نہ ہو گا۔

نیاز خواہ
تیج بہادر سپرو

جناب مولانا عبدالحلیم شرر ایڈیٹر دلگداز لکھنو کی توجہ فرمائی کا تحریر ذیل سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ "مکرمی تسلیم میں نہایت عدیم الفرصت ہوں اور اگلی وہ قوت بھی رخصت ہوگئی ہے۔ تھوڑی بہت فرصت ہوتی ہے وہ ان کاموں کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی جو اپنے ذمہ لے لئے ہیں۔

مگر آپ کے اصرار نے مجبور کر دیا۔ چار صفحوں کا ایک مضمون مرسل خدمت ہے۔ اگر پسند ہو تو درج رسالہ فرمایئے۔ ورنہ واپس کر دیجئے۔ چھپے تو تصحیح کا خاص اہتمام فرمایئے غلطی رہ گئی تو مجھ پر ظلم ہوگا۔ والسلام خاکسار عبدالحلیم شرر"

اہلِ قلم کی خدمت میں مودبانہ التماس ہے کہ بزمِ ہمایوں میں اُن کی تشریف آوری ہمارے لئے باعثِ صد افتخار ہے اور اُن کی کسی تحریر کا زیبِ قرطاس ہونا ہماری طرف سے سپاس گزاری کا ایک روشن ثبوت۔ اس بات کی حاجت نہیں کہ ہم اُن میں سے ہر ایک کو "ادیب سحر نگار" یا "علامۂ بے ہمتا"، "فاضلِ اجل" یا "یکتائے روزگار" کہہ کر ناظرین سے اُن کا تعارف کرائیں یا قارئین کو ہر مضمون کے متعلق تنبیہ کر دیں کہ "یہاں دریا کوزے میں بند ہے یا ادب کی پری کو تحریر کے شیشے میں اُتارا گیا ہے۔ یہ حضرت ہمارے سکاٹ ہیں اور وہ رشکِ شکسپیئر انکی تخیلی جولانیوں کے آگے ارسطو کی فکر گردِ راہ ہو کر رہ جاتی ہے یا اُنکی افسانہ نگاریوں کے سامنے وکٹر ہیوگو اور اسکندرِ ڈوما کی انشا پردازی پانی پانی ہوتی ہے"۔ اس سے ہماری یہ مُراد نہیں کہ ایڈیٹر کے لئے کسی لکھنے والے کی قابلیت کی داد دینا گناہ میں داخل ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ادب اُردو کے موجودہ دَور میں اہل الرائے کا ذوق ابھی ایسی تحریک کا مرہونِ منت ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اِس سلسلے کو طُول دے کر مدحت سرائی کو شیوۂ اِدارت بنا لینا بھی کچھ مُدت بعد بجائے دماغی دلچسپی کے ذہنی اضمحلال کا موجب ہو جاتا ہے۔ ہمارا روئے سخن کسی خاص رسالے کی طرف نہیں ہے ہم صرف اپنے معاونین سے اِس بات میں مکمل آزادی چاہتے ہیں!

جہاں نما

شاہانہ کفایت دُنیا والوں کی طرح شاہ انگلستان بھی عالمگیر گرانی کے بارے متاثر ہوکر اپنے خانگی اخراجات میں عملی طور پر کفایت کی تجویزیں کر رہے ہیں۔ تمام اصلاحی اختیارات ایک نئے لارڈ چیمبرلن (میر تشریفاتی) کے ہاتھ میں دیدیئے گئے ہیں اور اُن کا محکمہ دولتِ انگلستان کے دیگر محکمہ جات کی طرح منتظم کیا جائے گا۔ تمام عہدہ دار مثلاً میر اسپ وغیرہ جن کو بغیر کام کئے تنخواہیں ملتی تھیں اب فقط برائے نام موجود ہیں اور اُن کے مشاہروں میں غایت درجہ تخفیف کردی گئی ہے۔ اگر بادشاہوں کا یہ حال ہے تو جو لوگ پہلے ہی بھوکے مرتے تھے۔ اُن کی زندگی میں تخفیف کہاں ہوگی اور کیونکر؟

نئے جنگی خطرات اُدھر واشنگٹن کانفرنس میں دُنیا بھر کے مہذب وفرزانہ لوگ جنگ محاربہ کو ناممکن بنا دینے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں اِدھر دولتِ امریکہ ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتی ہے کہ ہم نے سولہ انچہ کے دہانے کی ایک قیامت خیز توپ ایجاد کی ہے جس کی آزمایش واٹر ٹاؤن کے سلاح خانے میں کامیابی کے ساتھ ہو چکی ہے۔ اِس توپ کے ذریعے سے ہر پچاس ثانیئے کے بعد ہزار پونڈ وزن کا ایک گولہ بیس میل کی مسافت پر عین زد پر پھینکا جا سکتا ہے۔ توپ کا وزن تیس ٹن (۸۴۰ من) ہے اور وہ صرف قلعوں کی محافظت کا کام دیگی اُس کا طول ۵۳ فیٹ ۲ انچہ ہے اور اُس کے تیار کرنے میں دو برس صرف ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ایک مہلک ہوائی تارپیڈو ایجاد ہوئی ہے جس میں زہریلی گیس بھردی جاتی ہے یہ کل ہوا میں دو سو میل تک خود بخود اپنا کام کر سکتی ہے اور بادِ مخالف کے باوجود خطِ مستقیم میں چلتی ہے۔ ماہرین کا دعولے ہے کہ اُس سے شہروں کے شہر اور بیڑوں کے بیڑے برباد کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ہیں تمدنِ جدید تریں کی ترقی کے جہاں سوز کرشمے!

انجمن حسینانِ مغرب۔ مغربی دنیائے نسواں میں تجویزیں ہو رہی ہیں کہ حُسن کی ایک بین الاقوامی انجمن قائم کی جائے جس کا مقصد نسوانی حُسن کی تخلیق و تکمیل ہو اور جو اپنے نصب العین

کی تحصیل میں شاہی انجمنِ اشاعتِ علوم کی طرح ترقی و توسیع کے ذرائع پر غور کرے۔ مُدعا یہ ہے کہ حُسن کو ایک مستقل علم بنا دیا جائے (مصنف "وضعِ اصطلاحات" کے اصول کے مطابق بشرطِ ضرورت اُردو میں اس کا نام حُسنیات ہونا چاہیئے)۔ انجمن کی ناظم اور کارکن خواتین عالمِ اسفل کی حسین ترین ہستیوں میں سے منتخب کی جائیں گی۔ ہمارے وارفتہ مزاج شعرا کو یہ موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ لیجئے! پروازِ تخیل کے لئے فضائے حُسن گرد و غبار سے پاک ہو چلی!

وضع پسند اصحاب کے لئے۔ انگلستان کا ایک اخبار رقمطراز ہے کہ مسز سمتھ ولکنسن (ساکن نوٹنگم) دُنیا کی سب سے زیادہ خوش لباس عورت ہے۔ جب وہ دو تین ہفتے کے لئے تفریح کے طور پر لندن آتی ہے تو اپنے ہمراہ ایک سَو گرگابیاں۔ تین سَو ساڑھے اور دو سَو ٹوپیاں لاتی ہے۔ اور اپنا دس لاکھ پونڈ کا گلوبند پہلے ہوئے لندن کی سیر گاہوں میں مصروفِ خرام رہتی ہے۔ اِن ایام میں وہ بالعموم دن میں چار پانچ دفعہ تبدیلِ لباس کرتی ہے۔ دیکھئے اوروں کی جنتِ نگاہ بننے میں کتنی زحمتیں اُٹھا اُٹھا کر نوعِ انسان کی خدمت کا حق ادا کرتی ہے!

خیر الناس من ینفع الناس۔

عالمِ بالا کے خوفناک باشندے۔ مہم مونٹ ایورسٹ کی کوہ پیمائیوں کے دوران میں بعض مقامات پر جہاں انسانی آبادی ممکن نہیں انسانی قدموں کے سے نشان دیکھے گئے۔ قلیوں نے ان لوگوں کے متعلق عجیب و غریب حکایات بیان کی ہیں لیکن کسی یورپین نے انہیں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اہلِ تبت بیان کرتے ہیں کہ ان ویران پہاڑوں میں ایک "ذلیل برفانی قوم" آباد ہے جن سے ہم میل جول نہیں رکھتے۔ اُن کے جسم سب بالوں سے ڈھکے ہیں اور وہ مردم خواری کو بہت مرغوب جانتے ہیں۔

ردی کاغذ۔ گذشتہ سال مجلسِ بلدیۂ لندن نے اپنے ردی کاغذات کی فروخت سے ایک ہزار دو سَو بیس ۱۲۲۰ پونڈ حاصل کئے!

بشیر احمد

علمی شعاعیں

ہماری کائنات۔ کس قدر وسیع ہے ہماری چھوٹی سی کائنات جو خود کائنات کے مقابل میں ایک ذرّے کے برابر بھی نہیں! مونٹ ولسن کی رصد گاہ کے تازہ فوٹوجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ روشنی جو ۱۸۶۰۰۰ میل فی ثانیہ کی رفتار سے چلتی ہے ہماری اس چھوٹی سی کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں دس لاکھ برس صرف کر دے۔ جان برے نے جو انجمنِ ہیئت دانانِ فرانس کا ایک رُکن ہے اندازہ کیا ہے کہ ہماری یہ کائنات کتنی ہی ننھی کیوں نہ ہو پھر بھی ایک حد سے دوسری حد تک ۵،۸۶۹،۷۱۳،۶۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل کا فاصلہ رکھتی ہے۔ ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ غور فرمائیے ہمارا نظامِ شمسی کتنا چھوٹا ہو گا جب کہ چار ہزار چار سو ۴۴ ایسے نظامات درکار ہیں کہ پاس پاس رکھے جانے سے وہ سب سے قریب کے ستارے کو چھو سکیں۔

کیا لندن دُنیا کا سب سے بڑا شہر ہے؟ امریکی "قومی مجلسِ جغرافی" برطانیہ کے اِس دعوے کا کہ لندن دُنیا کا سب سے بڑا شہر ہے اعتراف نہیں کرتی۔ تازہ ترین برطانوی اعداد کے مطابق لندن کی آبادی ۷،۴۷۶،۱۶۸ ہے اور نیویارک کی صرف ۵،۶۲۹،۰۴۸۔ لیکن مجلسِ جغرافی کا اعتراض ہے کہ قانوناً بحیثیت بلدیہ لندن کو صرف ضلع لندن تک محدود ہونا چاہیئے۔ بصورت موجودہ لندن کے پھیلاؤ میں کوئی رکاوٹ سدِ راہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُس کا دائرہ حکومت معین نہیں ہے جب کہ نیویارک کا نام دریائے ہڈسن سے پرے کی آبادیوں پر عائد نہیں ہو سکتا۔ بلدیہ نیویارک کا رقبہ بلدیہ لندن سے تگنا ہے۔ اگر مرکز شہر سے پندرہ پندرہ میل تک لندن اور نیویارک کی آبادی شمار کی جائے تو امریکی شہر انگریزی دارالسلطنت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہو گا۔

جُرم کی بیخ کنی۔ طبی دُنیا ڈاکٹر ولیم برونینگ کی تازہ ترین انکشافات پر جن کا موضوع

کے نوجوانوں کے ساتھ شریک ہو کر اپنا کلام سنایا کرتے۔ ایک موقع پر انہوں نے نئے مذاق کے مطابق ساون بھادوں پر ایک نظم لکھی جو لائسٹنر صاحب کو اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے باوجود اس امر کے کہ میاں صاحب نے ابھی انٹرنس کا امتحان پاس نہ کیا تھا انہیں قانون کے لکچر سننے اور وکالت کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

اس اثنا میں والدِ مرحوم نے بھی خفیہ طور پر شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن علانیہ اس کا اعتراف نہ کرتے تھے کیونکہ اُن کو احتمال تھا کہ بڑے بھائی اِسے تضیعِ اوقات کا موجب سمجھ کر انہیں طبع آزمائی سے روک دیں گے۔ مگر مذاقِ شعر اور مشقِ سخن وہ جذبات نہیں جو چھپائے چھپ سکیں یہ ایسی دل پسند گدگدیاں ہوتی ہیں جن کا اظہار ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی طریق سے عمداً یا بغیر جانے بوجھے نہ ہو جائے۔ چند شعر ایک دفعہ اُن کے بھائی کی نظر پڑے۔ پوچھا تمہارے شعر ہیں؟ جواب دیا "ہاں! مگر بڑے بھائی کو نہ بتانا"۔ بڑے بھائی کو خبر ہوئی تو انہوں نے خلافِ توقع تعریف کر کے حوصلہ بڑھایا اور مشاعرے میں غزل پڑھنے کو کہا۔ اُس وقت سے مشاعرے میں برابر حصہ لیتے رہے اور آخر کار جب ۱۸۸۲ء میں انگلستان کو روانہ ہوئے تو ایک خاصا دیوان اپنے بھائی کے پاس بطورِ امانت رکھ گئے۔

ولایت سے واپس آنے کے دو تین روز بعد بھائی نے امانت پیش کی۔ لیکن یہاں خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ عشقیہ غزلیات کا اتنا بڑا ذخیرہ دیکھ کر طبیعت گھبرائی اور چاہا کہ اِسے تلف کر دیں۔ بھائی نے روکا اور کہا کہ "اس میں تمہارے ایامِ شباب کے اچھوتے پن کی نشانیاں ہیں جو اک اپنی سی دلکش ادا رکھتی ہیں۔ انہیں برباد نہ کرو"۔ مگر انہوں نے نہ مانا اور یہ کہہ کر اُس "دفترِ بے معنیٰ" کو جلا دیا کہ "یہ خیالات تضیعِ اوقات کا باعث تھے۔ مجھے ان کا زندہ رکھنا کسی طرح گوارا نہیں"۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اِس مجموعہ میں بہت سی عمدہ فارسی غزلیات اُن کی تھیں۔ چند غزلیں جو رسالۂ گلدستۂ سخن سے دستیاب ہو گئی ہیں نمونہ کے طور پر اُن کے مجموعۂ کلام میں درج کی جائیں گی۔

نظم کے علاوہ مضامینِ نثر سے بھی والدِ مرحوم کی قوتِ تحریر و انہماکِ خیال کا اندازہ ہوتا ہے۔ جن دِنوں وہ اسکول میں تعلیم پاتے تھے اُن کے بڑے بھائی باوجود اپنی کم سنی کے میاں خاندان میں رسومِ مذمومہ کی بیخ کنی پر تلے بیٹھے تھے اور آئے دن عزیزوں کی محفل میں یہ اصلاحی جنگ و جدل قائم رہتی تھی۔ والد کو اس اصلاحی تحریک سے بہت دلچسپی تھی لیکن انہوں نے مقامی مباحث کو ناکافی سمجھا

اور دُنیائے ادب میں اس کی قومی اہمیت کو ظاہر کرنے کے خیال سے اخبار رہبرِ ہند لاہور میں مضامین کا ایک دلچسپ سلسلہ شروع کیا جن میں سے چند اقتباسات کسی آئندہ نمبر میں ہدیۂ ناظرین کئے جائیں گے۔

بچپن میں پڑھنے کے سوا اُنہیں کوئی اَور شغل نہ تھا۔ تاروں کی چھاؤں اپنے گاؤں سے چلتے اور پَو پھٹنے پر سکول میں پہنچ جاتے۔ گھر واپس آکر پھر اپنی کتابوں میں مصروف ہو جاتے اور آٹھوں پہر مطالعہ کی دُھن میں مگن رہتے۔ صرف ایک لٹو گھُمانے کا شوق بچپن سے تھا اور یہی تفریح طبع کا تنہا سامان تھا۔ جب کالج میں تعلیم پانے لگے تو گاہے گاہے کُشتی لڑتے اور کبڈی کھیلتے۔ چنانچہ عجیب اتفاق ہُوا کہ ولایت کو روانہ ہونے سے دو تین روز پہلے کبڈی کھیلتے وقت بازو پر سخت چوٹ آگئی لیکن روانگی ملتوی کرنے پر راضی نہ ہُوئے اور بازو کو اُسی طرح گلے سے لٹکائے ہُوئے گھر والوں سے رخصت ہُوئے۔

یہ بات ذکر کے قابل ہے کہ والدِ مرحوم جوانی کے دنوں میں اکثر شالامار باغ میں رہا کرتے تھے اور وہیں روز و شب مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔ یہ شاہجہانی چمنستان اول میں سات وسیع باغات پر مشتمل تھا جن میں اب صرف تین باغ موجود ہیں اور انہیں کے منتصل مجموعہ کو ہم شالامار باغ پکارتے ہیں۔ اِس کی دُور دُور تک پھیلی ہُوئی بلند و عالیشان دیواریں اس کے شاہی محلات اور حمّام اس کی پختہ روشیں اور آبجوئیں کہیں شوکت کا اقرار کرتی ہیں اور کہیں حُسن کا اظہار۔ محل میانے کے منظرِ دلکشا سے وہ فردوسِ نگاہ جلوہ آرا ہوتا ہے جہاں ایک ہلکی آواز سے گرنے والی چادرِ آب تختِ مرمر کے نیچے سے بہتی ہُوئی اک وسیع تالاب کو معمور کرتے ہُوئے ساون بھادوں کا سماں دکھاتی ہے اور پھر باغ فیض بخش کی آبجوؤں میں بہتی ہُوئی نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ یہ دِلکش وسیع باغ صدیوں باغبان پور کے نونہالوں کا گہوارۂ طفلی بنا رہا اور والدِ مرحوم نے بھی اپنے زمانۂ طالب علمی کے اکثر دن اور راتیں یہیں بسر کئے۔ خود اُنہیں اس امر کا احساس تھا کہ اُن کے عنفوانِ شباب کی خیال آفرینیاں مناظرِ شالامار ہی کے سانچے میں ڈھلتی رہیں۔ وہ حمّام والے برُج کی نچلی منزل میں رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ برُج کی مرمت ہو رہی تھی لیکن ابھی کام پختہ طور پر ختم نہ ہُوا تھا وہ اپنے کمرے سے نکل کر باہر قدم رکھنے کو تھے کہ اتفاق سے اُوپر کی ساری عمارت منہدم ہو کر آن کی آن میں نیچے گر پڑی۔ سینکڑوں ہزاروں پتھر اُن کے سامنے اور پیچھے کو گرے اور چند لمحوں کے لئے گویا دُنیا آنکھوں میں دُھواں دھار ہوگئی۔ حیران تھے کہ تقدیر نے کہاں لاکر کھڑا کر دیا اور کس طرح صاف بچا لیا۔ ہاں! مشیتِ ایزدی کو ابھی اُس نوجوان سے ہزاروں کام لینے تھے

اور قدرت کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ وہ اپنے ایک منظورِ نظر کو کارگاہِ عالم میں کچھ کر دکھانے کے لئے کس طرح ہلاکت کی سنگین گرفت سے رہائی دلا سکتی ہے! عظمت کا دریا اکثر ایسی ہی پیچ و تاب کھانے والی آبجوؤں سے ہو کر بہتا ہے!!

دائرۂ تعلیم میں والدِ مرحوم ہمیشہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز رہے۔ چھ برس کی عمر میں کلام مجید ختم کیا۔ مڈل کے امتحان میں اوّل رہے اور انٹرنس میں پنجاب بھر میں انگریزی میں اول تھے۔ یہاں یہ بات ذکر کے قابل ہے کہ اُن کی صاحبزادی نے بھی انٹرنس کا امتحان اسی امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ بی۔ اے میں پنجاب میں دوم تھے اور اس کے بعد ولایت میں جاکر اپنے امتحانات میں خصوصیت کے ساتھ کامیابی حاصل کرتے رہے۔ نیز لنڈن کی بعض انجمنوں اور اخبارات میں اپنی قوتِ تقریر و تحریر کے بل پر ایک نمایاں حصہ لیتے تھے۔

انگلستان سے واپس آکر اُن کے انگریزی لکچروں اور اُردو تقریروں سے اُن کی علمیت اور جودتِ طبع کی دھاک بندھ گئی۔ سید عبداللطیف مورخِ لاہور اپنی کتاب میں لکھتے ہیں[۱] کہ "میاں صاحب خداداد طبیعت رکھتے ہیں۔ اُن کی عام ادبی قابلیت اور انگریزی لیاقت مسلّمہ ہے۔ بحیثیت ایک مُقرّر کے اُن کی تقریروں نے ایک ہمہ گیر شہرت حاصل کر لی ہے اور اُن کی تحریر سے اُنکی استعداد کا پتہ چلتا ہے۔ نوجوانانِ پنجاب اُن پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ ابھی نو عمر ہیں لیکن اُنکے آداب اس قدر مہذب اور اُن کا مزاج اس قدر پسندیدہ ہے کہ اُن کے سب ہم وطن اُنہیں محبّت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"۔ اِس امر کا احساس کر کے کہ اُن کے ہم قوم بھائی میدانِ تعلیم میں اپنی ہمسایہ قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور علومِ حاضرہ سے بے بہرہ ہونے کے باعث ضروریاتِ زمانہ سے مُطلق آگاہ نہیں انہوں نے ایک انجمنِ نوجوانانِ اسلام[۲] کی بنیاد ڈالی جس میں ہر ہفتہ مباحث کا ایک دلچسپ و سُود مند سلسلہ قائم ہو گیا۔ پنجاب کے بعض نامور مُسلمانوں نے پہلے پہل اِسی انجمن میں فنِ تقریر و تحریر سیکھا اور اُن کی اظہارِ خیالات کی قوت بھی یہیں نشو و نما ہوئی۔

پنجاب یونیورسٹی کی مجلسِ انتظامیہ میں وہ ایک خاص اہل الرائے سمجھے جاتے تھے اور اُنکے خیالات کا صوبہ کی تعلیم پر مُعتدبہ اثر پڑا۔ وہ تعلیمِ نسواں کے ایک زبردست حامی تھے اور اُن کا خیال

---

[۱] تاریخ لاہور صفحہ ۲۴۴ [۲] ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن

تھا کہ کسی قوم کی عورتیں اُس کی رُوحِ رواں ہونے کے باعث اُس کی ترقی و تنزل کی نسبتاً حصہ دار ہوتی ہیں +

علاوہ اس کے وہ علیگڈھ کالج کے اُن رضا کار مددگاروں میں شامل تھے جنہوں نے اُس زمانے میں گویا "سرسید کی فوج" میں داخل ہو کر اپنے ہم قوموں کو قعرِ ذلت سے بچانے میں اک حیرت انگیز کامیابی حاصل کی + ولایت سے واپس آنے کے تین سال بعد انہوں نے محمڈن کانفرنس میں مسلمانانِ پنجاب کی تعلیمی حالت پر ایک معنی خیز بلکہ یُوں کہئیے کہ ایک بیدار کُن لکچر دیا۔ سرسید احمد خاں اُس لکچر کی عمدگی اور مُقرر کی سنجیدگی سے اس قدر متاثر ہُوئے کہ اُنھوں نے آئندہ سال والدِ مرحوم کو جب کہ اُن کی عمر ابھی ۲۶ سال کی تھی محمڈن کانفرنس کی صدارت پیش کی۔ اُن کی برجستہ اور سُود مند اُردو تقریروں سے علیگڈھ والوں پر اُن کی علمیت اور قُوتِ بیان کا سکہ بیٹھ گیا اور آئندہ کوئی اہم کام نہ ہوتا تھا جس میں اُن کے موجود ہوتے ہُوئے سرسید اُن سے مشورہ نہ لیتے تھے + باعظمت شخص ہمیشہ عظمت شناس ہوتا ہے۔ وہ کبھی دوسروں کے محاسن کو نظر انداز نہیں کرتا نہ اپنے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے۔ منصبِ صدارت کے فرائض کی انجام دہی میں ایک موقع پر بطریقِ احسن اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا۔ مولانا نذیر احمد صاحب نے حسبِ معمول اپنی ایک تقریر کو آیات اور عربی مقولات سے مُزیّن کیا۔ والد عربی کے عالم نہ تھے اگرچہ اُس سے قطعی بے بہرہ بھی نہ تھے۔ مولانا کے تبحّر کی تعریف کرتے ہُوئے یہ لطیف شعر پڑھا اور حاضرین کو لٹا دیا ؎

زبانِ یارِ من تُرکی و من تُرکی نمی دانم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چہ خوش بُودے اگر بُودے زبانش در دہانِ من

شام کو احباب کے جلسے میں مولانا شبلی یا شائید نواب مُحسن الملک نے کہا کہ "اور تو قوم خوابیدہ کو بیدار کرنے کی صدائیں تھیں لیکن آج آپ نے ہم بڈھوں کو جو پرانی وضع کے دو چار جام پلا دیئے اُن کا خُمار مُدت تک باقی رہے گا" اس کے برسوں بعد جب سرسید عالمِ بقا کو رحلت کر چُکے تو علیگڈھ کالج کی بہبودی کے لئے وہ عرصہ تک اک نمایاں خدمت ادا کرتے رہے۔ سرسید کو اُن سے اور اُنہیں سرسید سے اِک خاص اُنس تھا۔ یہاں تک کہ کسی شخص کے دُنیا سے گذر جانے پر وہ اِس قدر مغموم اور آبدیدہ نہیں ہُوئے جتنے اُس رہبرِ ملّت کی وفات پر +

۱۹۱۳ء میں وہ دوبارہ کانفرنس کے صدر منتخب ہُوئے اور اُن کا خطبۂ صدارت بلحاظ اپنی فصاحت اپنی نوعیت تجاویز اور اپنی جدتِ خیالات کے پسندیدۂ خاص وعام ہُوا۔ اس میں اُنھوں نے

اُردو شاعری کی اصلاح اور تعلیمِ نسواں کی اہمیت پر بہت زور دیا اور قومی فلاح پر اِن کے اثرات کا اندازہ کر کے قوم کی توجہ کو اُس طرف مبذول کیا۔

وہ مختلف انجمنوں کے ممتاز عہدوں پر فائز رہے اور اُن مسئلات پر جو بہبودئ عام سے متعلق ہوتے تھے وہ اخبارات میں بلاخوف رائے زنی کرتے تھے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے باہمی تعلقات میں مغائرت اور تلخی پیدا ہونے کے اسباب کو بیان کر کے اُنھوں نے اخباری دُنیا میں اس کے متعلق بے باکانہ انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اُس زمانے میں جب کہ ابھی حاکم و محکوم کا علانیہ طور پر تصادم نہ ہُوا تھا اُن کا نفس معاشرتی اور سیاسی مساوات کی عدم موجودگی کو شِدت کے ساتھ محسوس کرتا تھا۔ وہ یورپ میں محاربۂ عظیم کے ہمہ گیر اثرات کو اپنی دُوربیں آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ خود اختیاری کی یہ وحشت خیز آندھی مغرب سے اُٹھ کر دُنیا بھر میں اک انقلاب شدید پیدا کر دے گی۔ اگرچہ اُن کو اپنی عمر کے بیشتر حصے میں سکوں پسند سیاست ہی سے پالا پڑا اُن کے "کلکِ خیال انگیز" نے اپنی آخری تحریر میں یہ صاف لکھ دیا کہ ؎

جنگِ عالمگیر نے دُنیا کی کایا دی پلٹ
مہر و مہ کہتے ہیں یہ دورِ زمانہ اَور ہے

ایشیا کی بیداری پیشِ نظر تھی اور قومیت کا جذبہ بیقرار ؎

رُوحِ فردوسی فلک پر محوِ حیرت کیوں نہ ہو
شاعرِ ایراں کا قومی ترانہ اَور ہے
نوجواں اقوام کی چِتون بدل جائے نہ کیوں
زالِ دُنیا کی ادائے دلبرانہ اَور ہے

گورنمنٹ نے اُنہیں یکے بعد دیگرے اعزازات عطا کئے۔ وہ پنجاب کی مجلسِ وضعِ قوانین کے رُکن نامزد کئے گئے اور بعد میں عدالتِ عالیہ میں جج مقرر ہُوئے جہاں وہ عارضی طور پر چیف ججی کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچ گئے۔ وہ اُن چند در چند نامور آدمیوں میں تھے جنہیں انگریز اور ہندوستانی دونوں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُن کی قوتِ اخلاق اور علمی قابلیت کا دونوں لوہا مانتے تھے۔

انگریزی میں اُن کی زبان دانی مشہور تھی۔ اُن کا طریقِ گفتگو، اُن کا لب و لہجہ، اُن کی شُستہ زبان اور اس پر ایک مختصر اور مدلل اندازِ بیان گویا سونے پر سہاگے کا کام دیتا تھا۔ اُنکی طرزِ بحث مخمصانہ کبھی نہ ہوتی تھی لیکن وہ مخالف کو اطمینان سے سُن کر دو چار ہی باتوں میں لاجواب کر دیتے تھے۔ والدِ مرحوم کی طبیعت ہمیشہ فکر و غور کی طرف مائل رہتی تھی اور اُس کے ساتھ وہ تھوڑی ہی دیر میں ہر شئے کی تہ کو

پہنچ جاتے تھے اور پھر ایک ایسا فیصلہ کُن اصُول قائم کرتے تھے کہ کسی ذی فہم کا اُس سے سرتابی کرنا اک امرِ محال ہو جاتا تھا۔ وہ مصلحت پر نظر رکھتے تھے لیکن مصلحت کی حدِ فاصل ہر امر میں ضبط ہوتی تھی جس سے سرمو تجاوز کرنا طُغیان و کفر تھا۔ یہ سب کچھ محض اک عادت کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے دماغ میں قوتِ اخلاق اُن کے دِلی عقیدوں کی سیرابی سے نشو و نما پاتی تھی۔ راستی اُن کا ایمان تھی۔ سیدھے رستے چل کر ترقی کئے جانا یہ اُن کے نزدیک انسانیت کا نصب العین تھا۔ وہ بیکار نیکی سے مُتنفر تھے لیکن عملِ صالح کو پائداریِ حیات کی بُنیاد سمجھتے تھے۔ اُن کا موضوعِ پند و نصیحت ہمیشہ عمل تھا اور عمل ہی اُن کا اپنا شغل تھا۔ شباب میں طبیعت ظرافت کے مزے لیتی تھی لیکن اس کا لُطف صرف دائرۂ احباب میں وہ لوگ اُٹھاتے تھے جو اُن کے ہم خیال و ہم مذاق ہوتے تھے۔ اس کے بعد کُچھ صحت کے تقاضا سے اور کچھ اس سبب سے کہ نوجوانوں کو ترقی کی ترغیب دیتے رہنا اپنا فرضِ منصبی خیال کرتے تھے طبیعت زیادہ متین اور خلوت پسند ہو گئی۔ مثل مشہور ہے کہ کالے کے آگے چراغ نہیں جلتا۔ والد مرحوم ایک ایسی شخصیت رکھتے تھے جس کی موجودگی میں مخاطب کے لئے کسی نازیبا فعل کا ارتکاب نہایت دشوار کام ہو جاتا تھا۔ ہر شخص اور ہر شئے کی اصلاح اُن کے مدِ نظر تھی اور یہی وجہ تھی کہ بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر لیکن در اصل اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کی غرض سے اُن کی مُلاقات سے پرہیز کرتے تھے۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے اور اس پر خوش تھے کہ اُن کی قوتِ اخلاق کے سامنے مقابلہ کرنے والے اپنے ہتھیار ڈال دیں۔ دُنیائے ادب کے بعض کے تاریک گوشوں میں بھی وہ اصلاح کے شمع بردار رہے۔ لچھے دار زبان جو تخریبِ اخلاق کا زہرِ قاتل اپنے اندر پنہاں رکھتی ہو اُن کے دل کو دُکھ دیتی تھی اور صاف و سادہ طرزِ بیان جس میں پاکیزگی کا جوہر عیاں ہو اُنہیں بھلی معلوم ہوتی تھی۔ ناول کے مطالعہ کو وہ نوجوانوں کے لئے قاطعِ حیات تصور کرتے تھے اور ہمیشہ سنجیدہ و متین تحریروں سے زندگی کا سبق لینے کی ترغیب دیتے تھے۔

عُمر بھر اُن کا نفس مطالعہ میں مستغرق رہا۔ بچپن کی راتیں اور جوانی کے دِن کُتب بینی میں گذرے کتابوں میں دُنیا بھر کی سیر کی، کتابیں ہی رفیقِ زندگی ہو کر رہیں اور کتابوں ہی سے نشیب و فرازِ ہستی میں گویا مشورت لیتے رہے۔ عُمر کے پچھلے چند سالوں میں اپنی مشغولیت کے باعث کتابوں سے مجبوراً دُور رہنا پڑا لیکن مطالعہ کی عادت پھر بھی بجائے کم ہونے کے بڑھتی اور ترقی پاتی گئی۔ پہلے کتابوں کا مطالعہ

تھا اب نوعِ انسان اور دنیا کا۔ قاعدہ ہے کہ مطالعہ کرنے والا دیکھتا سب کچھ ہے۔ کہتا مُنہ سے کچھ نہیں یہی حال اُن کا اپنی عُمر کے آخری سالوں مین تھا۔ ہر شخص اور ہر شئے کو بغور دیکھنا اور اُس کا مطالعہ کرنا یہ اُنکی طبیعت کا شغل ہو گیا تھا اور اس شغل کو انھوں نے اس حد تک دلچسپ و دل آویز پایا کہ دماغ جو شائد کتب بینی سے سیر ہو چکا تھا دل کا ہم نوا بن گیا اور روز و شب دُنیا و ما فیہا کے مظاہر میں مستغرق رہنے لگا!۔

اصلاح کی دُھن اور مطالعہ کی اس چاشنی نے اُنھیں اپنا آپ بھُلا دیا۔ فرائضِ حیات پر نظر تھی لیکن اپنے آسائش و آرام سے بے خبری۔ والدِ مرحوم دُنیا میں ایک زبردست دل و دماغ لے کر آئے تھے لیکن ایک کمزور و منحنی جسم۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ عُمرِ طبعی پانے سے برسوں پہلے نقاہت کا شکار ہو کر عالمِ جاودانی کو رحلت کر گئے۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ مَیں نہیں جانتا لوگ موت سے کیوں ڈرتے ہیں۔ قدرت نے جو قانون مقرر کیا ہے اُس میں کیا قباحت ہو سکتی ہے؟" یہ بھی کہتے تھے کہ "موت آج آ جائیگی تو مجھے مرنے کو تیار پائے گی" ہم حیرت سے یہ گفتگو سُنتے تھے۔ کب پتہ تھا کہ ظالم موت اُس جسم و جان کا خاتمہ کر کے اک محبوب شخصیت کو جلد ہم سے جُدا کر دے گی۔

اپنی مرگ سے ۲۶ دن پیشتر چیف کورٹ میں کام پر گئے۔ یہ اِن کی خواہش تھی کہ کام کرتے کرتے ہی جان دے دوں۔ بستر پر مہینوں لیٹ کر فراغت کا مُنہ نہ تکتا رہوں۔

چنانچہ ۲؍ جولائی ۱۹۱۸ء کو جب آفتاب غروب ہو رہا تھا یہ مہرِ سعادت بھی حیاتِ ابدی کے ناپیدا کنار سمندر میں ہمیشہ کے لئے رُوپوش ہو گیا۔

ڈاکٹر اقبال نے تاریخ کہی ؎

در گلستانِ دہر ہُمایونِ نکتہ سنج　　آمد مثالِ شبنم و چوں بُوئے گُل رمید
می جُست عندلیبِ خوش آہنگ سالِ فوت　　علامۂ فصیح زہر چار سُو شنید
= ۱۳۳۶ھ　　۴ × ۳۳۴

بشیر احمد

کلامِ ہمایوںؔ

دعوے سخن وری کے ہمایوںؔ عبث ہیں سب
پہلے مذاقِ شعر تو پیدا کرے کوئی

اہلِ مغرب کا قول ہے کہ زمانہ اپنے حالات کے مطابق شاعر پیدا کیا کرتا ہے۔ شاعری کی تاریخ اس دعوے کو تسلیم کرتی ہے۔ یادش بخیر جب اہلِ عرب کے سب سے زیادہ شیریں گیت میدانِ قتال کی رجز خوانی تھی۔ جب معرکۂ کارزار کی بجائے بسترِ مرض پر مرنا نامردی کی موت میں شمار ہوتا تھا شجاعت وبسالت کے اس یادگار دور میں جو شاعر اُٹھا نعرۂ جنگ بلند کرتا ہُوا اُٹھا۔ عمرو بن کلثوم جیسا قہرمانِ شجاعت وخودداری اسی عہد کی شاعر آفرینی کا نتیجہ ہے جس کے ایک قصیدہ نے اس کے قبیلے بنو تغلب کو دو صدی تک بہادر بنائے رکھا۔ یہ شجاعت دہزبری کچھ مردوں ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی عرب کی صنفِ نازک بھی اس فخر میں ایک حریف کا درجہ رکھتی تھی۔ کبزہ ام شملہ اپنے بھائی سہم کے قتل ہونے پر اپنے بیٹے شملہ کو یہ کہہ کر قوم قاتل کے ساتھ جنگ کرنے پر اُبھارتی ہے۔

"فیا شمل شمّر واطلب القوم بالذی ۔۔۔ اصبت ولا تقبل قصاصا ولا عقلاً"

اے شملہ! جنگ کے لئے کمر باندھ لے اور قوم قاتل کو تلاش کرکے اُن سے انتقام لے۔ دیکھ خونبہا اور قصاص مت قبول کرنا کہ یہ درماندہ اور عاجز لوگوں کا کام ہے۔

عورت ذات ہے مگر اس کی خوددارانہ شان ملاحظہ ہو کہ نہ خونبہا کی گراں قدر رقم لینے پر راضی

ہے کہ اسے قومی عار سمجھتی ہے نہ قصاص کو کافی جانتی ہے کہ ایک کے بدلے میں صرف ایک کی گردن مارنا کوئی بہادری ہے اور نہ مقتول کے خون کا احترام۔ بلکہ قاتل کی پوری قوم کو تہ تیغ کرانا چاہتی ہے۔ ہندوستان کے نوجوان جنہیں اپنے سایہ سے بھی ڈر لگتا ہے۔ عرب کی صنف نازکتر (بچوں) کی فتوت و بلند ہمتی سے سبق لیں۔ زیادۃ الحارثی کا دوازدہ[۱۲] سالہ لڑکا مسور ابن زیادہ والی مدینہ کی طلبی پر عرب کے مشہور آتش نگار ہدبتہ ابن خشرم سے اپنے باپ کا قصاص لینے آتا ہے۔ عمائد قریش (جن میں حضرت امام حسینؓ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور خود والی مدینہ حضرت سعیدؓ ابن العاص بھی ہیں) ہدبہ جیسے گرانقدر شاعر کو قصاص کی بھینٹ چڑھتے دیکھ کر محسوس کرتے ہیں۔ مسور کو دیت (خونبہا) کی اصل رقم سے کئی گنا زیادہ روپیہ پیش کر کے ہدبہ کے لئے التجائے رحم کرتے ہیں مگر عرب جیسی مفلس قوم کا وہ یتیم ان ترغیبوں اور درخواستوں کا کیا جواب دیتا ہے؟ وہی جو ایک عرب نژاد کو دینا چاہیئے کہ

"بقیا ای رنی جاھدٌ غیر موتل"

اب تو میرا رحم یہی ہے کہ قصاص لوں گا اور اس میں ذرا کوتاہی نہ کروں گا۔

اس عہد شجاعت و فتوت نے جتنے شاعر پیدا کئے وہ آجکل کے شعرا کی طرح سحر نگار نہیں ہوتے تھے آتش بیان ہوتے تھے ان کے منہ سے شعر گوئی کے وقت پھول نہیں جھڑتے تھے بلکہ شجاعت کی چنگاریاں اڑا کرتی تھیں یہ شعرا ہندوستانی شاعروں کی طرح دنیا کے بازار میں متاع کاسد نہ تھے بلکہ ان کی شاعری عرب کے جغرافیہ کو زیر و زبر کرنے میں تلواروں سے زیادہ حصہ دار ہوتی تھی۔ ان کی داستان شجاعت واقعیت کا آئینہ ہوا کرتی تھی۔ جانتے ہو ان شعلہ بیانیوں کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ یہی کہ عرب اور شجاعت و حریت عرب اور فصاحت و بلاغت عرب اور علم و عمل لازم و ملزوم تصور کئے جاتے تھے شجاعت کی صفات لازمہ خودداری خود اعتمادی سیر چشمی و ایثار سخاوت و صداقت عرب کی عورت سے لیکر مرد اور جوان سے لے کر بچے تک میں پائی جاتی تھیں۔ جذبۂ حریت عرب سے زیادہ کم کسی قوم میں ہوگا خوف عرب کی زبان کا گویا لفظ ہی نہیں تصور ہوتا تھا ادنے سے ادنےٰ عرب اپنے کوہ وقار شہنشاہ کو سر مجلس یہ کہہ سکتا تھا کہ "تم اگر صراط مستقیم پر نہ چلے تو تکلے کی طرح تمہارے بل نکال دیئے جائینگے" ان کی قوت عمل اتنی زبردست تھی کہ کسی معاملہ کے متعلق انہیں نظریہ قائم کرنیکی اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔ انکا سیدھا سادھا عقیدہ یہ تھا کہ خدا ایک ہے اور بس اطاعت صرف اسی کی کرنی چاہیئے اور کسی کی نہیں۔ رہے فلسفہ وجود کے

پیچیدہ راز ہمہ اوست و ہمہ از وست کے حیرت زا نظریئے یہ خدمت انہوں نے عجم کے سپرد کردی تھی فصاحت و بلاغت تو جب بھی عرب ہی کا حصہ تھی اور اب بھی۔ ان کی شاعری نہ صرف عربی ادب کے لئے مایۂ ناز تھی بلکہ ملک و قوم کے لئے اخلاق کے لئے اور انسانیت کے لئے بھی۔ عربی ادب کا غیر متناہی ذخیرہ اشعار عرب ہیں شعراء عرب نے عربی ادب میں جس قدر اضافہ کیا میں تو نہیں سمجھتا کہ کوئی دوسرا ملک بھی اس کی نظیر پیش کر سکیگا۔ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کا اشعار عرب کے متعلق یہ ارشاد زرّیں صداقت سے پرُ ہے

"اذا اعیاکم تفسیر آیۃ من کتاب اللہ فاطلبوہ فی الشعر فانہ دیوان العرب"

جب تمہیں قرآن مجید کی کسی آیت کی تفسیر سمجھ میں نہ آئے تو اسے اشعار عرب میں تلاش کرو کیونکہ شعر ہی دیوان عرب ہے۔ اس کے مقابلہ میں چشم بد دور ہماری اُردو شاعری اور اس کے علم برداروں پر بھی اک عبرت کی نظر ڈالئے۔ زلف و خال گیسو و موباف۔ کنگھی چوٹی۔ مسی اور آرسی۔ حسن و عشق بس

"یہی ان کی دُنیا یہی اِن کا عالم"

سکندر نے سدِّ سکندری سے یاجوج ماجوج کو بند کیا تھا یہ اردو کے یاجوج ماجوج عشق و حسن کے ناقابل تسخیر فولادی قلعہ میں محصور ہیں کسی زندہ قوم کا شاعر حباب کو دیکھ کر فلسفۂ حیات کا کوئی راز معلوم کریگا لیکن ہمارے فرقت زدہ شاعر کو کسی کے محرم "آب رواں کی یاد" آئیگی شیخ سعدی نے قحط دمشق کے مصائب کی تصویر کھینچتے ہوئے بیان کیا ہے۔

"چناں قحط سالے شد اندر دمشق   کہ یاراں فراموش کردند عشق"

وہ زندگی کے اس عام قانون کو پیش نظر رکھکر (کہ بھوک کی وجہ سے جب دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو جائے تو اہل عشق سے عشق بھی فراموش ہو جانا چاہیئے) اپنے خیال میں مبالغہ کی آخری حد پر پہنچ گئے لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ ہندوستان کے آتش دربغل شاعر کے لئے اگر آب و نان ناپید ہو جائے تو وہ دِل و جگر کا مہمان بن جاتا ہے۔

"خون دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو"

زندگی تو در کنار موت بھی اس کے طلسم عشق کو نہیں توڑ سکتی۔ تربت میں بھی اِس کی ہڈیوں کا ہار اک ہُو کا منتظر رہتا ہے۔

"توڑ کر تختۂ مرقد کو نکل آؤں گا　　　بیکسی نام نہ لینا سرِ مدفن اُن کا"

عرب کا شجاعت افروز شاعر اظہار جلادت کریگا تو اس زلزلہ انگیز شان سے

"نقاسمهم اسیافنا شر قسمة　　　ففینا غواشیها وفیهم صدورها"

ہم میدانِ کارزار میں اپنی تلواریں اپنے اور دشمنوں کے درمیان تقسیم کر لیتے ہیں اور یہ تقسیم بہت بُری تقسیم ہوتی ہے کیونکہ ہمارے ہاتھوں میں اپنی تلواروں کے صرف قبضے رہ جاتے ہیں۔ اور دشمنوں کے سینے میں ان کی دھاریں۔

اردو شاعر غریب کو ان وحشیانہ حرکتوں سے کیا کام وہ تو اپنے دشمن کو بھی مشق ستم کی دعوت دیتا ہے۔

"خاک اُڑا جائے آ کے دشمن بھی　　　پھر نشانِ لحد رہے نہ رہے"

اور اگر کبھی شجاعت کا جذبہ ناقابل ضبط ہی ہوگیا تو اس کے اظہار میں بھی وضعداری کو ہاتھ سے نہیں دینگے

"بزم کی بزم تڑپ جاتی ہے سُن کر فریاد　　　لب پہ آکر مرے بن جاتی ہے خنجر فریاد"

دردناک فریاد سے خنجر کا کام لینگے لیکن کہیں خنجر دیکھ پائینگے تو آنکھوں میں نیند حرام ہوجائیگی اردو شاعری کا اکثر حصہ حسن وعشق کی خرافات نگاریوں کا آئینہ ہے اردو شاعری اخلاق آموز ہونے کی بجائے اخلاق سوز ہے اردو ادب اس شاعری ہی کی وجہ سے علمی دولت سے محروم ہے۔ پیر صد سالہ ہو یا طفل دہ سالہ عشق وحسن کی اک رَو میں سب بہے چلے جاتے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اب تک ہندوستان میں بد مذاقی بدمستی اور تن آسانی کا دور رہا حالات کے اثر سے زمانے نے اسی قسم کے شاعر پیدا کئے

لیکن جب کسی قوم کی حالت اس عبرت انگیز انجام کو پہنچ جائے کہ اسے اپنی پستی کا بھی احساس نہ رہے تو نظام طبعی کے توازن کو قائم رکھنے کی غرض سے قدرت کروٹ بدلتی ہے اور اُس شورہ زار خاک سے ایسے ایسے پیغمبرانِ سخن اُٹھتے ہیں جو اپنی اعجاز بیانیوں سے اُس قوم فسردہ کے یخ بستہ جذبات کو گرما کر آئین ارتقاء کے بموجب اس میں احساس نفس پیدا کرتے ہیں اُسے اس کے اسلاف کے کارنامے بتا کر یقین دلاتے ہیں کہ تجھ میں بھی ترقی کے ملکات اسی قدر ہیں جتنے اسلاف میں تھے یہ شاعر زمانہ کی نادرہ کاریوں کے ممنون نہیں ہُوا کرتے بلکہ خود زمانہ آفرین ہوتے ہیں نہیں

زمانہ کی فرماں پذیری نہیں کرنی پڑتی بلکہ زمانے کو ان کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔ ہندوستان کی اسلامی دنیا میں حالی اِس سلسلہ کا پہلا پیغمبر ہے جس نے اپنے دلگداز نعروں سے خوابیدہ مسلمانوں کو چونکا دیا اکبر کے درد ریز نغموں نے حالی کی لگائی ہوئی آگ پر تیل چھڑکا اور اقبال کی شعلہ نوائیوں سے یہ آگ آسمان سے باتیں کرنے لگی۔

یادش بخیر حضرت ہمایوں انار اللہ تعالیٰ برہانہ بھی حضرات مذکورہ بالا کے بعد اُن چند تلامیذ الرحمٰن میں سے ہیں جن کی اعجاز کاریاں بھٹکی ہوئی قوم اور گم کردہ راہ کاروان کے لئے چراغ ہدایت و خضر راہ ہیں۔ وہ اک جادۂ عمل پیش کرتے ہیں جس پر چل کر کوئی قوم منزل مقصود پر پہنچ سکتی ہے۔ وہ اِک دِلسوز ناصح اک بیباک نکتہ چین اک اخلاق آموز ہادی کی حیثیت سے سرشار غفلت قوم کو اس کی بےحسی و تن آسانی کے ہولناک انجام پر متنبہ کرتے ہوئے اسے زندہ رہنے کے ایسے گرانقدر اصول بتاتے ہیں جن پر عملدرآمد کرکے وہ زندگی کی دوڑ میں زندہ اقوام کے دوش بدوش رہ سکتی ہے۔

ان کی قومی خدمات۔ تعلیمی مساعی، ان کا عجوبہ زا تدبر، ان کی حیرت کار قانونی قابلیت کا بیان تو آئندہ زمانہ کا مورخ سپرد قلم کریگا مجھے تو مختصر طور پر صرف اتنا عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ ہمایوں بحیثیت اک زمانہ آفرین شاعر کے بلحاظ اک اُردو ادیب کے باعتبار اک مصلح زبان کے ملک و قوم زبان اور شاعری کے لئے کیا کیا کارنمایاں انجام دے گئے۔ وقت کم ہے اور اُس سے زیادہ رسالہ میں گنجایش کم جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں لکھ نہیں سکتا جتنا لکھ سکتا ہوں اسے کافی نہیں سمجھتا لیکن کچھ نہ لکھنے سے کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے۔ قبل اس کے کہ کلام ہمایوں کو اک تنقیدی نظر سے دیکھا جائے چند امور واضح کر دینے چاہئیں۔

۱۔ ہمایوں نے کن حالات میں شاعری شروع کی؟ ان حالات سے وہ کس درجہ متاثر ہوئے اس تاثر کا ان کی شاعری پر کیا اثر پڑا؟۔

۲۔ اُس وقت اردو شاعری عام طور پر باعتبار خیالات و جذبات کے کس حالت میں تھی؟ ہمایوں نے اس کی اصلاح میں کیا حصہ لیا اس اصلاح میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئے؟

۳۔ اس وقت کی اردو شاعری باعتبار فن بلحاظ زبان آجکل کی شاعری سے کیا نسبت رکھتی ہے؟ اور ہمایوں نے زبان و فن کی کہاں تک پیروی کی؟

ان امور کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے اس سے پہلے یہ بتا دینا لابدی ہے کہ ہمایوں کی شاعری کو دو دور پر تقسیم کرنا پڑیگا۔ پہلا دور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب انکی عمر بارہ سال کی تھی یہ زمانہ ان کی شاعری کی ابتدا ہے جب ڈاکٹر لائٹنر رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کی زیر سرپرستی گورنمنٹ کالج میں وہ یادگار مشاعرہ ہُوا کرتا تھا جس میں شمس العلما، مولانا محمد حسین آزاد دہلوی مولانا فیض الحسن سہارنپوری مولٰنا حالی جیسے اکابر فن شرکت فرماتے تھے ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۲ء تک حضرت ہمایوں بھی اس میں شریک ہوتے تھے ۱۸۸۵ء تک یہ دور ختم ہوجاتا ہے پھر اسی سال وہ ولایت تشریف لے گئے وہاں سے تکمیل تعلیم کے بعد جب وطن میں مراجعت کی اُس وقت سے انکی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوکر مرض الموت تک ساتھ دیتا ہے۔

دورِ ثانی پر کہ انکی اصلی اور حقیقی شاعری کا یہی دور ہے تنقید کی جاتی ہے نقاد کا جہاں یہ فرض ہے کہ کسی شاعر کے محاسن کلام کی جی کھول کر داد دے وہاں بحیثیت ایک نقاد کے اسے تسامح شماری کے فرض کو بھی فراموش نہ کر دینا چاہیئے اس لئے میں پہلے اسی فرض کی سرانجام دہی سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں تاکہ ختم کلام حسن انجام کے ہمعنان رہے اِسی ذیل میں سوال نمبر ۳ کا بھی جواب آجائیگا۔

زوائد غیر ضروری۔ وزن کی ضرورت سے بعض جگہ حروف زوائد سے کام لیا گیا ہے۔
عدم التزامِ فن۔ کہیں کہیں اصول فن کی پابندی کا التزام ضروری نہیں سمجھا۔
تعقید لفظی۔ کلام میں جگہ جگہ تعقید لفظی موجود ہے۔
تعقید معنوی۔ زیادہ بلند پروازی اور دقیق تخیل کی وجہ سے بعض اشعار میں الفاظ نے مساعدت نہیں کی۔
شتر گربہ۔ کہیں کہیں شتر گربہ بھی موجود ہے مگر شاذونادر۔
ہمواری بعض اشعار میں ہمواری و یکسانیت کم ہے۔

جو کلام میرے پیش نظر ہے اس میں یہ تسامحات موجود ہیں اس لئے اک نقاد کی حیثیت سے مجھے انکا ظاہر کر دینا ضروری تھا لیکن مرحوم کے ساتھ بے انصافی ہوگی اگر دیانتدارانہ طور پر اک واقعی عذر انکی جانب سے بیان نہ کردوں۔ اس عذر کے کئی پہلو ہیں۔

۱۔ شاعری ہمایوں کے لئے اک تفریحی مشغلہ تھا ایک فن کی حیثیت سے حاصل کرنیکا انہیں موقعہ

نہیں ملا۔

۲۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے بخلاف پنجاب میں کسی واقف فن سے اصلاح لینے کا طریقہ رائج نہیں۔ جدید تعلیمیافتہ طبقہ شاعری میں طریقۂ اصلاح کو غیر ضروری سمجھتا ہے والشاذ کالمعدوم

۳۔ شعر و سخن کو بحیثیت فن حاصل کرنیوالوں میں ۹/۱۰ کی یہ حالت ہے کہ عمر گرانمایہ کا ایک گرانقدر حصہ اس جنون کی تکمیل میں صرف کرنے کے بعد وہ صرف ایک واقف فن شاعر ہوتے ہیں اور کچھ نہیں حضرت ہمایوں شاعر کہلانے سے پہلے اک بیدار دماغ سیاسی مدبر اک قومی ریفارمر تعلیمی رہنما اک فصیح و بلیغ لیکچرار، انگریزی زبان کے مسلم الثبوت انشا پرداز ملک کے اک مشہور قانون داں، صوبہ کی سب سے بڑی عدالت کے ۱۸ گھنٹے کام کرنے والے اک جج ہیں اور اسکے بعد شاعر۔ میں نے اکثر دیکھا ہے اور دیکھا کیا سُنا بھی ہے کہ ریاضی اور قانون سے شغف رکھنے والے لوگ اول تو شاعری سے قدرتاً بیزار ہوتے ہیں اس لئے کہ فطرۃً اس کے نااہل ہوتے ہیں اور اگر دیکھا دیکھی یا کسی ستم ظریف دوست کے اُکسانے سے یہ مصیبت خرید بھی بیٹھے تو پہلے ہی تصادم میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتے ہیں لیکن ہمایوں مرحوم میں حیرت انگیز طور پر یہ اجتماع ضدین موجود تھا وہ مسلم الثبوت قانون داں بھی تھے اور اک فطری شاعر بھی۔

۴۔ حضرت ہمایوں کی وفات تک اور وفات کیا اب تک بھی دو چار شخصیتوں سے قطع نظر کرنے کے بعد پنجاب کے بڑے بڑے جغادری شعرا بھی کسی واقف فن سے اصلاح نہ لینے کی وجہ سے زبان اور اصولِ فن کی حیرت انگیز غلطیاں کرتے ہیں ادبی رسالوں میں ان کا کلام انکی چھائی ہُوئی شہرت کی بنا پر احترام سے پڑھا جاتا ہے اور ہر کہ ومہ میں انکی غلطیاں غیر محسوس طور پر پھیل جاتی ہیں۔ کلام ہمایوں پر بھی اپنے نواحی حالات کا اثر پڑا۔

۵۔ مرحوم فن شاعری کی ان فروگذاشتوں کو محسوس کرتے تھے اپنے کلام میں خود بتاتے تھے جب کبھی کلام چھپوانے کے متعلق ان سے گفتگو ہُوئی انہوں نے یہی فرمایا کہ اس میں فن کی خامیاں موجود ہیں جب تک نظرثانی نہ کرلوں اسکی اشاعت مناسب نہیں۔ انکی آرزو تھی کہ اگر فرصت ملے تو فن کو بحیثیت فن حاصل کرکے اسے ترقی دوں دقت اور موت اگر مہلت دیتے تو اپنی خواہش کے مطابق وہ قطعاً ان تمام :: کورۃ الصدر تسامحات سے اپنے کلام کو پاک کر لیتے۔

"عرفت ربی بفسخ العزائم"

اب ہم انکی شاعری پر ایک منصفانہ تنقید کرکے اپنا خوشگوار فرض ادا کرتے ہیں اسی ذیل میں چند سوالات جو قائم کئے تھے ضمناً ان پر بھی روشنی پڑ جائیگی۔ حضرت ہمایوں نے جب شاعری شروع کی اس وقت قومی حالات اک دلشکن منظر پیش کر رہے تھے۔ مسلمان حضیض نکبت میں پڑے ہوئے خواب خرگوش میں بدمست تھے قوم اخلاقی، تعلیمی، صنعتی حیثیت سے دیوالیہ ہو چکی تھی علماء رشد و ہدایت کی بجائے شیعہ سنی مقلد غیر مقلد کے مناظروں اور مکافروں میں منہمک تھے۔ شعراء اک ایسے جامع الاضداد مجسمے کی پرستش کر رہے تھے جس کی آنکھیں ترکش، ابرو خنجر، چہرہ آفتاب، زلف و گیسو دامن قیامت سے دامن باندھے ہوئے جس کے رخسار پر خال کی بجائے اک حبشی غلام بیٹھا ہے۔ بایں ہمہ گاؤ پیکری اسکی نزاکت اس درجہ ترقی پذیر ہے کہ

"غنچہ چٹکا تو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے"

وہ رخسار اک حبشی غلام کے لئے نشستگاہ بن سکتے ہیں۔ پھر بھی نزاکت کی چھوئی موئی ہیں کہ نہ صرف چھونے ہی سے بلکہ اگر کوئی بیباک اپنے تصور میں انکی تصویر کے ساتھ بھی کوئی خلاف تہذیب حرکت کر بیٹھے تو وہ نیلے پڑ جاتے ہیں۔

"نیلے عارض ہیں نزاکت سے یہ کس بیدرد نے
لے لیا ... تصور میں تیری تصویر کا"

ان کے اس عجوبہ زا معبود کا دھڑ ٹانگوں سے علیحدہ ہے کیونکہ کمر درمیان میں سے گم ہو گئی ہے دہن ندارد ہے مگر دانت نظر آتے ہیں۔ چاہ ذقن اتنا گہرا ہے کہ دوسروں کے لئے اسے بنا کر خدا بھی اس میں غرق ہو گیا ہے۔

"خدا بھی خود غرق ہو گیا ہے بنا کے تیرے چہ ذقن کو
کسی نے یہ سچ کہا ہے اے بت! ہے چاہ در پیش چاہ کن کو"

اٹھتا ہے تو قبروں سے مردے اور زمین سے فتنے استقبال کو اٹھتے ہیں چلتا ہے تو قیامت ساتھ چلتی ہے۔ بایں ہمہ عجوبہ زائی اس قدر خوبصورت ہے کہ اسے گھر سے رخصت کرتے ہوئے خدا حافظ کہتے جھجکتے ہیں مبادا چاہ ذقن میں ڈوبنے والا تنہا پا کر راہ میں سے اچک لے

"اللہ رے بدگمانئ شوقِ شب وصال   کیونکر کہوں خدا ہے نگہبان جائیے"

اور خود ان کی حالت تو نہ پوچھئے زندگی کا گورکھ دھندہ بنے ہوئے ہیں مصائب ہجر نے اس قدر نحیف و لاغر کردیا ہے کہ موت جیسی باریک بین کے ہاتھ بھی نہیں لگتے۔

"پایا نہ جب نشاں مرے جسم نحیف کا   لیکر چراغ ڈھونڈھنے نکلی قضا مجھے"

یونانی فلسفہ کے اصطلاحی ہیولے ہیں کہ موجود ہیں مگر نظر نہیں آتے انکے نالہ و فریاد سے آسمان کے دھوئیں اُڑ گئے آہوں سے آٹھ پہر قیامت برپا رہتی ہے مگر خود ان کھوئے ہوئے بزرگوں کا سراغ نہیں ملتا خدا کی طرح لامکانی بنے ہوئے ہیں۔ قوم کی یہ عبرت انگیز تباہی دیکھکر مرحوم کے دردمند دِل پر چوٹ لگی انھوں نے نوجوانانِ پنجاب کی ایک انجمن قائم کر کے اسکے جلسوں میں معرکۃ الارا اصلاحی تقریریں کیں، اخبارات میں قومی جذبات کو اُبھارنے والے ہنگامہ خیز مضامین لکھے ان مضامین کی مُلک میں دُھوم مچ گئی۔ اپنے عشقیہ کلام کو یہ کہتے ہوئے کہ

"یہ خیالات تضیع اوقات کا موجب ہیں مجھے ان کا زندہ رکھنا گوارا نہیں"

آگ کی سپرد کر کے حالی و اقبال کی مجلس میں خود بھی شریک ہوگئے وہ سمجھتے تھے کہ ہر قوم کے شعرا اس کے گنج گرانمایہ ہوتے ہیں، جسم قومی میں شاعر دل کا رتبہ رکھتا ہے دل ہی کی حیات و ممات پر جسم کی موت و زندگی کا دارومدار ہے کسی قوم کے شاعروں کی بےحسی و بدمستی اس قوم کو اِس قابل نہیں چھوڑتی کہ وہ زندوں کی دنیا میں رہ سکے۔ اس اصول کو سمجھ کر دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اس پر خود عملدرآمد شروع کیا کہ بقولِ خود۔ "ناصح جو بے عمل ہے کسی کام کا نہیں"

اس وقت کلام ہمایوں پر باعتبار رفعت تخیل و پاکیزگی مضامین تنقید کی جارہی ہے۔ کہیں کہیں لطف زبان و نکات فن پر بھی توجہ دلائی جائیگی

شعرا سے ناصحانہ خطاب۔ پنجاب میں کبھی کبھی اور اردو کے مرکز صوبجات متحدہ کے مشاعروں میں عموماً یہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ جوان، بوڑھے۔ اور نوعمر شاعروں کے کلام میں باعتبار خیالات کوئی امتیاز نہیں ہوتا وہ پیران فرتوت بھی جو سنِ ایاس کو پہنچنے کی وجہ سے عشق کے نااہل اور بچوں کی طرح سے معصوم ہو چکے ہیں اسی طمطراق سے عشق و حسن کی داستان نظم کرتے ہیں جیساکہ وہ شعرا جن پر جنونِ شباب مسلط ہو یہ لوگ معانی مخصوصہ کو الفاظ مقررہ میں موزوں کر دینے کا نام شاعری سمجھتے

ہیں اور بس۔ ان کو نہ یہ احساس ہوتا ہے نہ اس سے غرض کہ ملک و قوم زبان اور اپنی اصلاح کی بھی ہم پر کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ان میں اس لفظی بحث پر تو زبانوں کے ساتھ ہاتھ بھی اُٹھ جاتے ہیں کہ اساتذہ نے محبوب کے سر کی مانگ کو ملک عدم کی سڑک سے تشبیہ دی ہے اور آزر رامپوری نے عدم کی قید نہیں لگائی صرف راستے سے تشبیہ دیدی ہے۔

"تمہاری مانگ کے عاشق ہیں شیخ و برہمن دونوں
یہ وہ رستہ ہے جس پر دوست دشمن مل کے چلتے ہیں"

یہ تشبیہ شعرائے سلف کے خلاف ہے اور اس لئے راز رامپوری گردن زدنی۔ لیکن انہیں یہ غور کرنیکا موقعہ کبھی نصیب نہیں ہُوا کہ زلف اور مانگ کے فرسودہ مضامین فراموشی کی قبر میں دفن کر دینے کے قابل ہو گئے ہیں ان سے اخلاق کی تباہی کے علاوہ ملکی شاعری بدنام ہو رہی ہے وہ یہ نہیں سمجھتے اور نہ سمجھنا گوارا کرتے ہیں کہ

"تمہاری زلف ہی دل مانگ لے گی یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے"

یہ اخلاق سوز نغمے اب بے ہنگام ہو چکے ہیں ان کی احول نظری۔ "صبح نکلی" اور "چشم گرداب سو گئی ہے" پر محاورہ کی غلطی کی وجہ سے ڈاکٹر اقبال کو اردو کے زمین و آسمان میں رہنے کا مستحق نہیں سمجھتی مگر اپنے ہشتاد سالہ شاعر کو ان تقدس آلود خیالات پر

"صاف تھا جب تک کہ مطلع تو جواب صاف تھا
اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا"

خدائے سخن کہتی ہے۔ قوم مٹی جا رہی ہے لیل و نہار کی گردش ملک کو پیسے ڈالتی ہے آسمان سے ہر بلا مصیبت اسلام نام پا کر نازل ہو رہی ہے مگر جز و پیغمبری کے مالک، خدا کے براہ راست شاگرد

"مسی آلودہ لب پر رنگ پان ہے تماشہ ہے تہ آتش دھواں ہے"

کے بے موسمی راگ الاپ رہے ہیں۔

ان دردناک حالات کی موجودگی میں شاعروں کی مجرمانہ بے خبری پر حضرت ہمایوں نہایت مؤثر پیرایہ میں ان کو نصیحت فرماتے ہیں کہ

"اے شاعران قوم زمانہ بدل گیا پر مشل زلف یار تمہارا نہ بل گیا"

---

۵ ایک چشم دید جنگی نظارہ

پیٹو گے کب تلک سر رہ تم لکیر کو　　　بجلی کی طرح سانپ تڑپ کر نکل گیا
آخر ہر ایک دل کو ہے الفت سے کچھ تو لاگ　　　کیا اک تمہیں پہ عشق کا جادو ہے چل گیا
اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی　　　دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

تیسرے شعر میں اک امر واقعی کا اظہار ہے کہ ہر دل میں محبت کی کچھ نہ کچھ خلش موجود ہے۔ لیکن اس پاکیزہ جذبہ کو دل میں رکھنے کی بجائے سر پر چڑھ کر بولنے والا جادو بنا لینا کوئی دانائی نہیں ہے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک محبت کی قصیدہ خوانی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعر کو محبت نہیں بلکہ محبت کا ہیضہ ہو گیا ہے ذیل کے اشعار میں موجودہ شاعرانہ خیال آفرینیوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے دلسوز انداز میں ناصحانہ چٹکیاں بھی لیتے جاتے ہیں۔

نالوں سے کوئی چرخ کو چکر میں لائے کیوں　　　پہلو میں رکھ کے دل کو کرے ہائے ہائے کیوں
مرکر بنا کرے کوئی کب تک غبار راہ　　　اس اپنی مشتِ خاک کا خاک اڑائے کیوں
قمری کی طرح کیوں کوئی کو کو کیا کرے　　　آزاد دل کو سرو کا بندہ بنائے کیوں

آگے چل کر کن درد انگیز الفاظ میں شاعر کو مخاطب کرتے ہیں۔

اے بوالہوس فسانۂ عشق اب تو کر تمام　　　الفاظ خشک پر کوئی آنسو بہائے کیوں
ہر سمت جبکہ آگ لگی ہو تو میر بزم　　　پروانے اور شمع کا قصہ سنائے کیوں

اے ہمنوا چمن کی ہوا ہی بدل گئی
مدت سے طرز نغمہ سرائی بدل گئی

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض خشک طبع شاعر جنہیں جوانی کی بدمستیوں میں بھی کبھی عشق کی ہوا نہ لگی ہوگی بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر رسم شاعری کی مجبوری سے ان کے خیالات کا تختۂ مشق کوئی فرضی محبوب ضرور ہوتا ہے۔ جی چاہے یا نہ چاہے اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں ایک موہومی پتلا بنا کر ہنگامہائے عشق ضرور برپا کرینگے اسی کے متعلق حضرت ہمایوں ایک شعر میں اظہارِ خیال فرماتے ہیں۔

پروانہ وار کیوں ہو نثار چراغ حسن　　　موہوم غم کی آگ سے دل کیوں جلا کرے

اسی نظم میں شاعروں کو صلائے عمل دیتے ہوئے مفید سخن سرائی کے طریقے بیان کرتے ہیں انہیں بتاتے ہیں کہ الفاظ پرستی چھوڑ دو عشق آرائیوں کا وقت نہیں ہے تو میں ترقی کے میدان میں بہت

آگے نکل چکی ہیں زمانہ بدل رہا ہے شاعری کے پُرانے ڈھچر کو جلا کر اس کی راکھ پر مفید شاعری کی بنیاد قائم کرو۔ انداز بیان کس قدر پُرزور پُراثر اور تہور آموز ہے کہ بے اختیار دل سے داد نکلتی ہے۔

اے نوجوانو! آؤ کہ کچھ کر دکھائیں ہم — طرزِ قدیم شعر و سخن کو مٹائیں ہم
دل کے بُتوں کو توڑ کے فطرۃ پرست ہوں — نامِ خدا پہ کعبہ میں ایمان لائیں ہم
لفظوں کا سحر چھوڑ کے ہوں معنی آفریں — فکر رسا کے خوب کرشمے دکھائیں ہم
اک طرز دلفریب کی بنیاد ڈال دیں — اور دل سے محو کردیں وہ اگلی ادائیں ہم
آئین نو کو سیکھیں اس عہدِ جدید میں — بوسیدہ ہو گیا ہے جو دفتر جلائیں ہم
رنگِ چمن کچھ اور ہے غنچہ کی بو کچھ اور — گُل کو نئی بہار کے نغمے سُنائیں ہم

حب الوطنی و حب قومی ہمایوں کے کلام میں جگہ جگہ ملک و قوم کی حالت زار کا مرثیہ موجود ہے وہ وطن سے محبت نہیں بلکہ عشق رکھتے تھے۔ منشی درگا سہائے سرور کے کلام کو دل سے پسند کرتے تھے چونکہ وہ حب الوطنی کے جذبات سے پُر ہے۔ ملاحظہ ہو اپنے حریفانِ فن کو کیا نصیحت فرماتے ہیں۔

ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونکدیں — جو قوم مر چکی ہے اسے پھر جلائیں ہم
ایسے برس پڑیں کہ ہو شاداب ملک ہند — حب وطن کی کالی گھٹائیں اُٹھائیں ہم

قوم کی محبت ہی ان کا جزو ایمان ہے وہ اپنے بیٹے کو یہ دعا نہیں دیتے کہ تو کہیں کا نواب بن جائے لکھ پتی ہو جائے لاکھوں برس کی تیری عمر ہو بلکہ اس دعا میں انہیں قوم یاد آتی ہے کہ

اللہ وہ تمکو علم کا جوہر عطا کرے — درماندہ قوم کا جو تمہیں رہنما کرے

وہ قومی تفرق و تشتت کو قوم کی موت سمجھتے ہیں قومی اتحاد ان کی نظر میں قہار سند کی طرح غیر مفتوح ہے۔

اتحاد قوم سے ہر فرد یکتا ہو گیا — قطرہ دریا میں ملا تو خود بھی دریا ہو گیا

ضرورتِ عمل۔ قول و عمل کا تطابق عموماً مفقود ہے اور شاعروں کا طبقہ تو اس امتیاز میں اس قدر بدنام ہے کہ ملاء اعلیٰ سے بھی اس کی تصدیق ہو چکی ہے۔ یقولون ما لا یفعلون الآیہ لیکن ہمایوں کسی بے عمل کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ یہ ان کا اصول زندگی تھا کہ جو کچھ کہتے تھے اس پر پہلے خود کاربند ہوتے تھے اور ایسی بات جس پر وہ خود عامل نہ ہو سکتے ہوں دوسروں کو اس پر عمل کی نصیحت ہی نہیں کرتے تھے وہ قول بے عمل کو بیہودہ اور علم بے عمل کو گناہ سمجھتے تھے ان کے کلام میں

جگہ جگہ اس کا ثبوت ملیگا۔

خیالِ فاسد جو دل میں ہو تو زباں پہ ذکرِ خدا سے حاصل — عمل میں فرمانِ حق کو جھٹلا کے حق کو باطل بنا دیا ہے
جو کچھ لکھا ہے اس میں اثر کا مزا نہیں — ناصح جو بے عمل ہو کسی کام کا نہیں
اللہ وہ تمکو علم کا جوہر عطا کرے — درماندہ قوم کا جو تمہیں رہنما کرے
لیکن ہو ساتھ علم کے تمکو عمل نصیب — ہو میرے لونہال کو یارب یہ پھل نصیب

شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز دہلوی کا قول ہے کہ انسان کو عقیدہ صحیح رکھنا چاہیئے۔ عمل سے عقیدہ کی صحت زیادہ ضروری ہے کیونکہ عقیدۂ صحیح بھی قیامت میں انسان کی شفاعت کریگا۔ لیکن پیکرِ عمل ہمایوں پر یہ جادو نہیں چل سکتا وہ اس پر تو راضی ہو سکتے ہیں کہ کوئی مومن نہ ہو مگر یہ نہیں سُن سکتے کہ باعمل نہ ہو، ان کے مشرب میں وہ کافر اچھا ہے جو نیک عمل ہو اس مومن سے جو زبان سے تو اسلام اسلام پُکارتا ہو اور اصول اسلام پر عمل کے درجہ میں صفر محض ہو۔ وہ نئی تہذیب کی بہت سی اداؤں کو پسند کرتے تھے مگر اس کی ابدی تقلید کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک پبلک لائف اور پرائیویٹ زندگی میں کوئی فرق نہیں تھا وہ کسی کی پبلک زندگی کی روشنی کے سامنے پرائیویٹ زندگی کی تاریکیوں کو نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ جس کی پرائیویٹ زندگی تاریک ہو وہ اسے پبلک لائف میں لیڈر بننے کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔

ہے رہنمائے خلق عمل جسکے نیک ہوں — کافر ہو یا عقیدہ میں وہ دیندار ہو
بہتر ہے گر عمل سے عقیدہ ہُوا کرے — ایسے سبق ہمیں نہ پڑھایا کرے کوئی
ہمایوں تیرے مرقد پر بنائیں مقبرہ کیوں ہم — یہاں حسنِ عمل ہے سب سے بہتر یادگاروں میں

فلسفہ آفرینی۔ ہمایوں فطرۃً فلسفیانہ دماغ لیکر پیدا ہُوئے تھے ان کی دائمی خاموشی وغور آمیز فکر سے ہر شخص یہ سمجھ لیتا تھا کہ وہ کسی ادھیڑ بن میں لگے ہُوئے ہیں۔ جن لوگوں کو ان سے شرف تکلم حاصل ہُوا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی گفتگو فلسفیانہ مسائل سے کس قدر لبریز ہوتی تھی وہ دنیا کے ہر واقعہ کو کائنات کی ہر چیز کو اک فلسفی کی نظر سے دیکھتے تھے ان کی شاعرانہ فلسفہ آفرینیاں شاہد ہیں کہ انکا غواص طبع بحرِ فکر کی تہ سے موتی نکالتا ہے۔ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ ہر شئے کا وجود کسی علت کے وجود پر منحصر ہے یہ علت معلول کا سلسلہ اک قانون کے ماتحت جاری ہے۔ نظامِ عالم کا دارومدار اسی قانون

پر ہے۔ غروب آفتاب کے وقت دھوپ کی جستجو، بغیر تخم پاشی و قلبہ رانی کے خرمن کی آرزو قانون قدرت کی توہین ہے اس فلسفیانہ نظریہ کو اپنی مشہور نظم "زمانہ سے خطاب" میں بیان فرماتے ہیں۔

خدا نے ہر ایک شے پہ قانون کا تسلط بٹھا دیا ہے
زمیں کے ذرے، فلک کے تارے، بندھے ہیں اک سلسلے میں سارے
سنو کہ ہوگا وہی جو قدرت نے قاعدہ اک بنا دیا ہے
نتیجہ ہر ایک کا مقرر ہے۔ عالم اسباب کا ہے دنیا

جو لوگ تن آسانی کے سبب ہاتھ پاؤں توڑ کر تقدیر کے رحم پر زندگی بسر کرتے رہتے ہیں ان کے لئے ان اشعار مذکورہ میں درس عبرت موجود ہے۔

یہ تارے ہیں سب ترے اشارے کہ جن میں جادو ملا دیا ہے
ترے یہ دن اور تری یہ راتیں زبان تغیر کی ہیں باتیں
خدا نے پردے میں چھپ کے تیرے حجاب اپنا اٹھا دیا ہے
عقیدہ اپنا تو بس یہی ہے کوئی اسے مانے یا نہ مانے

دوسرے شعر کے مضمون کی ایک حدیث قدسی بھی تائید کرتی ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضؓ قال قال رسول اللہ صلعم قال اللہ تعالیٰ یوذینی ابن اٰدم یسب الدھر و انا الدھر" الحدیث رواہ ابوداؤد

بقول نبی کریم علیہ التسلیم خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انسان زمانہ کو گالی دیکر مجھے ایذا پہنچاتا ہے کیونکہ زمانہ تو خود میں ہی ہوں۔ اسی قسم کی الہام بیانیوں سے شاعر تلامیذ الرحمٰن میں شمار ہونے لگتا ہے۔

کہ نوع انسان کو دے کے تادیب تو نے انسان بنا دیا ہے
وہ کیسے نادان ہیں اے زمانے جو کرتے رہتے ہیں تیرا شکوہ
سبق نہ بھولینگے جو تری گوشمالیوں نے پڑھا دیا ہے
یہ سچ کہا ہے کہ "جور استاد بہ زمہر پدر" کبھی ہم

اہل عرب کا قول ہے کہ "الدہر افصح المؤدبین" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ زمانہ کی تادیب اک جابر استاد کی گوشمالیوں سے کم نہیں ہے۔ سنگدل استاد کی گوشمالیاں فراموش ہوجاتی ہیں مگر افصح المؤدبین کی ٹھوکریں انسان بھولنا چاہے بھی تو نہیں بھول سکتا۔ ذیل کے شعر میں مسئلہ ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔

نجار سے تو نے پہلے حیوان پھر اس سے انسان بنا دیا ہے
ترے جو ہیں یہ تغیرات ان سے عیاں ہے اعجاز دست قدرت

ہر انسان کی یہ آرزو ہوا کرتی ہے کہ مجھے عمر نوح نصیب ہو وہ پیر صد سالہ بھی جس کی فقط آنکھوں ہی میں دم رہ گیا ہے، جسے ہجوم مصائب نے پیس ڈالا ہے، جس کے لئے موت سے بہتر اور کوئی ہمدرد نہیں ہو سکتا یہ نہیں چاہے گا کہ میرا رشتۂ حیات منقطع ہوجائے لیکن فلسفۂ حیات سے آگاہ انسان دنیوی زندگی کو روح کی پامالی تصور کرتا ہے۔

طولانی گر یہ زندگی مستعار ہو
بڑھ جائے غم کا سلسلہ کہسار کی طرح

اس صید گاہ میں وہی نکلیگا بچ کے صاف　　جو صید سب سے پہلے اجل کا شکار ہو"

چونکہ بادل ناخواستہ ہر شخص نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ایک نہ ایک دن پیکر خاکی کو مرکز (خاک) کی کشش تودۂ خاک بنادیگی مگر زندگی سے ہر کوئی اس قدر والہانہ انس رکھتا ہے کہ پیکری زندگی کو چند روزہ سمجھ کر اور کچھ نہیں تو نام کی زندگی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی لئے ہر ایک کو اولاد کی خواہش ہوتی ہے کوئی اس سے محروم ہو کر اپنی یادگار قایم کرنیکی فکر میں رہتا ہے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ میرا مزار پُرشان و شوکت ہو تاکہ چشم نظارگیان کے لئے جاذب توجہ بنا رہے لیکن ہمایون اس آرزو کو ہوس کا خطاب دیتے ہیں انکی بلند نظری اس خواہش کو چشم حقارت سے دیکھتی ہے۔

"کیوں مشت خاک پر کوئی دل داغدار ہو　　مرکر بھی یہ ہوس کہ ہمارا مزار ہو"

ہمایوں کے کسی ہمخیال رفیع النظر نے کیا خوب کہا ہے۔

"در کیشِ ما تجرّد عنقا تمام نیست　　در فکرِ نام ماند اگر از نشاں گذشت"

بہت سے زندگی کے نام پر مٹنے والے جب دنیوی زندگی کو فنا پذیر یقین کر لیتے ہیں تو حیات بعد الموت کے سہارے پر جیتے ہیں لیکن ہمایوں کی غیور طبیعت اس موعودہ حیات سے بھی بے نیاز ہے بے نیاز ہی نہیں بیزار بھی ہے۔

اُس بوالہوس کی موت کے قربان جایئے　　جو پھر دوبارہ جینے کا اُمیدوار ہو
ہستی کا طوق تو ہے قیامت پسِ وفات　　یارب کہیں یہ میرے گلے کا نہ ہار ہو

آجکل عبادت عموماً یا تو جہنم کے خوف یا جنت کی طمع سے کیجاتی ہے غرضیکہ معاوضہ کی اُمید عبادت کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ ہمایوں اس عبادت کو عبادت نہیں سمجھتے بلکہ "یہ تجارت ہے بندگی ہی نہیں" عبادت اسی وقت کیف حقیقت حاصل کر سکتی ہے جب وہ صرف عبادت سمجھ کر کیجائے۔ طمع کا اس میں شائبہ بھی نہ ہو۔ اسی خیال کو شاعرانہ شوخی سے ادا کرتے ہیں۔

"ہم بھی نماز روزے کے پابند ہوں مگر　　حوروں کو کس طرح سے گوارا کرے کوئی"

"متقی واعظ نے پھر چھیڑا ہے ذکر خلد و حور　　بے غرض طاعت کا لو اب راز کھلجانے کو ہے"

سحابی نجفی بھی تائیدی طور پر ہمایوں کی بلند نظری کا اعتراف کرتا ہے

"ایں خلق کہ عقل را بخود ناخلف است — بیخوف ورجائے نار وجنت تلف است
چوں خر کہ براہ راست آرد اورا — خوف چوب است یا امید علف"

ذیل میں حضرت ہمایوں کی فلسفہ آرائیوں کے چند نمونے درج کرنے پر اختصار کرتا ہوں

"میری آنے کی غرض خود مجھ سے پنہاں ہوگئی — بزم عالم میں جو میں محوِ تماشا ہوگیا"

تنہا اُٹھالوں میں بھی ذرا لطف گمرہی — اے رہنما مجھے مری قسمت پہ چھوڑ دے

اے ہمایوں چشم ظاہر بیں سے تو اس کو نہ دیکھ — جنگِ عالمگیر میں کوئی بہا نہ اور ہے
یکساں ہے اہلِ دل کے لئے انبساط وغم — باغ جہاں میں آئے خزاں یا بہار ہو"

مناظر آرائی۔ سرزمینِ پنجاب کے فطرۃ نگار قدرتی مناظر کی تصویر ایسی خوبی سے کھینچتے ہیں کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ یہ تصویر دور از کار تخئیل کی بجائے محاکات سے رنگین ہوتی ہے خصوصاً ہمایوں توجہاں قدرتی مناظر کو بیان کرتے ہیں سماں باندھ دیتے ہیں۔ ولایت سے مراجعت کے وقت بحیرۂ روم کی اک صبح کے دلنواز منظر سے متاثر ہوتے ہیں، ستاروں کا ڈوبنا، صبح کے ستارے کی سفید روح فروز روشنی آسمان پر شفق گوں بادلوں کا دوش صبا پر ادھر اُدھر پھرنا، لہروں کا افتاں خیزاں ساحل کی جستجو میں اُٹھنا اس ہوش ربا نظارہ کو کس دلکش پیرایہ میں بیان کرتے ہیں!!

رات کا انجام ہے تارے ہیں مرجھائے ہوئے — آسماں کے پھول شبنم میں ہیں کمھلائے ہوئے
صبح نکلی نور کی چادر کئے زیبِ بدن — اک ستارے کی کلی پہلو میں لٹکائے ہوئے
ہے گلابی بادلوں سے چرخ گلزار۔ اور زمیں — گل کی صورت دامن نزہت ہے پھیلائے ہوئے
ابر کے ٹکڑے نہیں شاید فرشتوں کے ہیں پر — وہ اُڑے جاتے ہیں عطر نور چھڑکائے ہوئے
آستاں بوسی کریں گی کس کے ساحل کی یہ آج — لہریں ہر سو جارہی ہیں ٹھوکریں کھائے ہوئے
یاد آئے تم تو ہنس کر صبح نے جھڑکا مجھے — پھر گئے آنسو مری پلکوں تلک آئے ہوئے

باڑہ گلی کی بہاریں فضا کا نقشہ ملاحظہ ہو۔

پھر آکر دیکھ لی اس کی جھلک ان سبزہ زاروں میں — جو شان اے وادیٔ کشمیر ہے تیرے چناروں میں

فلک پر مہر تاباں سے رواں ہے نور کا دریا　　یہ وادی میں موسیقی کی لے ہے آبشاروں میں
ہوائیں تازگی سے بھینی بھینی ہے مہک پھیلی　　رگِ گُل کی نزاکت ہے عیاں گلشن کے خاروں میں

جذبات نگاری۔ دل۔ دیکھنے میں اک مضغۂ گوشت ہے لیکن سلطان الجسد کہلاتا ہے اس کوزے میں جذبات گوناں گوں کا اک قہار سمندر متلاطم ہے۔ یہ راز دار فطرۃ شیکسپیئر کے پہلو میں ہو یا افریقہ کے کسی انسان نما وحشی کے سینے میں طوفاں دربغل ہی نظر آئیگا اس بحر بیکراں کے لطیف تموج کو دلگداز الفاظ میں موزوں کر دینے کا نام شعر ہے شعر میں اگر کوئی جذبہ نہیں ہے تو وہ اک پیکرِ بے روح ہے اگر جذبہ موجود ہے لیکن پیرایۂ بیان بھدّا ہے تو وہ اس لعل درخشاں کے مشابہ ہے جس کی تابانی پر پتھر کی سنگینی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ شاعر کی رفعت و سطحیت، قبولیت و کس مپرسی کا دار و مدار اسی اور صرف اسی ہنر پر ہے کہ وہ جذبات عالیہ کو کس درجہ تک دلفروز پیرایہ میں بیان کر سکتا ہے۔ اس کسوٹی پر کلام ہمایوں کو پرکھیئے آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ طلائے خالص اپنی چمک دمک سے آنکھوں میں خیرگی پیدا کرتا ہے۔

اپنے اک بھائی میاں عبدالمجید مرحوم بی اے کا (جسے وہ دل سے عزیز رکھتے تھے) مرثیہ لکھتے ہیں۔ اس مرثیہ کا ہر شعر نشتر بر جگر ہے۔

شب تاریک ہے اور ہر طرف خاموشی غم ہے　　کسی کے آس پاس آج ایک سنّاٹے کا عالم ہے
عزیز و اقربا سب بن گئے ہیں غم کی تصویریں　　ہر اک چشم محبت ریز اشک خوں سے پُرنم ہے
چھپا کر آستیں میں منہ جو چُپکے چُپکے روتے ہیں　　یہ کس کی خامشی سے ایسا رنج و غم کا عالم ہے

عورت مرد سے زیادہ غم آشنا ہے اس کا آبگینۂ دل غم کے ذرا سے تصادم سے چکنا چور ہو جاتا ہے۔ گھر میں کوئی عزیز فوت ہو جائے تو شور ماتم اسی غم دوست طبقہ سے اُٹھیگا۔ میت کے جنازے پر آخری نگاہ ڈالنے کے لئے گھر کے دروازہ ہی تک بس نہ کرینگی بلکہ کوٹھوں پر چڑھ کر حدِ نظر تک اسے الوداع کہینگی۔ اسی درد انگیز واقعہ کو ہمایوں نے فطری پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ مرحوم کو خطاب کرتے ہیں۔

سر بالیں بپا ہے دیکھ تو یہ شور و شر کیسا　　اُبلتا ہے جگر کا خوں لبوئے چشم تر کیسا
ہوئے ویراں ہزاروں خانۂ دل تیرے مرتے ہی　　کیا تھا دیکھ تو نے جانِ من ہر دل میں گھر کیسا
یہ دوڑے ہیں کہ تجھکو جاتے جاتے اک نظر دیکھیں　　ہجوم بیخودیٔ رنج ہے ہر بام پر کیسا

اپنے صاحبزادہ میاں بشیر احمد کو ولایت رخصت کرتے وقت انکی والدہ کی جانب سے پراز جذبات نظم کہی ہے۔ اک فہیم اور دور اندیش ماں اپنے اکلوتے فرزند کو ایسے سفر کے لئے رخصت کر رہی ہے جس سفر کی کامیابی بیٹے کے مستقبل کو زرّین بنا سکتی ہے سفر کالے کوسوں کا ہے ہزاروں میل کا نیلا سمندر طے کرنا ہے۔ عقلِ دور اندیش کا اصرار ہے کہ یہ سفر ناگزیر ہے۔ لیکن محبت مادری دامن نہیں چھوڑتی۔ سینہ پھٹا جاتا ہے۔ دل مچل رہا ہے دور بینی بیٹے کے درخشاں مستقبل کو لئے سامنے کھڑی ہے محبت اس طرف سے آنکھیں بند کئے لیتی ہے سفر کی صعوبتیں اور خطرات کا بھیانک منظر پیش نظر ہے۔ آخر کار باپ کا اصرار بیٹے کا عزم راسخ وقت کی مصلحتیں محبت کے جذبات کو دبا لیتی ہیں۔ ماں جان پر کھیل پر بیٹے کو یہ پُر خطر مہم سر کرنیکو بادلِ ناخواستہ رخصت کرتی ہے ان متضاد جذبات کی کشمکش کو ذیل کے اشعار میں کس دل آویزی سے بیان کیا ہے دیکھنا محبت کے جذبات مصلحتوں کے سنگین پتھروں کے نیچے سے چشمے کی طرح پھوٹ رہے ہیں۔

خود اپنے آپ پر ہے کیا جو رہم نے آج — سینے سے دل نکالا ہے کس طور ہم نے آج
دنیا کی مصلحت پہ کیا غور ہم نے آج — اللہ پر بھروسہ کیا اور ہم نے آج

حسرت بھری ہوئی تھی جو دل میں نکال دی
ننھی سی ناؤ اپنی سمندر میں ڈال دی

اور دیکھتے ہیں اسکو کنارے کھڑے ہوئے — دل میں امید و یاس کے طوفاں بھرے ہوئے
آتے نظر افق پہ ہیں بادل چڑھے ہوئے — پر ان میں ہیں کہیں کہیں تارے جڑے ہوئے

یہ درد دل ہمارا وہی جانتے ہیں کچھ
جو مامتا کے سوز کو پہچانتے ہیں کچھ

عاشق شوق لقا میں دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھا کرتا ہے کہ وہ ملینگے تو انہیں اپنا درد دل سناؤں گا۔ ہجر کی مصیبتیں بیان کروں گا

"ولو کان الوصالُ یعودُ یوماً — سَاُخبِرُکم بما فعل الفراق"

ان کے ستمہائے بے پایاں و تغافل بیحد کی شکایتوں کا اک طومار باندھ دونگا اُن سے یہ کہونگا اُن سے وہ کہوں گا۔ لیکن جب وہ ملتے ہیں تو جذبات کا ہجوم اپنی محبت کا ادب، انکے حسن کا

رعب زبان بند کر دیتا ہے اک بیخودی سی طاری ہو جاتی ہے۔

اس حالت کو کس قدر جاں نواز پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ بے اختیار دل سے داد نکلتی ہے۔ دل سے شکوہ آمیز خطاب کرتے ہیں کہ

"یا وہ شور محشر اور یا یہ خموشی قبر کی — آ کر اسکی بزم میں اے دل تجھے کیا ہو گیا"

ذیل میں چند جذبات افروز اشعار درج کرنے پر اختصار کیا جاتا ہے۔

ہوا جس روز سے لذت کش درد محبت میں — سمجھ سکتا ہوں لطف زندگی کی کچھ حقیقت میں
یاد آئے تم تو ہنس کر صبح نے جھڑکا مجھے — پھر گئے آنسو مری پلکوں تلک آئے ہُوئے
کھڑا ہوں انتظار یار میں جوں شاخ نرگس میں — مجھے حیرت ہے کیوں آنکھیں مری پتھرا نہیں جاتیں
یہ کس کے سوز کا ہے بزم جاں میں انتظار اے دل — کہ آہیں آج سوئے عالم بالا نہیں جاتیں۔
ترے گلشن میں تاروں کی بہار اک ہے عجب جادو — یہ کلیاں پھول بن کر اے فلک کمھلا نہیں جاتیں
ہمایوں تیرا دل بھی گلشن حسرت کا غنچہ ہے — خوشی میں بھی تری باتیں وہ غم افزا نہیں جاتیں

پیام راز بزم شوق میں بے تار آتا ہے — سمجھ جاتے ہیں دل کی بات ہم ان کے اشاروں میں

طرفگیٔ خیال و جدت بیان۔ کلام ہمایوں کی یہ اک امتیازی خصوصیت ہے کہ خیالات میں طرفگی ادائے بیان میں جدت پائی جاتی ہے۔ کسی معمولی چیز کے مشاہدہ سے اک نئے خیال کی جانب ذہن کا منتقل ہونا ذہانت کی دلیل ہے ہمایوں جیسے ذہین الفطرۃ شیوا بیان میں یہ صفت ضرور ہونی چاہیئے تھی اور ہے۔

ذیل کے شعر میں اک نفس الامری واقعہ کو کس طرفگی سے بیان کیا ہے

اپنی نظر ہی وقت تماشا بنی حجاب — کیونکر تمہاری دید کا دعوے کرے کوئی
کھلتے ہی آنکھ نقش قدم تک بھی مٹ گئے — اے وائے یوں نہ خواب میں آیا کرے کوئی
پیام راز بزم شوق میں بے تار آتا ہے — سمجھ جاتے ہیں دل کی بات ہم انکے اشاروں میں
سندھ کے نالوں کی آہوں کا دھواں شاید اٹھا — کیسی تاریکی ہے سطح آب پر چھائی ہُوئی

ندرت تشبیہ واستعارہ ۔ کسی شاعر کے کمال کا اندازہ اس کی تشبیہات اور استعاروں کے ابتذال و ندرت سے بھی کیا جاسکتا ہے ۔ مبتذل تشبیہیں اور پامال استعارے شاعری کے دامن پر بدنما داغ اور شاعر کے لئے باعث ننگ ہوتے ہیں ہمایوں اس امتحان میں بھی پورے اترتے ہیں ۔ انکی نادر تشبیہیں، طرفہ خیالات تلاش فکر کا پتہ دیتے ہیں قدرتی آبشاروں کا چٹانوں کو کاٹتے ہوئے بہنا بہت سوں نے دیکھا ہوگا لیکن اکثر دیکھنے والے دیکھ کر بیان کرنے پر قادر نہیں ہوتے ۔ ہمایوں کی قادر البیانی ملاحظہ ہو

کس صفائی سے چٹانیں کاٹیں تیری دھار نے چل رہا ہے اَرّۂ قدرت کہ ہے آبِ رواں؟

آبشار کو ارّۂ قدرت کہنا کس قدر صحیح نادرہ بیانی ہے !!

آبشار کی دوسری تشبیہ ملاحظہ کیجئے ۔

تو ہے یا جاری ہے رسم آمد و رفتِ جہاں یا کہ ہے عکس روانیٔ تصوّر ہائے خواب

کشمیر کے شالامار باغ اور اسکے شاداب درختوں کو مخاطب فرماتے ہیں ۔

ہاں کچھ بتاؤ اگلے زمانے کی کیفیت تم واقعاتِ دہر کے نامہ نگار ہو

کیا تم ہی زندہ ناموں کے باعث ہوئے ہو کیا تم ہی مردہ سلطنتوں کے مزار ہو

کیا تڑپتی ہیں ہر اک سو مچھلیاں تالاب میں جان گویا پڑ گئی ہر قطرۂ سیماب میں

ذیل کا شعر تشبیہ کی ندرت، خیال کی طرفگی کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے ۔

طوطیوں کی اک طرف اُڑتی نظر آئی قطار جس طرح موج ہوا پر ۔ دے دکھائی سبزہ زار

ہندی تشبیہات ۔ میاں صاحب مرحوم نے کئی مرتبہ مجھ سے فرمایا تھا کہ "اردو شاعروں نے کبھی بلبل کو نہیں دیکھا مگر ہندوستانی خوش الحان پرندوں کو چھوڑ کر بلبل کے سر ہو گئے ہیں فرہاد و شیریں، قیس و لیلےٰ میں سے کوئی بھی ہندی نہیں ہے مگر اردو شاعری میں انکی کثرت استعمال سے ایک غیر ہندی کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ نام ہندوستانی ہی نہیں ۔ یہ تقلید اردو کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتی ۔ یہ اردو شاعری نہیں ہے بلکہ ایرانی اور حجازی شاعری کی نقالی ہے آپ اس کے متعلق "مخزن" میں مسلسل مضامین لکھیں" کیا وہ اس ہدایت پر خود بھی کاربند تھے ؟ اس کا جواب اشعار ذیل سے ملیگا ۔

نغمۂ مطرب میں اسکی گونج تک پیدا نہیں لطف جو گلزار میں کوئل کے زیر و بم میں ہے

جو شان اے وادی کشمیر تھی تیرے چناروں میں　　　پھر آ کر دیکھ لی اس کی جھلک ان سبزہ زاروں میں

تشنگی سے خوشہ کی صورت ہے مرجھائی ہوئی　　　منتظر بارش کے ہیں تکی کے اور شالی کے کھیت

بلینک ورس۔ اردو شاعری کی اصل یعنی فارسی شاعری تقلیدی شان سے پیدا ہوئی ہے۔ عربی شاعری کو دیکھ دیکھ کر اہلِ ایران نے گنگنانا شروع کیا تھا اسی لئے اکثر بحور و اوزان بھی وہی اختیار کئے جو عرب شعراء استعمال کرتے تھے ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی ان سے یہ ہوئی کہ عربی شاعری کی آزادی سے انہوں نے استفادہ نہیں کیا بلکہ اپنی غیر فطری شاعری پر ردیف و قافیہ، ایطاء وغیرہ کی غیر محدود پابندیاں لگادیں۔ اردو شاعری نے فارسی شاعری کی اُنگلی پکڑ کر چلنا سیکھا، یہ بھی طبعی نہیں بلکہ تقلیدی ہے اسی لئے اُردو میں اسکی غیر محدود پابندیوں کے ساتھ شعر کہنے کے لئے شاعر کو اپنے دماغ سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔

وقت آگیا ہے کہ اردو کی غیر متناہی قیود کی چار دیواری کو منہدم کر کے اسے تقلیدی کی بجائے طبعی شاعری بنایا جائے۔ ہمایوں مرحوم کی غائر نظری نے اس نکتہ کو پا لیا تھا۔ انہوں نے اہل فن کے اعتراضات کی پروا نہ کر کے بلینک ورس کے انداز میں سخن طرازی کی بنیاد کو سطح زمین سے اوپر اُٹھایا اگر عام شعرا اس مفید طرز کی تتبع شروع کر دیں تو پھر اردو شاعری میں دقیق سے دقیق علمی مسئلے مشکل سے مشکل فلسفیانہ مضامین ادا ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں ایک طویل نظم کا مختصر سا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

اے کوہ تجھ پہ سینکڑوں صدیاں گذر گئیں　　　اور لاکھوں تو نے دیکھے زمانے کے انقلاب
شاہانِ باوقار ہزاروں ہوئے تباہ　　　لاکھوں ہی خاندان بنے اور بگڑ گئے
آندھی کی طرح اٹھے یہاں سینکڑوں گروہ　　　اور خاک ہو کے اُڑ گئے سب گرد کی طرح
کتنے خدا کے بندے ہوائے غرور میں　　　بنکر خدا۔ خدائی کو برباد کر گئے
صدیوں ہی تو نے دیکھا ہے ہر صبح و شام کو　　　تازہ ورق الٹتا کتاب زمانہ کا
کیا کیا ہی نقشے بدلے ہیں اس آسمان نے　　　اور کیسے کیسے گل ہیں کھلے اس زمیں پر

کلام ہمایوں پر یہ اک سرسری نظر تھی ممکن ہے کہ عمیق نظر سے تنقید کیجائے تو کچھ اور فروگذاشتیں پائی جائیں اور یہ تو واقعہ ہے کہ رسالہ میں گنجائش کی کمی کے خیال سے میں نے بہت سی خوبیاں ارادتاً نظر انداز کر دیں۔ ان چند تسامحات سے جن کا ذکر ابتداء میں آچکا ہے قطع نظر کر کے دیکھا جائے

تو تخیل کی رفعت، پیرایۂ بیان کی جدت، خیالات کی پاکیزگی، تشبیہات کی ندرت، فلسفہ آفرینی اور جو خوبیاں کسی رہنما شاعر میں ہونی چاہئیں ان سے کلام ہمایوں مالا مال ہے ہاں جو سب سے ممتاز خصوصیت تھی اور افسوس ہے جسے میں نے سہواً بیان نہیں کیا زبان کی لطافت اور لوچ ہے۔ یہ خصوصیت ایسی ہے کہ میں دیانتداری سے کہتا ہوں پنجاب میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ بقول حضرت محروم۔

"ہم پنجابی شعرا فارسی تراکیب کا اس لئے زیادہ استعمال کرتے ہیں کہ اردو ہماری مادری زبان نہیں۔ جب کسی خیال کے ادا کرنے کے لئے ہمیں اُردو الفاظ نہیں ملتے تو فارسی سے مدد لیتے ہیں" یہ میں نہیں کہہ سکتا حضرت محروم نے جو شعراء پنجاب کی تراکیب نگاری کی وجہ بیان کی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن یہ تو ہر اردو خوان کو معلوم ہے کہ یہاں اردو شاعری میں تراکیب کا بازار گرم ہے اور اس نمک کی کان میں کوئی ہندوستانی شاعر بھی آتا ہے تو لاہوری نمک بن جاتا ہے لیکن ہمایوں کی شخصیت اس بزم میں کہیں نظر نہیں پڑیگی وہ پنجابی ہیں مگر شاعری خالص اور نکھری ہُوئی اُردو میں کرتے ہیں۔ ہمیشہ مجھے ٹوکتے رہتے تھے "کہ آپ اردو نثر میں گرانڈیل عربی الفاظ اور پیچیدہ تراکیب بہت استعمال کرتے ہیں۔ اردو نثر ہو یا نظم عام فہم سلیس اور ترکیب کی اُلجھنوں سے پاک ہونی چاہیئے" اس خیال پر وہ خود بھی کاربند تھے مرحوم کا تمام کلام اس ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ انکا کلام اہل زبان کا سا کلام ہے بلا انتخاب دو چار شعر درج کرتا ہوں۔ الفاظ کی گھلاوٹ، زبان کے لوچ اور مصرعوں کی بے ساختگی پر غور فرمائیے۔

نالوں سے کوئی چرخ کو چکر میں لائے کیوں ۔۔۔ سینے میں رکھ کے دل کو کرے ہائے ہائے کیوں؟

زندہ دلی تمہاری مُبارک رہے تمہیں ۔۔۔ آتا نہیں یہ دل جو بتوں پر تو آئے کیوں؟

نورِ جہاں جو حسن میں پتلی تھی نور کی ۔۔۔ اور قد میں جیسے سروِ لب جوئبار ہو

اس سے زیادہ سلیس روان اور گنجلکوں سے پاک کونسی زبان ہوگی؟

اجمالی رائے۔ حضرت ہمایوں کا شمار گو شاعروں کی پہلی صفوں میں نہیں اگرچہ وہ شاعری میں کامیاب شہرت حاصل نہ کرسکے۔ زندگی کی گرانبار ذمہ داریوں نے انہیں اپنے کلام میں سے بہت سی فروگذاشتوں کو دور کرنیکی مہلت نہ دی لیکن لاریب کہ اک مستفید نظر کیلئے کلام ہمایوں میں ملکی۔ قومی۔ اخلاقی ہدایتوں کا اک غیر مختتم ذخیرہ موجود ہے ایک مستنیر بصیرۃ اس میں سے زندگی کی بھیانک تاریکیوں کیلئے بہت سی درخشانیاں حاصل کرسکتی ہے ہمایوں کے وسعت زبان کے اصول، مفید شاعری کے قوانین کی مدد سے مشترکہ ملکی زبانِ ملکی شاعری کا اک غیر مفتوح قلعہ تیار ہو سکتا ہے۔ (تاجور نجیب آبادی)

پنجاب میں اُردو

ادبِ اُردو کی تاریخ جب کبھی لکھی جائیگی۔ اس میں پنجاب کی خدمات کا باب دیدنی ہوگا۔ ہر چند کہ اردو پنجاب کی مادری زبان نہ تھی۔ مگر پنجاب کو ماں کے دودھ کی طرح راس آئی۔ اور اس نے پنجاب میں وہ فروغ پایا کہ باید و شاید۔ اس ترقی کے کئی سبب ہوئے۔ ایک بڑی چیز جو اس زبان کے پنجاب میں رواج پانے کا باعث ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ جب دہلی جو اردو کا مرکز تھا۔ غدر کی مصیبت کے زمانہ میں اُجڑا۔ اور اس کے اہلِ کمال اِدھر اُدھر منتشر ہوئے تو اتفاقات زمانہ سے چند باکمال لاہور اور پنجاب کے حصہ میں بھی آئے۔ ان سب میں جس شخص کا نام ادب اردو کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے وہ مولوی محمد حسین آزاد مرحوم تھے۔ وہ پنجاب میں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ دہلی کے دلدادہ اور زبانِ دہلی کے عاشق اور شیدائی تھے یہاں لاہور میں یونیورسٹی کی بنیاد قائم ہوئی تو وہ کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ سینکڑوں تعلیمیافتہ نوجوان انکے زیر اثر آئے اور ہر ایک کے دل میں اُن کی بدولت اُردو کی محبت اور اردو کا مذاق پیدا ہو گیا ؎

ہر اک کو مستعار دل مبتلا دیا

یوں ہم نے اک زمانہ کو عاشق بنا دیا

انہوں نے بعض درسی کتابیں سرکاری مدارس کے لئے آسان مگر دلاویز طرز میں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں اور جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مذاق طلبہ کے اعلےٰ طبقہ میں اُن کے فیض صحبت سے پیدا ہوا تھا۔ وہ ابتدائی درجوں میں بھی اُن درسی کتابوں کی بدولت کم و بیش پھیل گیا۔ مولٰنا آزاد مرحوم کا ذکر تو میں نے خصوصیت سے اس واسطے کیا ہے۔ کہ انہیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ورنہ اصلیت یہ ہے کہ ایسے دہلوی اصحاب کی تعداد بہت بڑی ہے جنہوں نے وقتاً فوقتاً پنجاب میں زبانِ اردو کی اشاعت میں شرکت کی ہے اور جن کی خدمات کا یہ صوبہ زیر بار احسان ہے۔ اُن سب کے نام تو اس مختصر مضمون میں لکھنے ممکن نہیں۔ مگر مرزا عبد الغنی صاحب ارشد گورگانی کا نام بے ساختہ زبانِ قلم سے نکلتا ہے۔ وہ بھی جب سے پنجاب میں آئے۔ یہیں رہے۔ انہیں بھی محکمۂ تعلیم سے تعلق تھا اور بیشمار شاگرد اُن سے فیضیاب ہوئے۔ اُن کا کلام زیادہ تر منظوم ہے۔ اور اُن میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنا کلام بڑے

بڑے جلسوں اور مجمعوں میں خود پڑھ کر سناتے تھے اور اپنے زور کلام اور پڑھنے کی استادانہ طرز کی بدولت سامعین پر چھا جاتے تھے۔ جس سے سننے والوں کے دلوں میں اُردو کے پڑھنے اور سننے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ یہ دو ممتاز نام میں نے نمونہ کے طور پر اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لئے لکھے ہیں۔ ورنہ اُن صاحبان کمال کی فہرست بہت لمبی ہے جنہوں نے اردو کو پنجاب میں اس کثرت سے پھیلا دیا اور اُن میں نہ صرف دہلی کے مصنفین شامل ہیں۔ بلکہ لکھنؤ اور دیگر اضلاع صوبجات متحدہ کے رہنے والے بھی شریک ہیں مگر ان حضرات نے جو کچھ کیا وہ اس مقصود کو سامنے رکھ کر نہیں کیا۔ کہ اُردو کو اپنے گھر سے نکلنے کے بعد پنجاب میں ایک نیا گھر مِلجائے وہ اُردو بولتے تھے کیونکہ وہ انکی پیاری زبان تھی۔ وہ شعر کہتے تھے۔ کیونکہ دہلی کے دَورِ آخر کی صحبتیں ابھی اُن کی آنکھوں میں پھرتی تھیں۔ اور انہوں نے بڑے نامور استادوں کے زیر سایہ مشقِ سخن بہم پہنچائی تھی۔ پس وہ جو کچھ کرتے تھے اور کہتے تھے۔ وہ اُن کا قدرتی میلانِ طبع تھا۔ تعجب ہے تو اس بات کا کہ پنجاب نے اُردو کو اس سرعت کے ساتھ اور اس قدر شوق سے کس طرح قبول کیا۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں اس میں ان بلند پایہ اصحاب کا شخصی اثر ضرور شامل تھا جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے مگر پنجاب کے خاص حالات کو بھی اس میں کچھ کم دخل نہ تھا۔ اول تو پنجاب کی اپنی زبان اُردو سے بہت مِلتی جُلتی تھی۔ یہ زبانیں گویا ماں جائی بہنیں تھیں جو مدت سے بچھڑی ہوئی تھیں اور اب آملیں ایک بہن کی بولی شہروں میں رہتے ہوئے نکھر گئی تھی۔ اور دوسری دیہات میں رہنے سے اپنا لب و لہجہ بدل چکی تھی۔ لیکن ملنے کی دیر تھی کہ ایک نے دوسرے کو پہچان لیا اور گلے مل گئیں۔ ایسی کہ پھر جُدا نہ ہوئیں۔ بے شمار لفظ اور محاورے ہیں جو دونو زبانوں میں مشترک ہیں۔ اور جسے شوق ہو وہ اس تلاش کو نہایت دلچسپ پائیگا۔ مگر اس وقت مثال کے طور پر چند لفظوں کا مقابلہ کافی ہوگا۔ ذرا غور سے اوپر کی چند سطروں کو ہی دیکھئے۔ کیا نظر آتا ہے:۔

اُردو یا ہندوستانی	پنجابی
مِلتی جُلتی	مِلدی جُلدی
ماں جائی	ماں جائی
بچھڑی	وِچھڑی
آ مِلیں	آن مِلیاں

نکھر	نِکھر
رل گئیں	رل گئیاں
نہ ہوئیں	نہ ہوئیاں
اوپر	اُپر۔ یا۔ اُتے

دیکھئے دونوں کے خدوخال کیسے ملتے ہوئے ہیں کہ دیکھنے والا فوراً کہے کہ ایک ماں کی بیٹیاں ہیں اور وہ بھی ایک دوسرے کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتی اور پہچانتی نظر آ رہی ہیں۔

پس سب سے زیادہ آسانی تو اردو کے رواج پانے میں اس قدرتی یگانگت اور مناسبت کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ ورنہ جو بیج دہلی کے باغبانوں نے بویا تھا۔ وہ کسی دوسری زمین میں اس حد تک کامیاب نہ ہوتا۔

اردو نے گو ہندی کی گود میں جنم لیا تھا۔ مگر پرورش فارسی کے آغوش میں پائی تھی۔ ممکن تھا کہ اگر پنجاب کو فارسی سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو اُردو کو پنجاب کی ہوا ایسی موافق نہ آتی۔ مگر پنجاب کو فارسی سے بھی بہت تعلق تھا۔ پرانے شاہی زمانوں میں فارسی ہندوستان کے بیشتر حصوں میں بہ طور دفتری زبان کے اسی طرح مروج تھی جیسے اب انگریزی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور اِتفاق سے پنجاب میں باوجودیکہ انگریزی عملداری سے پہلے سکھوں کا راج تھا۔ مگر دفتری زبان اپنی پہلی حالت پر قائم تھی۔ اور سب اہل قلم اور اہلکار خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان فارسی نوشت و خواند سے واقف تھے۔ اردو میں جو فارسی الفاظ کی آمیزش تھی۔ اسکو یہاں کسی نے مغائرت کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ بلکہ پنجابیوں کی فارسی دانی انہیں اردو کے جلد سیکھنے میں ممد ہوئی۔ صوبہ پنجاب کا سرحدی ممالک یعنی افغانستان اور ایران سے نسبتاً قریب ہونا اور اُدھر کے لوگوں کی آمدورفت اِدھر زیادہ ہونا بھی پنجاب میں فارسی کے رواج کا ایک سبب تھا اور اس طرح فارسی سے مناسبت اردو سے مناسبت کا سبب ہوئی۔ ان قدرتی اسباب پر یہ اضافہ ہوا۔ کہ انگریزی راج کے آنے پر فارسی کی جگہ عدالتوں میں اردو کو جاری کیا گیا۔ اور مدارس میں اُردو کی کتابیں پڑھائی جانے لگیں۔ اور اُردو کا رواج روز بروز بڑھنے لگا۔ مگر سب سے زیادہ ترقی اردو کو اخبارات کی بدولت ہوئی۔ پنجاب میں جو قومیں آباد ہیں ان میں سے اگر جسمانی قوٰی کے لحاظ سے ہندوستان کی مضبوط ترین قوموں میں شمار ہوتی ہیں اور اس سبب سے اُن میں

قوتِ عمل میں دوسروں سے کچھ بہتر ہے۔ یہاں کے لوگوں کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کسی کام کی طرف نہ متوجہ ہوں تو نہ ہوں۔ لیکن اگر اُس کی طرف مائل ہو جائیں تو اسے بہت جوش اور سرگرمی سے کرتے ہیں۔ چنانچہ جب تک تعلیم کا یہاں چرچا نہ تھا۔ تو یہ پڑھنے لکھنے میں اور صوبوں سے بہت پیچھے تھے۔ مگر جب سے اس طرف ان کا خیال ہوا ہے انہوں نے تھوڑے عرصے میں خاصی رفتار ترقی دکھائی ہے تعلیم کا چرچا ہوتے ہی اردو اخبارات جا بجا نکلنے لگے۔ یہاں تک کہ اس وقت یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان کے جتنے اخبار اس صوبہ میں چھپتے ہیں۔ کسی اور صوبہ میں نہیں چھپتے۔ اور اُن میں سے اکثر صرف لاہور سے نکلتے ہیں جو پنجاب کی سب تحریکوں کا صدر مقام ہے۔ اخبارات کے علاوہ موقت رسالے بھی جس کثرت سے لاہور میں شائع ہوتے ہیں اور ہوتے رہے ہیں۔ اس کی مثال بھی کسی دوسرے شہر میں موجود نہیں۔ یہ موقت رسالے زبان کی ادبی ترقی کے لئے اخبارات سے بڑھ کر مفید ثابت ہوئے ہیں اخبارات کا یہ نتیجہ ہوا کہ جا بجا اُردو کا چرچا ہو گیا۔ اور شہروں کے کوچوں سے قدم نکال کر اردو دیہات کی گلیوں تک پہنچ گئی۔ مگر زبان کی عمدگی اور سلاست اور درستی اور صفائی کو اخبارات ملحوظ نہ رکھ سکے ایک تو اس سبب سے کہ اُن کے لکھنے والوں میں جہاں بعض اعلیٰ درجہ کے لئیق اشخاص تھے۔ وہیں بہت سے معمولی تعلیم کے لوگ تھے جو الفاظ و محاورات کی صحت کا لحاظ رکھنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ انہیں خبریں بہم پہنچانا اور اپنے اپنے خیال کے مطابق سیاسی رائیں ظاہر کرنا منظور تھا اور زبان کی خوبی ان کے خیال میں چنداں قابل توجہ نہ تھی۔ دوسرے اخبارات میں جو کچھ لکھا یا چھاپا جاتا ہے اس میں بسا اوقات ایسی عجلت ہوتی ہے کہ عبارت کی چستی یا سستی کی پروا کرنے کا موقع نہیں ہوتا اور نہ لفظوں کی طرف زیادہ دھیان ہوتا ہے۔ اخبار کے نامہ نگاروں اور ترتیب دینے والوں کو اپنے روزانہ کام سے کام ہوتا ہے اور بس۔ برعکس اس کے رسالے خاص ادبی خدمت کے لئے ہوتے ہیں اور انہیں ایسے لکھنے والوں کی تلاش ہوتی ہے جو مضمون نگاری میں خاص مہارت رکھتے ہوں اور کچھ نام ملک میں پیدا کر چکے ہوں۔ اُن لکھنے والوں کو بھی علمی قدر مراتب اپنی شہرت قائم رکھنے کا خیال ہوتا ہے اور رسالوں کے اڈیٹروں کو ضروری اصلاح مضامین و صحت زبان کے لئے کافی وقت ملتا ہے۔ اس لئے رسالے خاص طور پر ادبی ترقی کے لئے فائدہ مند ہوتے ہیں۔ مجھے اس سے بہت مُسرّت ہوئی ہے کہ میرے دوست میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا خلف الرشید

میاں محمد شاہ دین صاحب بی۔اے۔ مرحوم سابق جج چیف کورٹ پنجاب نے اپنے والد ماجد کے علمی کاموں کی یادگار کے طور پر ایک ماہوار رسالہ جاری کرنے سے پنجاب کے نامور ادبی رسالوں میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ میاں محمد شاہ دین مرحوم ہمایوں تخلص کرتے تھے اور باوجود کثرت مشاغل کے اُردو نظم کے لئے کچھ وقت نکال لیا کرتے تھے اور ان کے اشعار پُرلطف ہونیکے ساتھ پُر مغز ہوتے تھے۔ اِس لئے اس رسالہ کا نام ہمایوں رکھا گیا ہے۔ جو نہایت موزوں ہے۔ ہم اس رسالہ کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کرتے ہیں۔ تاکہ یہ دیر تک اُردو زبان اور ادبِ اُردو کو فائدہ پہنچائے۔ اور پنجاب اپنی بساط کے مطابق جو مدد اردو زبان کی ترقی کے کام میں آج تک دیتا رہا ہے۔ اُس کی رفتار کو تیز تر کر دے۔ میاں بشیر احمد کا مذاق علمی۔ جو انہیں اپنے والد مرحوم سے وراثتاً پہنچا ہے۔ ان کی تعلیم جو مغربی و مشرقی مذاق کی جامع ہے اور اُن کا شوق اور تلاش جس نے اس پہلے پرچہ میں ہی ہندوستان کے ہر حصے سے مشہور صاحبانِ فن کے مضامین نظم و نثر جمع کر دیئے ہیں۔ اس رسالہ کی کامیابی کے لئے نہایت امید افزا ہیں۔ اور اس کام میں انکے ساتھ مولنا تاجور جیسے فاضل اور مشاق ادیب کی شرکت اس کی عمدگی کی کافی ضمانت ہے +

عبد القادر

عمل

قابلیت کا ایک ہی ثبوت ہے۔ عمل !
اُمید پُر تخیل عمل سے نشوونما پاتی ہے۔
ہم سب تمام کام نہیں کر سکتے۔
عمل فائدہ دیتا ہے نہ کہ اُس کی شہرت۔
جب ہم جو چاہیں نہ کر سکیں تو چاہیئے کہ جو ہو سکے کریں۔

(ترجمہ)

بشیر احمد

شالامار باغ لاہور

ہنوز لاہور کے شالامار باغ کی وجہ تسمیہ تحقیق نہیں ہُوئی ہے۔ میرے خیال میں دو ایک وجوہات اس نام کی آئی ہیں جو میں عرض کرتا ہوں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے ایک شالامار قندھار میں ہے ایک کشمیر میں اور ایک لاہور میں علاوہ اِن باغوں کے ایک اسٹیشن بنگال ناگپور ریلوے پر اس نام کا ہے۔

شالامار دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک شالا۔ دوسرا۔ مار۔ شالا بزبان ہندی گھر کو کہتے ہیں مثلاً دھرم شالہ۔ گئو شالہ۔ پاٹ شالہ وغیرہ۔ مار فارسی میں سانپ کو کہتے ہیں اور کشمیری زبان میں ندی یا نالہ کو کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ شالہ مار کا لفظ ہندی اور کشمیری الفاظ شالہ اور مار سے بنا ہو۔ یعنی ندی کا گھر۔ کشمیر والہ شالہ مار جھیل ڈل کے قریب واقعہ ہے اور اس میں شمالی پہاڑی کی جانب سے پانی آتا ہے۔ ڈل کے ایک طرف ایک نالہ ہے جسے نالہ مار کہتے ہیں۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ شالہ مار ایک تُرکی لفظ ہے جس کے معنے باغ کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ لفظ "شعلہ ماہ" سے بگڑ کر شالامار بن گیا ہے قبل اس کے کہ ہم وجہ تسمیہ کا ذکر کریں مناسب ہے کہ ان تینوں شالاماروں کا مختصر حال بیان کر دیا جائے۔

(۱)۔ شالامار قندھار۔ اسی شالہ مار کا ذکر مسٹر میسن (Mason) اپنے سفرنامہ میں کرتے ہیں (جلد اول صفحہ ۲۷۶) لیکن اُس کے بانی کا نام اور سال تعمیر میں دریافت نہیں کر سکا۔ اگر یہ شالہ مار چغتائی یا کسی اور مغل نے بنایا ہے اور لاہور کشمیر کے شالامار سے پہلے بن چکا تھا نیز یہ کہ کوئی تُرکی لفظ شالامار ہے جس کے معنی باغ کے ہیں تو سوال حل ہو گیا لیکن یہ حل نہ ہُوا کہ کشمیر اور لاہور والے باغوں کو کیوں شروع ہی سے شالامار کا نام نہ دیا گیا۔

(۲)۔ شالامار کشمیر۔ پنڈت انند کول پریزیڈنٹ میونسپل کمیٹی سری نگر نے بتقریب آمد وائسرائے بہادر ۱۹۱۲ء میں ایک مضمون بزبان انگریزی شالا باغ اور نشاط باغ پر شائع کیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ روایت ہے کہ راجہ پرا ور سین ثانی کشمیر کے حکمران ۷۹ء سے ۱۳۹ء تک رہے اور وہی بانی سری نگر کے تھے اُنہوں نے ڈل کے نواح میں ایک پُر فضا بنگلہ بنایا تھا۔ اور جب وہ ایک ولی اللہ یعنی ایک

رشی شنکر سوامی کی زیارت کو جایا کرتے تھے (جو ہارون جھیل کے پاس رہا کرتے تھے) تو اس بنگلہ میں آتے جاتے ٹھیرا کرتے تھے۔ راجہ مذکور نے اس بنگلہ کا نام شالی مار رکھا تھا۔ سنسکرت میں شالی مار کے معنے "مسکن عشق" ہے۔ رفتہ رفتہ اس بنگلہ کے آس پاس آبادی ہوگئی اور ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہوگیا۔ جہانگیر کے عہد میں بنگلہ تو اُجڑ چکا تھا لیکن یہ آبادی قایم تھی جسے شالی مار کہتے تھے۔ یعنی اُس بنگلہ کے نام پر اس گاؤں کا نام پڑ گیا تھا۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو سوال طے ہوگیا۔

جہانگیر نے اس گاؤں کے قریب ایک باغ بنایا جس کا نام فرح بخش رکھا گیا۔ کسی فارسی شاعر نے اس باغ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے شروع کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ کے بننے سے پہلے اس مقام کا نام شالی مار تھا۔ جس سے ایک گونہ روایت مذکور کی تائید ہوتی ہے۔ وہ اشعار یہ ہیں :۔

۱ شنیدم شاہ روشن دل جہانگیر
زعشرت شد چو رونق بخش کشمیر

۲ چو شد دامان دریا جلوہ گاہش
بسوئے شالی مار اُفتاد راہش

۳ فضائے دید چوں روئے عروساں
سزاوار عمارات و گلستاں

۴ بہ طبعش روح روح افزا اثر کرد
گراں خوابی و ماغش را خبر کرد

۵ بگفت ایں دشت رنگیں روئے حور است
زما سر منزل ایں جا ضرور است

اس نظم کے باقی اشعار میں باغ کا نام "فرح بخش" آتا ہے اور آخیر شعر میں الفاظ "فرحت گاہ شاہی" مادہ تاریخ سے ۱۰۳۱ھ ہجری نکلتا ہے۔ شعر (۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے عہد سے پہلے کوئی مقام شالی مار نہ کہ شالا مار کے نام سے مشہور تھا۔ پنڈت انند کول نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاہجہان نے ۱۶۳۰ء میں اس باغ کے رقبہ میں ایزادی کی۔ جہانگیر نے ۱۶۱۹ء میں باغ بنایا تھا اور شاہجہان نے

حصہ ایزاد شدہ کا نام فیض بخش رکھا تھا۔ خصالی شاعر نے اس حصّہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا اس کے اخیر شعر سے سال تعمیر ۱۰۴۲ھ ہجری نکلتا ہے۔ گویا موجودہ باغ وسعت پاکر ۱۲ سال میں تیار ہو گیا تھا۔ برنیر نے اس باغ کا نہایت دلچسپ حال اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے۔ مجھے وہ دن نہیں بھولتا۔ جب ہمایوں مرحوم اور یہ عاصی اس باغ میں یکجا تھے وہ تو مغل شہنشاہوں کے باغات کی ستایش و توصیف میں مصروف تھے اور بندہ اس کی بارہ دری کے پتھروں کے صیقل اور آب و تاب اور اُنکے نقوش کو دیکھتا اور برنیر کے رقمزدہ حالات سے تطبیق دیتا تھا۔ کبھی کبھی باہم نوک جھوک مذاقیہ چھیڑ چھاڑ بھی ہوتی تھی جس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ گذشتہ سفر کشمیر میں میں نے بارہ دری کے بعض حصوں کے فوٹو بھی لئے جو تاریخی تحقیقات میں آئندہ مدد دینگے۔ ہمایوں مرحوم کی رنگینی طبع اور ہلکی ہلکی ظرافت ان دنوں میں اُن کے احباب کے لئے ایک عجیب نعمت تھی پنجاب ریکارڈ کے صفحوں میں طبیعت کا رنگ اور ہے۔

۲۔ لاہور کا شالا باغ۔ لاہور گزیٹیر (صفحہ ۲۵۹) میں اسکا سال تعمیر ۱۶۶۷ء دیا گیا ہے اور سید محمد لطیف سال تعمیر ۱۶۳۴ء لکھتے ہیں مگر مادہ تاریخ سے جو کسی شاعر نے لکھا تھا بقول اُن کے سال تاریخ ۱۶۳۷ء نکلتا ہے۔ نہ معلوم کونسا سال صحیح ہے۔ خواہ کوئی سال ہو اس میں شک نہیں کہ کشمیر کے شالامار سے لاہور والا شالامار باغ چند سال بعد شاہجہاں نے بنوایا۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ لاہور والے باغ کا نام بھی فرح بخش ہی کتابوں میں آیا ہے۔ (بادشاہ نامہ مصنفہ عبدالحمید لاہوری + معاصر عالمگیری) وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ سب سے پہلی دفعہ اس باغ کا نام شالامار نادرشاہ کے مورخوں نے لکھا ہے۔ مگر وہ بیان نہیں کر سکے کہ کب اور کیونکر بجائے فرح بخش کے اسکا نام شالامار پڑ گیا غالباً اُنکو معلوم نہ تھا کہ کشمیر والے شالا باغ کا نام بھی فرح بخش تھا اور یہ بھی غالباً اُنکو معلوم نہ تھا کہ کشمیر میں جہاں جہانگیر نے باغ فرح بخش بنایا تھا اُس مقام کا پہلے ہی سے نام "شالی مار تھا" (تاریخ لاہور ۱۴۲/۱۴۴)

پنڈت منشی موہن لال سیاح اپنے سفرنامہ میں لاہور والے باغ کا نام "شعلہ ماہ" بتاتے ہیں جسکا غلط العام شالامار ہے۔ اُنہوں نے شاید نادرشاہی عہد کے کسی مورخ کی کتاب میں پڑھا ہو گا۔ کسی نے اُنکو لاہور میں یہ وجہ تسمیہ بتائی ہو گی۔ اسکو شک نہیں کہ بقول بعض اصلی لفظ "شعلہ ماہ" تھا چنانچہ سید محمد لطیف تاریخ پنجاب صفحہ ۳۶۰/۳۶۱ میں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں شالامار کی وجہ تسمیہ پر گرم بحث ہوئی تھی۔ مہاراجہ صاحب موصوف نے فرمایا کہ ضلع جھنگ کی زبان میں شالا کے معنی

پرمیشر کے ہیں اور مار دیسی زبان میں بددعا یعنی لعنت کو کہتے ہیں میں ایسا نام پسند نہیں کرتا مناسب ہے کہ اسکا نام بدل دیا جائے۔کسی درباری نے عرض کیا کہ حضور شالامار ترکی لفظ ہے جسکے معنے عشرت گاہ کے ہیں مہاراجہ صاحب فرمانے لگے میں نہیں مانتا کیونکہ اگر چغتائی بادشاہوں نے ترکی نام رکھا ہے تو نادرشاہ کی تاریخوں میں شعلہ ماہ کیوں آیا ہے۔سید صاحب فرماتے ہیں کہ مہاراجہ صاحب نے اسکا نام شہلا باغ تجویز کیا اور کہا کہ شہلا کے کے معنے سیاہ چشم معشوق کے ہیں یہ نام اچھا ہوگا اور حکم دیا کہ خط و کتابت سرکاری میں آئندہ اس کا نام شہلا باغ لکھا جائے۔میرے خیال میں یہ قصہ قدرے مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ غالباً یہ بحث اہلکاروں میں ہوئی ہوگی ورنہ مہاراجہ کو نادرشاہ کے مورخوں اور لفظ شہلا کے معنی معلوم ہونا قرین قیاس نظر نہیں آتا ہاں یہ سچ ہوگا کہ لفظ شالامار جس میں لفظ مار آتا تھا مہاراجہ صاحب کو پسند نہ ہوگا کسی درباری نے نام شہلا بتایا اور معنی بتائے ہونگے جو مہاراجہ صاحب کو پسند آئے اور انہوں نے احکام جاری کر دئے۔

اب سنئے کہ ہمیں بھی تحقیقات کا خبط ہے۔ہم نے مردم شماری کشمیر کی کتاب حاصل کی تو معلوم ہوا کہ چار ایسے گاؤں اس وقت موجود ہیں جن کی ابتدا میں شال کا لفظ آتا ہے

۱۔ **شال ٹین** ۔ یہ جگہ دریائے جہلم کے کنارہ پر چند میل سری نگر سے واقعہ ہے یہاں پر سری حضور مہاراجہ صاحب بہادر آتے جاتے قیام فرماتے ہیں۔

۲۔ **شالانار**۔ ایک گاؤں ہے۔

۳۔ **شالامرحق** ۔ ایک گاؤں ہے۔

۴۔ **شال بگ** ۔ ایک گاؤں ہے۔

ہم نے ایک کشمیری سے شال بگ کی وجہ تسمیہ دریافت کی اس گاؤں کے قریب ہم اترے ہوئے تھے۔اس نے بتایا کہ شال کشمیری زبان میں گیدڑ کو کہتے ہیں۔کسی زمانہ میں اسی گاؤں میں گیدڑوں کی کثرت تھی جب آبادی زیادہ ہوگئی تو گیدڑ کم ہوگئے لیکن گاؤں کا نام گیدڑ کے نام پر پڑ گیا ہمکو اسی وقت جالندھر کے ضلع کا ایک گاؤں یاد آیا جسکا نام گیدڑ پنڈی ہے۔ پہلے تو ہمکو خیال آیا کہ شاید یہ شخص مذاق کرتا ہے لیکن ہم نے سری نگر پہنچ کر تصدیق کی تو فی الواقعہ شال کشمیری زبان میں گیدڑ کو کہتے ہیں

ہم اس تحقیقات میں تھے کہ پنڈت انند کول نے جو روایت بیان کی ہے کہاں تک صحیح ہے۔ کہ اتفاق سے اثنائے مطالعہ میں ایک پوران میں جس کا نام اگنی پوران ہے (Agni Puran)

ہمیں ایک پھول کا نام نگاہ سے گذرا جسکا نام "شالی مالی" ہے۔ تخیّل نے ہمیں بتایا کہ کسی گلستان کا نام اُس پھول سے پڑ سکتا ہے جو کثرت سے اس میں موجود ہو۔ شاید راجہ پرادرسین نے منگلہ کا نام اس وجہ سے شال مالی رکھا ہوگا کہ شالی مالی پھول جو دیوتاؤں کو چڑھایا جاتا ہے اس میں زیادہ لگائے ہونگے گویا اس طریق سے نام آبادی کا یہی پڑ گیا اور آبادی کے نام سے جدید باغ کا نام بھی یہی ہو گیا ابتدا اس سے شروع ہوتی ہے۔

۱۔ شال مالی۔ پھول۔
۲۔ شالی مار۔ مار کشمیری میں ندی کو کہتے ہیں۔
۳۔ شالامار۔ ر۔ اور ل کا اکثر تبادلہ ہوتا ہے۔

غالباً جہانگیر نے شالی مار کے رقبہ پر جو باغ بنایا خود تو اُس نے ایک بامعنی نام فرح بخش رکھا۔ لیکن لوگ اُس باغ کو آبادی شالی مار کے نام سے پکارنے لگے ہونگے۔ لاہور والے باغ کا نام بھی فرح بخش تھا لیکن جو نام کشمیر والے باغ کا تھا۔ جس کی یہ نقل تھی اسی نام سے مشہور ہوگیا خیر نام تو کسی وجہ سے ہُوا ہو۔ اب اس باغ کے لئے ایک فردوسی کی ضرورت ہے جو ہند کے راجگان وشاہانِ سلف کا شاہنامہ لکھے۔ معاف فرمائیے ہمیں خبطِ تاریخ سے مخلصی نہیں ہے۔

شمیم۔

اقوالِ زرّیں

اے کاش! میری زندگی موسمِ بہار کے پھولوں کی مانند شگفتہ ہو اور میری موت فصلِ خزاں کی پتّیوں کی طرح پژمردہ۔

تاریکی وحدت کا مسکن ہے۔ روشنی کثرت کی جلوہ گاہ!

آزادی اور اتحاد! اب اور ہمیشہ کے لئے! دو قالب یک جان!

سچی آزادی وہ ہے جو غلامی میں پیدا ہو۔ خوفِ خدا میں پلے اور محبتِ انسانی میں نشو ونما پائے۔

فرسودہ ہونا زنگ آلودہ ہونے سے بہتر ہے۔

(ماخوذ)

تعلیم

بنی نوع انسان کی گذشتہ تاریخ سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اپنے اپنے زمانہ میں وہی قوم بمقابلہ دیگر اقوام کے زیادہ ممتاز ہوئی۔ اُسی قوم نے دولت وجاہت اور طاقت میں اپنی ہمسایہ اقوام سے برتری حاصل کی جس نے حصولِ علم کو اپنا سب سے پہلا فرض قرار دیا۔ خصوصاً گذشتہ سو سال کی تاریخ بین الاقوام پر غور کرنے سے اس سنہری اصول کی صداقت کا پُورا ثبوت ملتا ہے۔ آج دنیا میں سب سے زیادہ معزز اور طاقتور وہ اقوام ہیں جنہوں نے خواب غفلت سے بیدار ہوتے ہی اس اصول کو اپنے دل و دماغ میں جاگزیں کر کے اپنی قومی کوششیں تعلیم کے رائج کرنے میں لسرکردیں

گذشتہ سو سال میں جن اقوام نے تہذیب و ترقی کے میدان میں بازی لے جانے کی غرض سے اپنی طاقتوں کو بطرز احسن استعمال کیا ہے اُنکے حالات کا بغور مطالعہ کرنے سے عیاں ہے کہ اُن میں سے ایک معقول جماعت نے اعلیٰ تعلیم کا حصول قوم کی نجات کے لئے لازم سمجھا۔ اور صرف آرٹس نہیں بلکہ سائنس۔ میڈیکل ٹیکنیکل وغیرہ صیغہ ہائے تعلیم کی طرف انہوں نے خاص توجہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی قومی طاقت اور دولت روز بروز ترقی کرتی گئی اور آج وہ قومیں دنیا بھر کی اقوام میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ اسی اعلیٰ تعلیم کے حصول کی بدولت اُنہوں نے سائینس میں وہ نئے ایجاد کئے ہیں کہ جنکی وجہ سے اُنکی خاطر قدرت نے اپنے خزانوں کے دروازے کھولدیئے۔ سونے چاندی۔ کوئلے وغیرہ کی کانوں کو دریافت کرنے اور موجودہ زمانہ کی ایجاد کردہ کلوں کے ذریعہ اُن کو تحت الثریٰ سے باہر لانے کی وجہ سے ان اقوام نے اپنے اپنے مُلک کی تجارت و دولت کو وہ فروغ دیا کہ آج دوسری پس ماندہ اقوام اُنکی دست نگر ہیں۔

مگر قوموں کی کماحقہٗ ترقی کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ اُن میں ایک محدود تعداد اعلےٰ تعلیم حاصل کر کے وہ نتائج پیدا کرے جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اگر قوم کی اکثریت جہالت کے دریائے بے پایاں میں غوطہ زن رہے۔ تو اُس کے محدود حصّہ کا اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہونا بحیثیت مجموعی

قوم کے لئے چنداں مفید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ قوم کے زیادہ تر حصہ میں تعلیم کی عدم موجودگی خود اُس محدود حصہ کی ترقی کے لئے نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ اور جب ہم اس امر کو مدِنظر رکھیں کہ ساری قوم کے لئے اعلٰے تعلیم کا حصول ناممکن اور غیر ضروری ہے تو قدرتاً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قوم کے زیادہ تر حصّہ میں ابتدائی تعلیم کا رواج لابدی ہے۔ ورنہ بوجہ جہالت قوم کا کثیر التعداد حصہ توہمات کے علاوہ مذہبی اور پولٹیکل ہٹر بونگ کا شکار رہیگا۔ جس سے اس سنہری اصول کا بھی بیّن ثبوت مِلتا ہے کہ "بے علم نتواں خدارا شناخت"۔ الغرض ابتدائی تعلیم کا ملک میں عام طور پر رائج ہونا۔ قوم کے لئے ہزاروں برکتوں کا موجب اور اہلِ مُلک کا اُس سے بے بہرہ ہونا لاکھوں آفتوں کا سبب ہوتا ہے۔

بدیں وجوہات میں بہی خواہانِ ملک و قوم کی خدمت میں نہایت زور سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی کوششوں کو ملک میں اشاعتِ تعلیم کی طرف خاص طور پر راغب کریں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ گذشتہ چند سال میں بہی خواہانِ ملک کی توجہ دیگر معاملات کی طرف زیادہ تر مائل ہونے کے باعث ہماری تعلیمی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ جس سے ملک و قوم کو سخت نقصان کا اندیشہ ہے۔ یقین جانئے کہ قوم کی تعلیمی ترقی کا رُکنا قوم کے لئے زہر قاتل ثابت ہوگا اور اخیر میں قوم کو وہ بُرے نتائج برداشت کرنے پڑینگے کہ پھر اُنکی تلافی ناممکن ہوگی۔

محمد شفیع

تیری ہے وہ روشنی

تیری ہے وہ روشنی جو تاریکی میں ضیاء ریز ہوتی ہے اور وہ نیکی جو بُرائی کے دلِ دونیم سے پھُوٹ نکلتی ہے!

تیرا ہے وہ گھر جسکا دروازہ دُنیا میں کھُلتا ہے اور وہ محبت جو میدانِ جنگ کی طرف بُلاتی ہے!

تیرا ہے وہ ہدیہ جو پھر بھی سُود ہے جب کہ ہر کچھ زیاں ہو جائے اور تیری ہے وہ زندگی جو موت کے غاروں میں سے ہو کر بہتی ہے!

تیری ہے وہ جنت جو خاک پا میں موجود ہے اور وہاں تُو میرے لئے موجود ہے۔ وہاں تُو سب کے لئے موجود ہے

ٹیگور

شاہانِ تیمور کی آخری قبر

برہما کے پایۂ تخت رنگون میں ۱۲ نومبر ۱۹۲۱ء کو ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کی قبر دیکھی جو برہمیوں کے مشہور مندر پرکوڈا (پھایا) کے شرق میں ایک انگریزی کوٹھی کے کمپونڈ میں واقع ہے۔ چھاؤنی کا علاقہ ہے سڑک کے جنوب میں بیری کا ایک بلند درخت ہے۔ جو زمین سے پانچ گز اونچا اور اچھا گنجان ہے اسکی جڑ میں ایک چھوٹی سی قبر واقع ہے۔ جس پر سبز کپڑا پڑا ہوا ہے۔ اسکے برابر لوہے کا ایک انگریزی جنگلہ ہے اور اسکے اندر بھی ایک کچی قبر ہے۔ اس قبر پر بھی ایک سبز کپڑا پڑا ہوا تھا۔

معلوم ہوا بیری کے نیچے چھوٹی قبر بہادر شاہ کی ہے۔ اور اس کے برابر آہنی جنگلہ میں انکی مشہور پیاری بیگم زینت محل دفن ہیں۔ فاتحہ خوانی کے بعد میں نے قبر کے اوپر سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو وہ بالکل کچی ہے۔ اور زمین سے صرف چار پانچ انچہ اونچی ہے۔ زینت محل کی قبر بھی کچی ہے۔ سُنا تھا بہادر شاہ کی قبر پر انگریزی زبان میں ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ مگر مجھکو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ قبر کے قریب ایک بڈھا فقیر بیٹھا تھا۔ اور کچھ عورتیں اور بچے بھی موجود تھے جو بادشاہ کی قبر پر زیارت کرنے آئے تھے۔ معلوم ہوا یہاں جمعرات کو بہت لوگ زیارت کو آتے ہیں اور اس فقیر کے سبب مزار بہادر شاہ کی چراغ بتی کی خدمت ہو جاتی ہے۔

تصور کے آنسو میں ایک پردیسی کی قبر کے پاس کھڑا تھا۔ جسکا نام بچپن سے سنتا آیا تھا۔ اور جس کی یاد میں سات کتابیں مستقل تصنیف کی حیثیت سے شایع کر چکا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں دہلی کے آخری شہنشاہ کے مرقد پر کھڑا کیا سوچ رہا تھا۔ کیونکہ منظر کی خاموشی اور اُداسی۔ ناریل کے اونچے درختوں کا عالم حیرت وحسرت میں چپ چاپ کھڑا ہونا۔ کالے کوّوں کا گستاخانہ بولنا۔ سفید ڈاڑھی والے فقیر کا ٹکٹکی جمائے میری طرف دیکھنا مجھکو غور کرنے سے روکتا تھا۔

جسکو انگریز گریٹ مغل امپائر کہتے ہیں۔ اسکا آخری جانشین خاک کا دوشالہ اوڑھے سوتا تھا۔ یہ اپنے وطن دہلی سے ہزارہا میل دور اسیری۔ غریبی۔ اور بیکسی کے عالم میں لحد کے اندر لیٹا دنیا کے عروج و زوال کا درس دے رہا تھا۔

یہ تیمور کے فرزند کی قبر ہے جو دنیا کے بڑے منصب کا فاتح تھا۔ یہ بابر کا نور چشم ہے جس نے ہندوستان

کو تلوار کے زور سے فتح کیا تھا۔ یہ ہر دلعزیز اکبر کی نشانی ہے۔ یہ اس شاہجہان کا پوتا تھا جس کے مقبرہ کی زیارت کیلئے یورپ و امریکہ تک سے سیاح آتے ہیں۔ اور جسکو دنیا کی بے مثل عمارت سمجھا جاتا ہے۔ یہ اس شاہ عالم کا سگا پوتا ہے۔ جس نے انگریزوں کو وزارت کا قلمدان مرحمت کیا تھا۔

یہ سونے چاندی کے جڑاؤ تخت پر بیٹھنے والا اور ریشمی و مخملی تکیوں پر سر رکھکر سونے والا تھا۔ اسکے سامنے باوجود اقتدار سلطنت ختم ہو جانیکے تمام ہندوستان ادب سے سر جھکاتا تھا۔ آج برہما کے ملک میں سمندر کے کنارے شہر رنگون کے اندر کیسی بیچارگی سے بے بس پڑا ہے۔ جسکی قبر پر دو پکی اینٹیں بھی نہیں ہیں۔ اور عبرت و مایوسی کے سوا آج اسکا کوئی مونس و ہمدم نظر نہیں آتا۔ پہلو میں وہ زینت محل بیگم سوتی ہے۔ جسکی محبوبیت کے افسانے مشہور ہیں اور جو سلطنت مغلیہ کے خاتمہ میں ایک تاریخی پارٹ ادا کر چکی ہے۔ مگر آج خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی باقی نہیں۔

اے غریب بادشاہ میں تیرے وطن سے آیا ہوں۔ اے پردیسی ملکہ میں تیرے شہر دہلی کا باشندہ ہوں۔ تم دونو مشرقی تمدن کے آخری چراغ تھے۔ تمہارے گل ہونیکے بعد ہماری ساری مجلس درہم برہم ہو گئی۔ تم نے پروانوں کا جلنا تو دیکھا۔ تم نے ساقی کے ہاتھ سے جام کے گرنے اور ٹوٹ جانیکی کیفیت بھی دیکھی۔ تم اس وقت تو موجود تھے جب بزم مشرقی کی بساط اٹھائی جا رہی تھی۔ اور شمعیں ایک ایک کر کے جھلملا جھلملا کر خاموش ہو رہی تھیں اور بادۂ شبانہ کے مست خانہ عیش و سرور جبراً نکالے جا رہے تھے۔

مگر تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اب محفل ہی ختم ہو گئی۔ سوختہ پروانوں کے ڈھیر، شمعوں کے نیم گداختہ وجود۔ جام و صراحی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے سب جھاڑو سے صاف کر کے کہیں پھینکدیئے گئے۔ اور اب اس مکان میں شب گذشتہ کا کچھ بھی نشان باقی نہیں رہا۔

آج دہلی میں تمہاری اولاد بھیک مانگتی ہے۔ آج دہلی میں تمہارے بچے فاقے کرتے ہیں۔ آج تمہارے پایۂ تخت میں تمہارا خاندان سب خاندانوں سے زیادہ ذلیل اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔

تم یہاں بیکس ہو۔ وہ وہاں بے بس ہیں۔ تم یہاں لاچار ہو۔ وہ وہاں بے سہارے ہیں۔ تمکو برہما کی زمین نگل گئی۔ انکو دہلی کا آسمان کھا گیا۔ اب نہ تم رہے نہ وہ۔ اب فقط فنا و نابود ہونے کا دھبہ سا باقی رہ گیا ہے۔ جسکے سرہانے کھڑے ہو کر مجھ جیسے دیوانے عبرت کے دو آنسو بہا لیتے ہیں۔

حسن نظامی

یادِ ایّام

فاروقِ اعظم (زمانۂ خلافت از ۶۳۴ء تا ۶۴۴ء) حضرت عمرؓ اپنی رعایا کی نگہداشت میں ذاتی آرام و آسائش کا کبھی خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اُنکے غلام اسلم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کو گشت کیلئے نکلے۔ مدینہ سے تین میل پر حرار ایک مقام ہے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچّے رو رہے ہیں۔ پاس جاکر حقیقتِ حال دریافت کی۔ اُس نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچّوں کو کھانا نہیں ملا ہے اُنکے بہلانیکے لئے خالی ہانڈی میں پانی ڈالکر چڑھا دی ہے۔" حضرت عمرؓ اُسی وقت اُٹھے مدینہ میں آکر بیت المال سے آٹا گوشت گھی اور کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا کہ "میری پیٹھ پر رکھ دو۔" اسلم نے کہا "میں لئے چلتا ہوں"۔ فرمایا "ہاں! لیکن قیامت میں میرا بار تم نہیں اُٹھاؤ گے۔" غرض سب چیزیں خود لاد کر لائے اور عورت کے آگے رکھدیں۔ اُس نے آٹا گوندھا ہانڈی چڑھائی۔ حضرت عمرؓ خود چولھا پھونکتے جاتے تھے۔ کھانا تیار ہُوا تو بچّوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اُچھلنے کُودنے لگے حضرت عمرؓ دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ عورت نے کہا "خدا تمکو جزائے خیر دے سچ یہ ہے کہ امیر المومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ عمرؓ"۔

(الفاروق)

لارڈ بائرن (پیدائش ۱۷۸۸ء وفات ۱۹ اپریل ۱۸۲۴ء) اس مشہور انگریزی شاعر کی بہترین نظم چائلڈ ہیرلڈ ہے جسکے متعلق کہا گیا ہے کہ شاعر نے اپنے ہیرو کے پردے میں اپنی شخصیت اور اپنے جذبات کا خاکہ کھینچا ہے اگرچہ بائرن خود اس امر کا اقرار نہ کرتا تھا۔ مورخین متفق ہیں کہ اسی پُرجوش نظم سے متاثر ہو کر دُولِ یورپ نے ترکوں کے خلاف یونانیوں کی جانب داری کا بیڑا اُٹھایا اور اپنی فوجی اعانت سے یونان کو جو صدیوں سے غلامی کی بیڑیاں پہنے ہُوئے تھا۔ آزاد کیا بائرن بذاتِ خود اس جنگِ آزادی میں شریک تھا اور وہیں دورانِ جنگ میں بمقام مسولونگی عارضۂ بخار میں مبتلا ہو کر جان بحق ہوا۔ اِس معرکۃ الآرا نظم کے پہلے دو حصّے شائع ہوتے ہی یورپ بھر میں ایک عظیم الشان تہلکہ پڑ گیا۔ اور تمام اہلِ مغرب کی آنکھیں اس نوجوان انگریزی شاعر کی طرف اُٹھ گئیں۔ خود بائرن نے کہا ہے کہ "ایک روز میں اُٹھا اور میں نے دیکھا کہ ہر سو میری شہرت کا ڈنکا بج رہا ہے"

بشیر احمد

جدا اور مختلف زبانیں بن جائینگی ہندو اور مسلمانوں کو اس غلطی سے متنبہ ہونا واجب ہے کیونکہ دونوں کی نادان دوستی زبان اور ملک دونوں کے حق میں عین دشمنی ہے۔

جیساکہ میں نے یہاں کہا ہے زبان خیالات کا بیرونی پردہ ہے۔ اس قسم کا اختلاف دلوں کے اختلاف کی دلیل ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ مسلمان شعرا بسنت اور ہولی کے قصاید لکھتے تھے۔ کنہیاجی کی مداحی میں نظیر اکبرآبادی کا درجہ سورداس جی سے کم نہیں۔

ہندو شعرا اپنا کلام ہمیشہ حمد الہی کے بعد جناب رسالتمآب صلعم کی نعت اور جناب امیرؑ کی منقبت سے شروع کرتے تھے کیا کوئی بھول کر بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ مسلمان شعرا مسلمان نہ تھے یا یہ ہندو شعرا ہندو نہ تھے سچے مذہب کو کبھی بلند نظری اور رواداری سے نقصان نہیں پہنچتا بلکہ کوتہ بینی اور تنگ خیالی ہی اسکی اصلی دشمن ہے"

(اردو)

انسانی تاریخ۔ ہمعصر مخزن کے اکتوبر نمبر میں حضرت سالک نے ٹیگور کے "دنیائے مغرب کے نام پیغام" کا دلچسپ ترجمہ شایع کرایا ہے اس میں سے ذیل کا روح افروز اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

انسانی تاریخ انسان کے اس سفر کی داستان ہے جسے وہ اپنے نفس لافانی یعنی روح کے عرفان کی تلاش میں طے کر رہا ہے۔ سلطنتیں بنتی اور بگڑتی ہیں سیم وزر کے عظیم الہیبتہ انبار لگائے جاتے ہیں اور پھر بیدردی سے خاک میں ملائے جاتے ہیں۔ انسانی خواہشات وتصورات کی تشکیل کیلئے بڑی بڑی یادگاریں قائم کیجاتی ہیں اور پھر اس طرح ضایع کردیجاتی ہیں جس طرح بچہ بڑا ہونے پر اپنے کھلونے کو توڑ پھوڑ دیتا ہے جادو کی کنجیاں ڈھالی جاتی ہیں تاکہ اسرار فطرۃ کے خزینۂ سربستہ کا قفل کھولا جائے پھر انسان ازمنۂ ماضیہ کی تمام محنت کو ملیامیٹ کرکے دوبارہ اپنی کارگاہ میں آبیٹھتا ہے تاکہ کسی اور صورت میں آغاز عمل کرے۔ غرض اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ اپنی روح کے عرفان کی تکمیل کی طرف بڑھا چلا جاتا ہے وہ اس روح کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے جو ان تمام اشیاء سے افضل ہے جنکو انسان جمع کرتا ہے ان تمام کارناموں سے ارفع ہے جس پر اسے ناز ہے اور ان تمام فلسفیانہ دعادی سے بہتر ہے جنہیں وہ قائم کرتا ہے اور جس کی پیشگی کا راستہ فنا ونیستی سے مسدود نہیں ہوسکتا۔

(مخزن)

مسلمان اور علم ہیأۃ۔ ہمعصر عبرت جو تاریخی دلچسپیوں کا البم بنکر نجیب آباد سے شایع ہونا شروع ہوا ہے اسکے پہلے نمبر میں اڈیٹر صاحب "مسلمان اور علم ہیأۃ" کے عنوان کے ذیل میں فرماتے ہیں سنہ ۹۰۹ء میں بغداد کا عرض البلد

۳۳ درجہ ۲۰ دقیقہ موسی ابن شاکر کے بیٹوں نے ٹھیرایا ہے جس میں اور حال کی تحقیق میں صرف دس ثانیہ کا فرق ہے ابوالوفا نے جو ۹۹۸ء میں فوت ہوا بطلیموس کی بیان کی ہوئی حرکت قمر کو ناکامل اور خلاف واقعہ پایا اس نے معلوم کیا کہ علاوہ ان دو اختلافوں کے جو قمر کی حرکت میں اسکے دائرہ کے بیضاوی ہونے اور آفتاب کی کشش کے سبب سے واقع ہوتے ہیں اک تیسرا اختلاف حرکت بھی ہے جو آفتاب کے فاصلہ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ یہی تحقیق چھ سو برس بعد ٹائگو براہے کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

(عبرت)

انگریزی فسانہ نگاری۔ معاصر زمانہ کانپور میں "انگریزی فسانہ نگاری" کے عنوان سے مولانا حامد الدین خانصاحب رفیق ایک مفید مضمون تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "سب سے زیادہ ضروری چیز فسانہ نگار کیلئے یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے ذہن میں قصہ کے اصلی مقصد کو قائم کرلے اور اس بات کا پورے طور سے اندازہ کرلے کہ وہ ناظرین کے دل پر کیا اثر پیدا کرنا چاہتا ہے، پھر اسی کے مطابق پلاٹ۔ سین۔ کیریکٹرز اور الفاظ و محاورات کا استعمال کرے + قصہ کے مقصد پر ایسی زبردست گرفت ہونی چاہیئے کہ یہ کسی وقت بھی ہاتھ سے نہ چھوٹ سکے غیر ضروری و بے ربط چیزوں کو قصہ میں ہرگز داخل نہ کیا جائے۔ ناول میں بیشک یہ خامیاں نظر انداز کی جاسکتی ہیں اور ممکن ہے کہ انکی وجہ سے اسکی خوبی میں کوئی فرق نہ آئے، لیکن قصہ کی تمام خوبی ایسے اسقام کے نہ ہونے ہی پر منحصر ہے۔

فسانہ کا طرز تحریر اور اسکا پلاٹ ایسا ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والے کا دماغ شروع سے آخر تک اک خاص اثر سے متاثر ہوتا رہے اور اس کی توجہ مرکزِ اصلی سے ہٹنے نہ پائے۔

(زمانہ)

اسلام اور وفائے عہد۔ ہمعصر علی گڈھ منتھلی کے تازہ نمبر میں مولانا اسلم جیراجپوری نے اس عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں "عہد کی اس قدر حرمت ہے کہ اہلِ معاہدہ کے یہاں جاکر اگر جانی دشمن بھی پناہ لے تو مسلمان اسکو نہ پکڑ سکتے ہیں نہ قتل کرسکتے ہیں اللہ تعالے نے معاہدہ کو جس قدر محترم رکھا ہے اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ قرآن میں مسلمانوں کے قتل کا جو کفارہ مقرر کیا ہے وہی اس کافر کا بھی کفارہ ہے جو اس قوم کا ہو جس سے عہد نامہ ہوچکا ہے" حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جب نصارائے عرب نے دومتہ الجندل میں مقابلہ کیا اور خالد بن ولید اور عیاض ابن غنم اشعری نے پہنچکر انکا محاصرہ کیا تو وہ مغلوب ہوگئے اور سوائے بنی کلب کے سب کے سب قتل کردیئے گئے بنی کلب کے بچنے کی یہ وجہ ہوئی کہ

وہ بنی تمیم کے حلیف تھے اسلامی فوج میں ایک سپاہی عاصمؓ بن عمرو تمیمی تھے انہوں نے اس سارے قبیلے کو امان دیدی"
(علیگڑھ منتھلی)

شاہانِ اسلام اور تعلیمی نظامات۔ ہمیں مسرت ہے کہ الناظر لکھنو بزم اُردو میں پھر جلوہ گر ہُوا ہے خدا نظر بد سے بچائے اسکے تازہ نمبر میں منشی سید وزارت علی صاحب مذکورہ بالا عنوان سے ایک مختصر مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ممالک اسلامیہ میں ترویج تعلیم کیلئے باقاعدہ کوشش ۱۴۳ھ سے شروع ہُوئی اور آغازِ اسلام کی پہلی اور دوسری صدیوں ہی کے اندر مایۂ ناز فلاسفہ۔ فقہا، اور علما اس میں نظر آنے لگے تیرھویں[1] صدی سے اُنیسویں صدی تک تعلیم کا یہ حال تھا کہ جماعتیں صومعوں کے احاطوں، نج کی عمارتوں یا مسجدوں کے صحنوں میں پڑھا کرتی تھیں ماموں رشید کے زمانہ میں بغداد، بصرہ، کوفہ اور بخارا میں بڑی بڑی تعلیمگاہیں قائم کیگئی تھیں ماموں نے اپنے زمانۂ ولیعہدی میں خراسان میں بھی ایک عظیم الشان کالج کی بنیاد ڈالی تھی جسکا پرنسپل ایک عیسائی تھا اس سے اُس زمانہ کے خلفاء کی منصفانہ پالیسی کا اظہار ہوتا ہے کہ کس طرح وہ ایسی ایسی ذمہ داریوں کی اسامیوں پر غیر مذاہب کے لوگوں کا تقرر کرتے تھے۔"
(الناظر)

کمالِ حسن۔ جناب محمد یسین صاحب تسکین قریشی کے مضمون "کمالِ حسن" مندرجہ ہمعصر شباب اُردو لاہور میں سے چند سطریں ہدیۂ ناظرین کیجاتی ہیں۔

"میں نے سحرِ متبسم کا جمال جہاں آرا دیکھا۔ جی میں آیا کہ اسکے مستانہ انداز دل میں رکھ لوں لیکن سُورج نکل آیا اور افسوس میری تمنا خون ہو کر اُس سُرخی میں جھلکنے لگی جو افق آسمان پر اپنی نیرنگیاں دکھا رہی تھی یعنی — شفق!!

میں نے آفتاب درخشاں کا خیرہ کن نظارہ کیا، آرزو تھی کہ اسکی شعاعوں کے زریں تار اپنے دامن میں بھر لوں۔ مگر صد حیف!! اُس تیرگی نے پردہ ڈالدیا جو دن کے اختتام پر جلوہ طراز ہوتی ہے — یعنی شام!!
(تاجور)
(شباب اردو)

مکتوبِ ٹیگور۔ نومبر کے "ماڈرن ریویو" میں ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کے چند بیرونی خطوط شائع ہُوئے ہیں۔ ایک خط میں جو انہوں نے (بتاریخ ۲۰ راگست ۱۹۲۰ء) پیرس سے لکھا ہے وہ حسب ذیل خیالات کا اظہار کرتے ہیں:-

آجکل ہم ایک دلفریب ملک میں ہیں۔ کتنا دلکش ہے یہ مقام اور کتنے سچے انسان ہیں یہاں کے باشندے + میں خوب محسوس کرتا ہوں کہ انسانی زندگی کا انتہائی مقصد عالمِ حیات میں انسان کی زندگی ہے جہاں اُسے

---

[1] غالباً کاتب نے یہاں کچھ غلطی کی ہے کیونکہ تیرھویں صدی سے اگر ہجری مراد ہے تو یہ کل کی بات ہے اور عیسوی مراد ہے تو انیسویں صدی عیسوی کو کل اکیس برس گذرے ہیں + تاجور

خس و خاشاک کی کششِ ثقل سے رہائی ملتی ہے اور جہاں وہ جان لیتا ہے کہ وہ دراصل اک روح ہے۔ ہندوستان میں ہم ذاتی فوائد کے تنگ قفس میں رہتے ہیں اور ہمیں یقین نہیں آتا کہ ہم پر رکھتے ہیں کیونکہ ہم اپنا آسمان کھو چکے ہیں۔ ہم اپنے محدود مواقع کے چھوٹے سے دائرے میں خرافات بکتے ہیں اور ایک دوسرے کو ٹھونگیں مارتے ہیں جہاں ہماری ذمہ داری اتنی تھوڑی بلکہ برائے نام ہو۔ جہاں ہماری ساری زندگی ایک نہایت محدود و تنگ مقام میں آباد ہو۔ وہاں عظمتِ نفس اور قوّتِ سیرت کا حاصل کرنا کس قدر دشوار ہے۔ ہماری زندگی کا مسئلہ غایت درجہ کی صعوبتوں سے دوچار ہے اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنے مرز بوم کے نامساعد حالات کے باوجود روح کو کس طرح قیود سے آزاد کیا جائے۔ اور قضا و قدر کی مسلسل اہانت کو کس طرح پس پشت ڈالدیا جائے تاکہ انسان اپنے صحیح مقدر کو ہمیشہ پیش نظر رکھ سکے ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ہماری زندگی پر حقیقت کی روشنی نہیں پڑتی۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارا نفس پُر عظمت ہے اور اس طرح جیتے ہیں گویا ہماری روح ہمیشہ کے لئے مردود ہوگئی!

(ماڈرن ریویو)

مغلیہ حکومت۔ حال میں الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے ہندی تاریخ کا ایک رسالہ جرنل آف انڈین ہسٹری انگریزی زبان میں ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف جو یونیورسٹی میں تاریخ حاضرہ کے پروفیسر ہیں انگلستان میں تاریخی تحقیقات میں بہت ناموری حاصل کر چکے ہیں۔ لندن کا اخبار ٹائمز رقمطراز ہے کہ "انہوں نے ایسا تاریخی مواد جمع کیا ہے جو اٹھارھویں صدی کی انگریزی تعلیم کا مفہوم سمجھنے کے لئے تاریخ میں ایک گرانقدر اضافہ کرتا ہے۔ انکی طرزِ تصنیف اس امر کی طرف رہبری کرتی ہے کہ تاریخ تعلیم کا کس طرح مطالعہ کرنا اور اُسے کیونکر قلمبند کرنا چاہیئے" یہ ایک چہار ماہی رسالہ ہوگا جسکا حجم تقریباً ۱۹۰ صفحات ہے۔ شیر شاہ کی حکومت سلطنتِ خلجی کا عروج اٹھارھویں صدی کی تاریخ ہندوستان کیلئے برطانوی ماخذ۔ کمپنی کی جنگ اورنگ زیب کے ساتھ ان سب پر نہایت دلچسپ پیرائے میں روشنی ڈال کر مستند معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ ہمیں شک نہیں کہ یہ رسالہ علمی حلقوں میں مقبولِ عام ہوگا۔ اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ اسکے ذریعے سے ہندوستان کی تاریخ حاضرہ کے بعض بحث طلب امور پر غیر جانب داری کے ساتھ غور و خوض کیا جائیگا۔

جناب بینی پرشاد صاحب۔ مغلیہ حکومت کے موضوع پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ خاندانِ مغلیہ یا مغلیہ حکومت کے الفاظ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مغلوں کی ایک جماعت تھی۔ اس لحاظ سے یہ الفاظ قطعی غلط ہیں۔ اور چغتائی یا ترک اگرچہ زیادہ مناسب نام ہیں لیکن ان سے بھی وہی بات پیدا ہے۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ سترھویں صدی کے ہندوستان میں کوئی خاص حکمران جماعت نہ تھی۔ کوئی ایک جماعت ایسی نہ تھی جسکے ساتھ بادشاہِ وقت کا خاص تعلق تھا یا جسکی اعانت کے بل پر وہ اپنے اختیارات رکھتا تھا۔ معاصرین لفظِ مُغل کے مختلف معنی بتلاتے تھے۔ سالبانک جو جہانگیر کے عہدِ سلطنت میں انگریزی کمپنی کا ایک ملازم تھا کہتا ہے کہ یہ" نام ایرانیوں ترکوں اور تاتاریوں پر حاوی ہوتا ہے۔ بلکہ لوگ اکثر عیسائیوں کو بھی مغل ہی پکارتے ہیں" وہ اور سر طامس رو دونوں کہتے ہیں کہ اس لفظ کے معنی "مختون" کے ہیں جس سے غالباً انکی مراد یہ ہے کہ اسکا اطلاق تمام مسلمانوں پر کیا جاتا ہے۔ برنیر کہتا ہے کہ "مغل کہلانیکے لئے کافی تھا کہ کسی کا سفید رنگ ہو اور وہ اسلام کا پیرو ہو"۔

بُولیل گوص اور جان فرائیر اسکے معنی سفید بتاتے ہیں۔ مغلوں کی اُن فوجوں سے جو تیرھویں اور چودھویں صدی میں ملک کے شمالی مغربی حدود کے پرے گشت کرتی تھیں لوگ لفظ مُغل کا مفہوم جان چکے تھے۔ اُنکے بعد جو لوگ ۱۵۲۶ء میں بابر کے ساتھ آئے انہیں عام طور پر مغل کہا گیا۔ خود بابر نیم چغتائی تھا اور نیم مغل ہمایوں کی ماں چغتائی تھی اور اکبر نیم ایرانی تھا جہانگیر نیم راجپوت تھا اور شاہجہان میں راجپوتوں کا خون زیادہ تھا ترکوں کا کم۔ مغلوں کے امرا اور عہدہ دار مختلف قوموں سے تھے اور اُن میں کسی ایک قوم کا زیادہ حصہ نہ تھا ترک، تاتار، ایرانی، افغان، ہندی مسلمان اور تمام ذاتوں کے ہندو اُن میں شامل تھے۔

(جرنل آف انڈین ہسٹری نومبر ۱۹۲۱ء)

نامۂ اکبر

لسان العصر مولانا اکبر مرحوم الہ آبادی نے میری درخواست پر رسالہ کیلئے اپنا غیر مطبوعہ کلام عنایت فرمایا تھا کلام کے ساتھ جو نامۂ محبت افروز صادر ہوا وہ غالباً اکبر کے خامۂ حقیقت نگار کی آخری تراوش تھی ذیل میں تبرکاً اُس صحیفۂ مکرمت کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

۲۳ جولائی ۱۹۲۱ء تاجور

برادرم عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ! آپکا کارڈ اتفاقاً نظر آگیا۔ خدا جانے کون کس وقت نوٹ بک میں رکھ گیا تھا میں دوران سر وغیرہ کے سبب سے بسا اوقات بے خبر رہتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ بڑی خوشی اس اطلاع سے ہوئی کہ آپ نماز پنجگانہ کے پابند ہیں۔ الحمد للہ عمر اور آلام و امراض اور رنگ دنیا نے مجھکو بالکل افسردہ کر دیا ہے۔ تمنائے شہرت و داد سخن باقی نہیں۔

اک زمانے میں یہ خواہش تھی کہ جانیں ہمکو لوگ
اب یہ رونا ہے کہ ہم کیوں اس قدر جانے گئے؟

غور و انتخاب ترتیب سے معذور ہو گیا ہوں۔ بہ تعمیل ارشاد کچھ اشعار متفرق پیش کرتا ہوں تیسرا حصہ پریس میں ہے شاید اگست میں شائع ہو جائے اسکو ملاحظہ فرمائیگا۔ میری نا تندرستی روز افزوں ہے خدا آپکو فروغ دے، ناموری عطا کرے، فائدہ پہنچائے، میرے لئے دعائے خیر کیجئے اللہ تعالیٰ نزع کو آسان کرے۔ ۳۱ کو خواجہ حسن نظامی صاحب آنے والے ہیں۔ اسوقت مصنف فلسفہ جذبات مہمان ہیں۔ زندہ رہا حواس درست رہے تو پھر بھی مراسلت ہو گی۔

خاکسار اکبر

حِصّۂ نظم

کلامِ اکبرؔ

پہلی قسط

جتنا زمانہ حشر کے پہلے ہے سب ہے آج ... کہتا ہوں کل میں صرف قیامت کے روز کو
پروا نہیں ہے آج کی۔ ہے کل کی مجھ کو فکر ... کیا پوچھتے ہیں آپ میرے ساز و سوز کو

تری تسبیح تو اتنی سرِ محفل چمکے ... حیف کی جا ہے نہ سینے میں اگر دل چمکے
خونِ بسمل ہی کا رنگ اپنی دکھائیگا بہار ... خیر دم بھر کے لئے خنجرِ قاتل چمکے

بُلبل اور صیّاد

قفس میں بُلبلِ نالاں کی جب بیتابیاں دیکھیں ... تو از راہِ عنایت ایک دن صیّاد یہ بولا
یہ بیتابی تری۔ اے مُشتِ پر! ہے سخت نادانی ... یہ راحت ہے سراسر جس کو تُو نے قید ہے سمجھا
وہ تیرا آشیانہ جس کو تُو دن رات روتی ہے ... وہ آخر کیا تھا؟ اک تنکوں کا بے ڈھنگا سا ڈھوڈا تھا
قفس کو دیکھ! کاریگر نے کیا اچھا بنایا ہے! ... تناسب کا نمونہ۔ خوبصورت۔ خوشنما۔ سُتھرا
عبث اُس وحشیانہ زندگی کو یاد کرتی ہے ... نہیں افسوس تجھ پر کچھ اثر عہدِ ترقی کا
کبھی صرصر کے حملے تھے۔ کبھی تھے برق کے دھاوے ... وہ تیرا آشیانہ آفتوں کا اک نشانہ تھا
محافظ کون تیری جان کا تھا صحنِ گُلشن میں ... کوئی طیرِ شکاری تجھ کو چُپکے سے جھپٹ لیتا
قفس کیا ہے حِصارِ عافیت ہے تُو اگر سمجھے ... نہ اندر سے کوئی ڈر ہے نہ باہر سے کوئی کھٹکا
ہوا اور روشنی اور دانہ پانی سب میسّر ہے ... مزے سے چہچہا اور حمدِ خالق کے ترانے گا

یہ فریاد و فغان و آہ ناشکروں کی باتیں ہیں
اری ناداں! تجھے ممنون ہونا چاہیئے میرا

نوٹ:- معاصرین نقل کریں تو منقول عنہا کا حوالہ ضرور دیں۔

کہا بُلبل نے اے صیّادِ مشفق! سچ کہا تُو نے | تری رافت میں کیا شک ہے تری شفقت کا کیا کہنا
مگر حُبِ وطن اور ذوقِ آزادی عجب شے ہے | چمن کی یاد دل سے جا نہیں سکتی کبھی اصلا
پرائے دل کا دُکھ اے مہرباں ایسا ہی ہوتا ہے | کسی کو کیا خبر ہے دوسرے پر کیا قلق گذرا

حقیقت میری بیتابی کی تجھ پر تب عیاں ہوتی
کہ میں صیّاد ہوتی۔ تُو گرفتارِ قفس ہوتا (نیرنگ)

خدا ایک وحدۃ الوجودی کی نظر میں

دُنیائے ہست و بود میں روحِ رواں ہے تو | شیرازہ بندِ کشورِ کون و مکاں ہے تو
ہر دل میں جس کا درد ہے وہ جانِ جاں ہے تو | ہر دو جہاں میں زینتِ ہر دو جہاں ہے تو

پتھر ہے دل نہیں ہے اگر دل میں تو نہیں
وہ پھُول کیا کہ جس میں ترا رنگ و بو نہیں

ہے وحدۃ الوجودئ دیدانتی نژاد | خاکِ رہِ تلاش مگر پھر بھی بے مراد
اتنا ہے تیری یاد میں مخمورِ کیفِ یاد | کرتا ہے اس فریبِ تخیّل سے دل کو شاد

ہستی کے پھُول پھُول میں تیرا ہے رنگ و بو
تحت الثریٰ سے تا بہ ثریّا ہے تُو ہی تُو

پہلوئے اہلِ غم میں دلِ خانماں خراب | فرقت میں یادِ دوست کی تصویرِ بے نقاب
سینے میں شورِ عشق۔ مقدر میں پیچ و تاب | آنکھوں میں اشک لب پہ فغاں دل میں اضطراب

آتش بیاں ہے ذکر سے تیرے زبانِ عشق
ہنگامہ زار ہے ترے دم سے جہانِ عشق

رخسارِ جاں نواز میں شادابئ گلاب | روئے نظر فروز میں رعنائی شباب
گیسو میں پیچ نرگسِ جادو میں کیفِ خواب | صورت میں حسن حسنِ فروزاں میں آب و تاب

محشر خرامئ بتِ سروِ چمن ہے تو
روئے حسین پہ زلفِ شکن در شکن ہے تو

وقفِ تلاش بُت میں ہے ہندوئے پاکباز　　مسلم کے واسطے ہے تو ہی قبلۂ نماز
ہے پارسی کا آگ کے پردے میں کارساز　　تو کیا ہے اے خدا، نہ کھُلا آجتک یہ راز

گردش میں آسمان ہے چکرّ میں آفتاب
تیری تلاش میں ہیں ترے خانماں خراب

وابستہ تجھ سے عالمِ سفلی کا انتظام　　ہے تو ہی صدرِ محفلِ چرخِ کبود فام
ازشرق تا بہ غرب ترا ذکر لاکلام　　پُر تیری داستاں سے ہیں اوراقِ صبح وشام

معمور بزمِ کون ومکاں تیرے نُور سے
ہستی کا کُل ظہور ہے تیرے ظہور سے

جب مرگِ بیکسی میں نہ ہو کوئی آس پاس　　جب دل کے غمکدہ پہ ہو طاری سکوتِ یاس
جب سانس اُکھڑ چکا ہو جب آئے دوا نہ راس　　جب چھوڑ دی ہو جینے کی بیمارِ غم نے آس

اُٹھتا ہے اُس کے دل میں ترا دردِ جستجو
اِس حال میں بھی اُس کی زباں پر ہے تُو ہی تُو

تاجور

جذباتِ عالیہ

گرامی

حرفیست خوش زحمدِ خدا بر زبانِ ما　　گردد بگردِ خویش زباں در دہانِ ما
بود و نبودِ ما ہمہ ہیچ ست اے حکیم　　یعنی بشاخِ نسلہ بود آشیانِ ما
مارا زخاک ہیم و اُمید آفریدہ اند　　عمریست در کشاکشِ مرگ ست جانِ ما
نخلے کہ در زمینِ تمنا نشاندہ ایم　　می پرورد بآبِ تبر باغبانِ ما
ہر لالہ میدہد خبر از خونِ کوہکن　　ہر ذرہ کیقباد بود در جہانِ ما
در مرگ رازِ زندگیٔ ما نہفتہ اند　　ناگفتنی ست قصۂ ما داستانِ ما
زد راہ ما تصرفِ عقلِ بہانہ سنج　　آخر شدست رہزنِ ما پاسبانِ ما
ما خانہ زادِ عقل چہ مجبور بودہ ایم　　.. جبر اختیارِ ماست زمین آسمانِ ما

برسرِ کلیم صبحِ قیامت زخوابِ مرگ فریاد از درازیِ خوابِ گرانِ ما
اے شیخ اے گرامیِ ما اے اسیرِ خویش از ما مپرس قصۂ دردِ نہانِ ما

خونابِ درد از سخنِ ما فرو چکد
گویا بود زبانِ گرامی زبانِ ما

طبا طبائی

نفس کو شہرِ خاموشاں کا ہم نے رہ گرا پایا رہِ بے نقشِ پائے کاروانِ بے درا پایا
نہ اب پست و بلندِ دہر کو مڑ کر بھی دیکھوں گا بہت گر پڑ کے ہیں نے جادۂ صبر و رضا پایا
خدا گر ہمتِ عالی بھی دے اور خاکساری بھی سمجھنا چاہیئے سب حاصلِ ارض و سما پایا
بھروسا زیست پر کچھ ہے نہ ایامِ جوانی پر شرارِ سنگ اُسے دیکھا اِسے رنگِ حنا پایا
جسے ہو دید کی حسرت سنبھلنا اُس کا مشکل ہے کلیم اللہ نے بھی شل نرگس کے عصا پایا
گدائی کا ملا تھا ٹھیکرا جو درسے ساقی کے اُسی کو بزمِ جم میں ساغرِ گیتی نما پایا
نہ سمجھے آبلہ پائی کو میری قافلہ والے نمک افشاں کوئی پایا بھی تو شورِ درا پایا
تعلق ایک نعمت کو ہزاروں نعمتوں سے ہے تری درگاہ سے جتنا ملا اُس سے سوا پایا
تعلق ایک حسرت کو ہزاروں حسرتوں سے ہے دلِ بے آرزو پایا تو سمجھو مدعا پایا

زمینِ شعر پر اے نظم ہم بھی شب کو گذرے تھے
اُٹھا لائے ہیں دامن ہیں اُسے جو کچھ پڑا پایا

شوق قدوائی

دیکھے نہ دیکھے شکل وہ۔ سلسلۂ خبر تو ہے گریۂ با اثر نہ ہو نالۂ بے اثر تو ہے
ڈر۔ رہے مانعِ سخن۔ شکل ہے خود ہی دردِ عشق ہوں لبِ شکوہ سنج چپ۔ سامنے چشمِ تر تو ہے
تنگ ہوں اپنے گھر سے ہیں کاش تمہارے گھر رہوں کچھ نہ ہو اور فائدہ۔ شب کی یہاں سحر تو ہے
فخر کی بات ہے کہ ہوں قابلِ التفات ہیں چشمِ عتاب ہی سہی۔ میری طرف نظر تو ہے
سر کو پٹک کے اُسکے گھر پھرنے دے گر پھرا دماغ خوش ہو کہ حاصل اے جنوں لذتِ دردِ سر تو ہے
کس کا جواب اے خدا۔ تیرے سپرد ہے غریب اور قصور ہو نہ ہو میرا پیامبر تو ہے

چشمِ اُمید اب تو ہے وعدۂ سیرِ نزع سے — ملنے کا وقت کم سہی مرگ سے پیشتر تو ہے

رحم کے بدلے یہ ستم عاشقِ دلِ شکستہ پر
شوق کا نام اگر ہے بد۔ ہونے بھی دو بشر تو ہے

محروم

ابھی تک نیم بسمل او جفائے آسماں! ہوں میں — کمی کچھ بُرشِ خنجر میں ہے یا سخت جاں ہوں میں
جہاں میں یادگارِ زندۂ سوزِ نہاں ہوں میں — میں اپنا آپ خاکستر ہوں اے ہمدم! کہاں ہوں میں
نہ میں شمعِ شبستاں ہوں، نہ میں دلسوزِ پروانہ — الٰہی! کس لئے پھر سر بسر آتش بجاں ہوں میں
گرائیں بجلیاں تونے مرے نخلِ تمنا پر — جلاؤ نگا تجھے آہوں سے، وہ اے آسماں ہوں میں
سرِ راہِ فنا اُٹھ اُٹھ کے اکثر بیٹھ جاتا ہوں — جو ہو بیگانۂ منزل وہ گردِ کارواں ہوں میں
ملی بحرِ فنا میں کیا مجھے گرداب کی قسمت — کہ جب تک ہوں، رہینِ اضطرابِ جاوداں ہوں میں

مسرت نام ہے کس چیز کا۔ محروم کیا جانوں
جہاں ماتمکدہ ہے اور مصروفِ فغاں ہوں میں

یاس

ہجومِ یاس سے یہ دل کا حال ہوتا ہے — شہید جیسے کوئی پائمال ہوتا ہے
خریبِ نفس کا جب اِحتمال ہوتا ہے — تو فرقِ عشق و ہوس بھی محال ہوتا ہے
یہ عیب ہے کہ مٹائے سے مٹ نہیں سکتا — وہ حُسن ہے جو سریع الزّوال ہوتا ہے
خدا میں شک ہے تو ہو موت میں نہیں کوئی شک — مشاہدہ میں کہیں اِحتمال ہوتا ہے؟
بقدرِ حوصلہ ملتی ہے دادِ عشق و ہوس — مزاجِ حُسن میں کیا اِعتدال ہوتا ہے
زُلال و دُرد ہیں دونوں دوائے دردِ خمار — بس ایک گھونٹ میں چہرہ بحال ہوتا ہے
خراب ہو چلی زندانِ آب و گِل کی ہوا — اب ایک سانس بھی لینا محال ہوتا ہے
کتابِ عمر ہے گویا انیسِ تنہائی — نظر میں قصۂ ماضی و حال ہوتا ہے
نئی زمین نیا آسماں نئی دُنیا — عجیب شئے یہ طلسمِ خیال ہوتا ہے
قفس میں ذکرِ نشیمن گناہِ بے لذت — نہ ہمزباں نہ کوئی ہمخیال ہوتا ہے

بہارِ عمرِ گزشتہ پہ بھیجئے صلوات — خزاں میں ذکرِ خزاں حسبِ حال ہوتا ہے
اُمید و بیم کا کوسوں پتا نہیں ملتا — خراب جب یہ طلسمِ خیال ہوتا ہے
بھڑکتی جاتی ہے شوقِ فنا میں شمع کی لَو — نسیمِ صبح سے اور اشتعال ہوتا ہے
خزاں کی ضد پہ یہ باندھی ہے باغباں نے کمر — چمن کو آگ لگا کر نہال ہوتا ہے

نگاہِ یاس سے اوجھل ہے کاروانِ عدم
جرس کے شور سے دِل پائمال ہوتا ہے

عزیز

ترے فراق سے مری ہستی تباہ ہے — میرا وجود میرے لئے اِک گناہ ہے
ہے سب کا اتفاق مری موت پر مگر — جو ضبط آشنا ہیں اُنہیں اشتباہ ہے
ہے بس حقیقتِ دلِ زخمی اسی قدر — گلدستۂ بہار فریبِ نگاہ ہے
دُنیا کو جانتا ہوں میں اک فردِ معصیت — جب ہر وجود اس میں سراپا گناہ ہے
آساں نہیں ہے بُتکدۂ دہر سے عبُور — ہر ایک گام پر کوئی بت سنگِ راہ ہے
گنجائش ایک تل میں کہاں تیرے حسن کی — نظارۂ جمال سے قاصر نگاہ ہے
نقشِ قدم کسی کا دکھادوں ذرا تجھے — دیکھ اے غریب دل یہ تری قتل گاہ ہے
کہتے ہیں آکے لاش پر اچھا بتائینگے — مرنا بھی ان کے عہد میں گویا گناہ ہے
یہ مُنہ چھپائے جاتے ہیں جو سُوئے میکدہ — مجھ سے بھی اِن جناب سے کچھ رسم و راہ ہے
نالوں سے میرے ہوگا وہی کچھ اثر پذیر — جو آشنائے زمزمۂ خانقاہ ہے

قبرِ عزیز دیکھ کے کہتے ہیں اہلِ دل
یہ تو کسی شہید کی آرامگاہ ہے

نذرِ گلچیں

جمنا

دھیمی دھیمی بہنے والی ایک نہرِ دل نشین
آب جو چھوٹی سی اِک نازک خرام و نازنین

تشنگیٔ شوقِ گنگا میں بجھانے کے لئے
جا رہی ہے اپنی ہستی کو مٹانے کے لئے

یہ وہ جمنا ہے جہاں اِک بانوئے پردہ نشین
آگرہ میں محوِ آسائش ہے جو زیرِ زمیں

رُخ سے آہستہ اُلٹ کر چادرِ آبِ رواں
دیکھتی تھی مُسکرا کر منظرِ آبِ رواں

آہ! اے نہرِ لطافت! آہ! اے بحرِ جمال!
دل میں ہے پہلو نشیں اب تک ترا نقشِ خیال

گرچہ تجھ میں اب نہیں وہ جلوۂ شانِ کہن
وہ حسین تُو ہے کہ اے شمعِ شبستانِ کہن!

حُسنِ رفتہ میں ہے تیرے اب بھی اِک دلکش ادا
تیرے کُمہلائے ہُوئے پھولوں میں ہے بوئے وفا

بشیر احمد زار — (سرور جہاں آبادی)

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گذر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے (غالب)

دلِ بے مدعا خدا نے دیا
اب کسی شے کی احتیاج نہیں

جہاں تیرے جلوے سے معمور نکلا
پڑی آنکھ جس کوہ پر طور نکلا (داغ)

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا (چکبست)

عالمِ یاس میں بیٹھا ہوں جھکائے ہُوئے سر
جس طرف کیجئے رخ ہو کوئی تمنا بھی تو ہو (اکبر)

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بیخطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی۔

(تاجور) (اقبال)

قواعد

۱۔ ہمایوں بالعموم ہر ماہ کے نصفِ اوّل میں شائع ہوا کرے گا۔

۲۔ علمی و ادبی تمدنی و تاریخی اخلاقی و روحانی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب میں پورے اتریں درجِ رسالہ کیئے جائیں گے۔

۳۔ ناپسندیدہ مضمون ۱؎ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جائیگا۔

۴۔ سالانہ قیمت پانچ روپے پیشگی ہے ششماہی تین روپے نمونے کا پرچہ ۸؍ (علاوہ محصول ڈاک وی پی) طلبا سے اُن کے پروفیسر یا معلم کی تصدیق پر للعہ سالانہ ۔عہ ششماہی۔

۵۔ جو صاحب پانچ خریدار عنائیت فرمائینگے اُنہیں رسالہ چھ ماہ کے لیئے مفت بھیجا جائیگا۔

۶۔ جواب طلب خطوط کے لیئے ۱؎ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۷۔ کوئی ایسا اشتہار نہ لیا جائیگا جو خلافِ تہذیب ہو۔

۸۔ ایسے متر جم یا طبع زاد مضامین کے لیئے جو پُر معلومات ہوں اور محنت و کاوش سے لکھے جائیں صاحبِ مضمون کی فرمایش پر بالعموم عہ فی مطبوعہ صفحہ معاوضہ دیا جائیگا۔

مینجر رسالہ ہمایوں۔ لاہور

... لالہ دیوان چند مالک مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوایا

جملہ حقوق محفوظ
۸۶

زمامِ اہلقِ ایام در دستِ ہمایوں شد
نوید دورِ خوش کامی انیسِ طبعِ موزوں شد

بیادگار علامۂ فضیلۂ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ماہ فروری سنہ ۱۹۲۲ء

ہمایوں

مرتبۂ

میاں بشیر احمد۔ بی۔ اے۔ (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء ایڈیٹر

مولانا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق مینجر رسالۂ ہمایوں نے
مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

*

جہاں نما

حبشیوں کی بیداری۔ اجتماعی ترقی کے اِس محشر خیز زمانے میں جہاں مشرق و مغرب کی قومیں اپنے اپنے خواب سے بیدار ہو رہی ہیں ناممکن تھا کہ حبشیوں کی کالی کلوٹی نسل محکومیت کی تاریکیوں سے نکل کر آنکھیں ملتی ہوئی تہذیب یافتہ لوگوں کے زُمرے میں نہ آملتی ۔ مغربی تہذیب کا قُرب اِن لوگوں کے لئے مُحرّکِ اتحاد ثابت ہو رہا ہے۔ وہ اپنی نسل کے لئے ایک بہت زیادہ شاندار مستقبل دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ اُن کی ذکاوت نمایاں طور پر ظاہر ہو رہی ہے اور وہ انسانی شخصیت کے حقوق حاصل کرنے کے دعویدار ہیں۔ جنگِ عالمگیر نے جہاں دُور دراز ملکوں میں آزادی کے خیالات پیدا کئے وہاں حبشیوں میں بھی خود مختاری کی تحریک کو زیادہ پُر زور بنا دیا۔ صُلح نامے کے بعد ایک افریقی قومی کانگرس بمقام عکرہ (مغربی افریقہ میں) منعقد ہوئی اور آج مشرقی اور وسط افریقہ میں بھی حرکت کے آثار نظر آتے ہیں۔ حبشی تحریک کا سب سے بڑا مرکز امریکہ ہے۔ یہ حبشی غلاموں کی تجارت کا نتیجہ ہے کہ اِس وقت ممالکِ متحدہ میں ایک کروڑ حبشی آباد ہیں جن کی موجودگی کے باعث "مسئلہ رنگ" نے بہت بھونڈی شکل اختیار کر لی ہے۔

امریکی حبشی تحریکات کے تین بڑے گروہ ہیں۔ حبشی ترقی کی تاریخ میں سب سے بڑی شخصیت بوکر واشنگٹن کی ہے جو غلامی کے درجے سے بڑھتے بڑھتے حبشی تعلیم کی تحریک کا مقتدر سرگروہ بن گیا۔ اُس کا طرزِ عمل جو سفید قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے پُر صلح اصول پر مبنی تھا ہر دلعزیز نہ ہوا اور اُس کے اکثر ہم قوم اُسے حکمرانوں کا پروردہ خوشامدی سمجھنے لگے۔ دوسرے طبقے کا سرکردہ مشہور حبشی شاعر ڈو بوا ہے۔ جس کی تازہ ترین تصنیف قومی منافرت کا ایک صریح اعلان ہے۔ اسی طبقے کے زیر اثر دوسری کُل افریقی کانگرس منتظم ہوئی ہے جس کے تین جلسے یکے بعد دیگرے لندن برسلز اور پیرس میں منعقد ہونے والے ہیں۔ تیسرا طبقہ سنہ ۱۹۲۰ء میں نیو یارک کی کانفرنس میں رونما ہوا۔ انتہا پسندوں کی یہ جماعت جن کا لیڈر مارکس گاروی ہے بڑے شد و مد سے اِس بات کی تلقین کر رہی ہے کہ افریقہ افریقیوں کے لئے ہے اور اُس تاریک براعظم میں جہاں کسی غیر سیاہ آدمی کو مداخلت کا حق حاصل نہیں حبشیوں کو اپنی عظیم الشان قومی سلطنت جلد قائم کرنی چاہیئے۔

۱۹۲۱ء کا بہترین ادیب - مُلکِ سویڈن سے ہر سال دُنیا کے بہترین ادیب کو سوا لاکھ روپیہ کا بیش قیمت ہدیہ دیا جاتا ہے۔ اسے ادب کا نوبل انعام کہتے ہیں کیونکہ اس کا بانی ایک مُخیّر ایلفرڈ نوبل نامی تھا جو ۱۸۹۶ء میں فوت ہُوا اور جس نے اپنی کمائی کا بیشتر حِصّہ پانچ مفید انعامات کے لئے وقف کر دیا جن میں ایک انعام ادب سے متعلق ہے۔ ہمارے سب سے بڑے رُوحانی شاعر ٹیگور نے اسی عطیہ کے ذریعے سے عالمگیر شہرت حاصل کی ۔ ۱۹۲۱ء کا انعام فرانس کے ایک مشہور مُصنّف ژاک آناتول رتیبولٹ کے حِصّے میں آیا ہے جس نے اپنا تصنیفی نام اپنے وطن کی محبت کے جوش میں آناتول فرانس اختیار کیا، وہ ایک کتب فروش کا لڑکا تھا اور اُس کا ادبی مذاق اُن علمی مذاکروں کی آغوش میں پلا جو اُس کے باپ کی دوکان میں ہُوا کرتے تھے۔ اُس کا طرز اُس کی ظرافت اور اُس کی سیرت شناسی لاجواب ہیں اور اُس کی کتابوں کا حقیقی لُطف اُن کے مکالموں میں موجود ہے جہاں وہ اپنی ذکاوت و فراست سے نہ صرف افسانے کے دریا کو کوزے میں بند کر دیتا ہے بلکہ ایک زبردست سیرت کا خاکہ آنکھوں کے سامنے کھینچ کر ہمیں ایک زندہ ہستی سے دوچار کرتا ہے ۔ آناتول کی عُمر اس وقت ۷۷ برس کی ہے!

اُس نے اپنے انعام کا سارا روپیہ رُوس کے قحط زدوں کی امداد کے لئے دے دیا ہے باوجودیکہ رُوس اور فرانس برسرِ پرخاش ہیں ۔ ایسے انعاموں کے مُستحق ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں!

دُم دار آدمی - "ارتقائی" حُکما کہتے تو نہیں مگر یقین رکھتے ہیں کہ بنی آدم فی الحقیقت "بنی قرد" ہیں اور ازمنۂ قبلِ تاریخ میں وہ اپنے جدِ امجد کی طرح دُم رکھتے تھے ۔ حال میں ایک مشہور ماہرِ طبیعات ڈاکٹر ٹُم ہولس نے جو تھوڑی مُدّت ہُوئی بورنیو سے واپس آیا بیان کیا ہے کہ اُس نے وحشی قوموں کے بُہت سے افراد اپنی آنکھوں دیکھے ہیں جن کے اک چھوٹی سی نامکمل دُم تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ظاہرا طور پر یہ لوگ ایک پوری دُم رکھنے والی قوم سے سلسلۂ قرابت رکھتے ہیں ۔ پروفیسر موصوف کو یقین ہے کہ نیوگنی میں دُم دار آدمی موجود ہیں۔ اور اُس کا ارادہ ہے کہ اُس مُلک میں سیر و سیاحت کر کے اس امر کی کماحقہٗ تحقیق کرے ۔ بعض خبروں کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن لوگوں کی دُمیں بارہ سے لے کر اٹھارہ انچ تک لمبی ہوتی ہیں اور اُن کے جسم اپنے لمبے گھنے بالوں سے ڈھکے رہتے ہیں ۔ وہ جنگل کے سب سے گنجان مقامات میں رہتے ہیں اور مٹی کے برتن بنانے اور کپڑا بُننے میں مشّاق ہیں۔ جنگ کے واسطے مہلک زہر تیار کرنے میں بھی وہ یدِطُولےٰ رکھتے ہیں ۔

جنگ اور رقص - زمانۂ آیندہ کے مؤرخین جب جنگِ فرنگ کی کہانی لکھیں گے تو یہ بھی

بیان کریں گے کہ دنیا کی سب سے زیادہ تباہ کن لڑائی کے بعد ہمارے دل اور ا
تاریخ کے صفحات اِس قسم کی مثالوں سے بھرے ہُوئے ہیں جس سے قلبِ انسا
ہے۔ اطالیہ میں ۱۳۷۰ء میں "کالی موت" کے بعد لوگ دیوانہ ہو کر رقص کرتے تھے
کہ دَورانِ جنگ میں سپاہیوں نے جب میدان میں بینڈ باجے کے ساتھ کوچ کرنا ...
قدم ناچ کی حرکتوں کی طرف راغب ہو گئے۔ آج مغربی لندن کا ایک پُر تکلف ہوٹل نہیں جہاں ہر کھانے
کے بعد اور درمیان میں ناچ کا جنون انگیز سلسلہ جاری نہ رہتا ہو۔

ایک حیرت انگیز نابینا لڑکی۔ دُنیا کے زندہ عجائبات میں کم ہستیاں اتنی عجوبہ زا ہوں گی جتنی امریکی شہر جین وِل کے نابیناؤں کے مشہور اسکول کی طالب علم لڑکی ولیٹا ہگنز۔ ولیٹا کی عُمر اِس وقت سولہ برس کی ہے۔ وہ مادر زاد نابینا نہیں بلکہ صرف چند سال ہُوئے اپنی دیکھنے اور سُننے کی قوتیں قطعی طور پر کھو بیٹھی۔ اس تغیر سے پہلے وہ بد مزاج خاموش اور غمگین رہا کرتی تھی لیکن بہری اور اندھی ہونے کے ساتھ ہی اُس کی طبیعت میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہُوئی اور آج اُس کی بات بات سے چالاکی ذکاوت اور خوش طبعی ٹپکتی ہے۔ قدرت کی بعض نعمتوں سے محروم ہو کر اُس کی فطرت اپنی پوری قوت میں نمودار ہُوئی۔ ولیٹا نے دوسرے کے سر پر ہاتھ رکھ کر سُننا اور چیزوں کو سونگھ کر "دیکھ لینا" اور رنگوں کی صحیح صحیح شناخت کرنا شروع کیا۔ ایک روز اسکول کی مہتمم چند دلچسپی لینے والی خواتین کے سامنے اِس "بینا" نابینا کو باغیچے میں لے گئی اور اُسے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف چلنے کو کہا۔ دیکھنے والیاں حیرت زدہ ہو گئیں کہ وہ رستے میں آنے والے درختوں سے صاف بچتی ہُوئی بے دھڑک چلتی گئی۔ ایک خاتون نے اک پھُول توڑ کر اُس کے ناک کے قریب رکھا اور پوچھا یہ کس رنگ کا ہے۔ فوراً جواب ملا "سفید"۔ وہ گانے بجانے کی مشاق اور سینے پرونے میں ماہرِ فن ہے۔ اُس کا لباس اُس کے ہاتھوں کا سِلا ہوتا ہے۔ اس زندہ مثال سے صاف طور پر عیاں ہے کہ ہماری دیکھنے سُننے چھُونے اور سُونگھنے کی قوتیں ایک دوسری کی جگہ کام دے سکتی ہیں اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر فردِ بشر کی خوشی اور ترقی کا بہترین ذریعہ اپنے ہم جنسوں سے کھُلے طور پر آزادانہ تعلقات قائم کرتا ہے۔

بشیر احمد

علمی شعاعیں

سرزمین بوم۔ ہیئت دان ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ ننھی ننھی ہستیاں جو ہمارے تاروں بھرے آسمان کی زیب وزینت ہیں اپنے ظاہرہ ننھے پن کے ساتھ حقیقت میں ایسی ہیبت ناک جسامت رکھتی ہیں کہ اُس کے صحیح صحیح اندازے کا احساس ہی ہماری ذہنی قوت کو فنا کر دینے کے لئے کافی ہے۔ سورج ہم سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلے پر ہے لیکن ارقتورس ایک نامعلوم سا تارہ جو ہمارے نیّرِ اعظم سے دس ہزار گنا بڑا ہے ہم سے اتنی مسافت پر واقع ہے کہ روشنی کی ایک کرن جو وہاں سے ۱۸۶۰۰۰ میل فی ثانیہ کی رفتار سے چلتی ہوئی آج زمین کی طرف سرگرم سفر ہو ہمارے ہاں سنہ ۱۹۴۴ء کے موسمِ بہار میں پہنچے گی۔

دھاتیں بھی تھک جاتی ہیں۔ یہ امر مدت سے دریافت ہو چکا ہے کہ دھاتیں بھی انسان کی طرح مسلسل محنت ومشقت سے مضمحل ہو جاتی ہیں مثلاً دھات کا ایک ٹکڑا جو دیر تک برابر جنبش میں رہے بتدریج اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے لیکن اگر اُسے تھوڑا آرام مل جائے تو وہ از سرِ نو اپنی طاقت حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے انجنیر دھاتوں کی تھکن کا اندازہ لگانا بہت ضروری جانتے ہیں۔ وہ کسی دھات کی سختی یا لچک کا اتنا خیال نہیں کرتے جتنا اس بات کا کہ وہ کس درجہ پر چُور ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ اِس تھکن کا اندازہ کرنے کے جو طریق پہلے رائج تھے اُن میں بڑا نقص یہ تھا کہ آزمائش میں بہت وقت اور نتیجتاً زرِ کثیر صرف ہوتا تھا۔ حال میں ایک آلہ ایجاد ہوا ہے جس سے دھاتوں کی تھکن کا صحیح صحیح اندازہ بجائے ایک دو ہفتے کے چند ہی منٹ میں کر لیا جاتا ہے۔ (ب)

انسانی زندگی کے پچاس برس۔ ایک فرانسیسی ماہرِ اعداد وشمار نے اندازہ کیا ہے کہ پچاس برس کے ایک آدمی کی عمر اوسطاً اِس طرح صرف ہو چکتی ہے:-

سونا	۶۰۰۰ دن	کام کاج	۶۵۰۰ دن
چلنا پھرنا	۸۰۰ دن	سیر تماشہ	۴۰۰۰ دن
کھانا پینا	۱۵۰۰ "	علالت	۵۰۰ دن

وہ دو سو دس من ۔۔۔ کھا چکتا ہے اور پانچ سو چھتیس من مائعات پی چکتا ہے۔

پچاس برس کے ایک غریب ہندوستانی سے پوچھئے کہ اُس کی اوسط کتنی ہے ؟ (دیپ)

موسیقی کے ذریعہ علاج - ڈاکٹروں کی نظر میں موسیقی بہت وقعت حاصل کر رہی ہے بعضوں نے توعصبی امراض کے معالجہ میں موسیقی کو بطورِ دوا استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ موسیو فروسار فرانسیسی نے فونوگراف کے مخصوص طریقہ کے ذریعہ بعض مریضوں کا علاج کیا اور یہ تجربہ بہت کامیاب ثابت ہُوا۔ اس کی رائے میں غنا (گانا) کا اثر تنشیطِ جسم ہی تک محدود نہیں بلکہ اعصاب میں اس کا اثر حیرت انگیز طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ موسیو موصوف نے بہت سے مریضوں کا علاج صرف موسیقی وغنا کے ذریعہ کیا اور وہ بالکل شفایاب ہُوئے۔ اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی امراضِ عصبیہ بیخوابی۔ اختلاج قلب وغیرہ کے لئے بہت مفید ہے ٭

(الہلال (مصر)

۲۴ دسمبر کے ایک لندنی اخبار میں کسی کسان کا یہ قول شائع ہُوا ہے کہ جس روز میری گائیں اتفاقی طور پر کسی ایسی جگہ جا نکلتی ہیں جہاں محفلِ سرود گرم ہو تو شام کو اَور دنوں کی نسبت دودھ زیادہ دیتی ہیں ٭

کیا آفتاب کی حرارت تغیر پذیر ہے؟ علمائے ہیئات کی رائے ہے کہ دو ہزار سال سے اب تک آفتاب کی حرارت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہُوا۔ اسی لئے کرۂ ارض پر حیوانات ونباتات کی پیدائش غیر متغیر نظر آتی ہے لیکن دو ہزار سال سے قبل حرارتِ آفتاب کی مقدار میں عظیم تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے جیالوجی (علم طبقات الارض) کے عظیم انقلابات رونما ہُوئے۔ بعض فلاسفہ کی رائے ہے کہ آفتاب کا حجم تدریجی طور پر کم ہو رہا ہے اور ایک لاکھ برس کے بعد آفتاب کا یہ دہکتا ہُوا کرہ بُجھ جائیگا۔ حتیٰ کہ حرارت کی کمی کی وجہ سے سطحِ زمین سے حیوانات ونباتات یکقلم فنا ہو جائینگے ٭ الہلال (مصر)

اس کے برخلاف یورپ کی مشہور فلسفیہ مادام کوری کا خیال ہے کہ آفتاب کی حرارت کم ہونے کی بجائے ترقی پذیر ہے"

بہر حال آفتاب کی حرارت ترقی پذیر ہو یا تنزل قبول دنیا کا مستقبل خطرہ ہی میں ہے" ٭ (تاجور)

نئے ہوائی جہاز۔ صُلح نامہ ورسائی کی رُو سے جرمنوں کے لئے انجن والے ہوائی جہازوں کا بنانا ممنوع قرار دیا گیا لیکن اُن کی ایجاد کاری اک دوسری شکل میں نمودار ہُوئی۔ حال میں رَون کے علاقے میں ایک پروازی مقابلہ ہُوا جس میں ۴۵ بے انجن اُڑنے والے ہوائی جہازوں نے حصّہ لیا۔ ایک ہوا پرواز تیرہ منٹ ہوا میں اُڑتا رہا اور اتنی دیر میں اُس نے چھ میل کا فاصلہ طے کر لیا ٭

علم الکیمیا۔ حال کے سائنس دان قدیم علمِ کیمیا پر یقین رکھنے والوں کی پھبتی اُڑاتے آئے ہیں۔ لیکن گذشتہ دسمبر میں یورپ کا دماغ یہ سُن کر ہیجان کی حالت میں آ گیا کہ ایک جرمن نے مصنوعی طریق سے سونا بنالیا ہے۔ اتحادی ایک دوسرے سے پُوچھنے لگے کہ کیا جرمن اپنا تاوان ادا کرنے میں ایسی ذلیل حرکت سے باز نہ آئیں گے۔ جرمنی کے متین طبقے کی طرف سے اِس بات کی تردید ہوگئی لیکن یقین نہیں آتا کہ یہ بات صرف تفننِ طبع کی غرض سے کی گئی تھی۔

بانس کی گھڑی۔ سینئر رینزی (ساکن نیپلز) نے تین برس کی محنتِ شاقہ کے بعد ایک بانس کی بڑی گھڑی ایجاد کی ہے جس میں سوائے گھنٹی کے سب پُرزے بانس کے بنے ہوئے ہیں۔ اس میں گھڑی کے معمولی کام کے علاوہ بعض نئی باتیں ہیں۔ گھڑی ہر پندرہ منٹ کے بعد بجتی ہے۔ دن اور مہینے کا پتہ دیتی ہے اور اُسے صرف چار برس کے بعد چابی دی جاتی ہے۔ ہر روز دوپہر کے وقت اُس میں ایک چھوٹی سی توپ چلتی ہے ایک جھنڈا بلند ہوتا ہے اور ایک سیٹی کے بعد ایک گھنٹی بجتی ہے۔

اخلاق پیمائی۔ ڈاکٹر برڑسے (برلن) نے ایک فلزی آلہ ایجاد کیا ہے جس سے تھوڑی دیر میں انسان کی اخلاقی قوت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ آلہ معمول کے سر پر لگادیا جاتا ہے اور ایک گھنٹے کے اندر اُس شخص کی اچھی بُری عادتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ (وطن)

امریکہ کے مشہور ہوا پرواز مسٹر ایڈون نے اعلان کیا ہے کہ میں قطب شمالی کے سفر کی تیاری کر رہا ہوں یہ سفر الاسکا (شمالی امریکہ) سے شروع ہوکر قطب کو کاٹتا ہوا "سپتیز برجن" پر ختم ہوگا یعنی اٹھارہ سو میل کی مسافت طے کرنی ہوگی اور پھر طرّہ یہ کہ اتنی بڑی مسافت ایک ہی پرواز میں قطع کی جائیگی۔

الہلال (مصر)

دُنیا میں سب سے زیادہ بلند پرواز ایک امریکن باشندہ مسٹر میکریڈی ہے جو اکتالیس ہزار قدم اونچا اُڑ سکتا ہے اور سب سے زیادہ زُود پرواز موسیو کوانٹ فرانسیسی ہے جو (۲۰۶) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑتا ہے۔

(تاجور) الہلال (مصر)





(ٹینس کورٹ کا حلف)

(۲۰ جون ۱۷۸۹ء)

شخصیتیں اور خیالات

شخصیتیں ناکام ہوتی ہیں، خیالات زندہ رہتے ہیں!

ہم اکثر کہتے ہیں "یہ آدمی اچھا ہے"۔ "وہ آدمی بڑا ہے"۔

شہرت کے انعامات کے لئے ایک شاندار جدوجہد برپا ہے!

شخصیتیں حیات و ممات کے معاملے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ آدمی مر جاتا ہے۔ پھر ہم جان لیتے ہیں کہ وہ تو فقط اک حادثہ تھا اور حقیقی شے وہ خیال تھا جس کے ساتھ اُس نے اپنے تئیں وابستہ کر لیا!

لنکن قتل کر دیا گیا لیکن آزادی کی ترقی نہ رُکی!

بُدھ گذر گیا لیکن اُس کے خیالات ایک بڑ کے درخت کی طرح پھیلے اور خلقِ خدا کو اپنے سائے میں لے لیا۔

سقراط کو زہر دے کر یا جون آف آرک کو جلا کر دُنیا کے ہاتھ کیا آیا؟ وہ تو محض بُلبلے تھے ندی جوں کی توں بہتی رہی!

جنگِ عالمگیر میں سے اک خیالِ عظیم پیدا ہوا ایسا پُر عظمت کہ لاکھوں آدمیوں کے خُون کی قیمت اُس کے لئے گراں نہ تھی۔ وہ کیا ہے؟ دُنیا کی حکومت!

آخر کار دُنیا والوں نے دیکھ لیا اگرچہ یہ دیکھنے کے لئے اُنہیں آتشِ جہنم میں سے گذرنا پڑا کہ انسانیت کو ایک ہونا لازم ہے!

جاپانی۔ انگریز۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ امریکن۔ یہ وقت کے افسانے ہیں اور فقط انسانیت ایک ازلی یقین ہے!

ایک ایسا پُر زور خیال اک ایسی حیات آفریں قوت، انسانی بہبودی کی یہ غیر انجام ممکنات اہلِ دُنیا کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔ اسے ممکن العمل ماننا خدا کو ماننا تھا۔ یہ اک کہنے کی بات تھی کرنے کا کام نہ تھا۔ ایک ایسے سُود مند خیال پر سارے چنگیز بھڑک اُٹھے اور حکم دے دیا کہ یہ بچہ قتل کر دیا جائے۔

اے جاہلو! جو خیال ایک بار پیدا ہوا وہ فنا نہیں ہو سکتا۔ سچ ایک بار بولا گیا تو وہ زندہ رہے گا حالانکہ توپیں جو اُس پر گولہ باری کرتی تھیں جلد زنگ خوردہ ہو چکیں گی!

شخصیتیں جنہوں نے زمین پر اتحاد پیدا کرنے کی پہلی کوشش کی رخصت ہو رہی ہیں۔

لیکن وہ خیالِ عظیم انسانیت کی وحدت، بین قومی عدالت، مُلکِ دُنیا کی فوج، وہ نہ رُکنے والا خیال جتنا پسپا کیا جائے گا اُتنا ہی آگے کو بڑھے گا قتل ہو گا لیکن قتل ہونے پر ہر بار تازہ اور متبسّم اُمیدوں کو پہلو میں لئے ہُوئے اُٹھے گا!

تم اُسے فنا نہیں کر سکتے جب تک انسانی عقل کو ملیا میٹ نہ کر دو! تمہارے تمام اِنکار اُس کی بڑھتی ہُوئی قوتوں کے نیچے دب کر پس جائیں گے۔

اُس کا آنا لازم ہے! جنگی بیڑے باربردار جہاز بن جائیں گے فوجیں منتشر ہو جائیں گی سپاہی کسان بن جائیں گے۔ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی محنت کا پھل حماقت کی آگ میں جھونکا نہ جائے گا بلکہ کام میں لایا جائے گا تاکہ دُنیا بھی اک بہشت ہو جائے!

سلطنت کا پُرانا اور زہریلا خیال مِٹ جائے گا!

وہ نیا خیال وہ نئی دُنیا کا خیال وہ عالمگیر اتحاد کا خیال زندہ رہے گا! اور آتشِ جہنم بھی اُس کے وجود کو ضرر نہ پہنچا سکے گی!!

گل میں

(رچیبدہ)

تحقیق الالسنہ

یُورپ کے محققین السنہ مختلف اوقات میں امّ الالسنہ کے متعلق مختلف رائیوں کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ کسی زمانہ میں سربانی کو سب زبانوں کی اصل خیال کرتے تھے بعدہٗ ایک بڑا گروہ اِس بات کا مؤید ہُوا کہ سنسکرت ام الالسنہ ہے۔ پھر سمجھنے لگے کہ تورانی تہذیب سب سے زیادہ قدیم ہے اور تورانی کا مسکن وسط ایشیا ہی تمام اقوام کا مخزن ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ کہ تورانی ام الالسنہ ہے۔

بقول رڈ پاتھ امریکن اب یہ عقیدہ ہے کہ سب زبانیں آپس میں چھوٹی بڑی بہنیں ہیں اور موجودہ زبانوں میں سے ہر ایک قدیم ہے اور یہ سب کسی ایسی زبان کی شاخیں ہیں جو تاریخی زمانہ سے پہلے ہی معدوم ہو چکی تھی اور اب دُنیا کے کسی حصہّ میں نہیں بولی جاتی۔

کچھ عرصہ سے عُلمائے یُورپ عرب کے آثارِ قدیمہ کی تلاش میں مصروف ہیں۔ بہت سے کتبے دستیاب ہُوئے ہیں جن سے عرب کی قدامتِ بعیدہ کا ثبوت بہم پہنچا ہے نیز مزید کتبوں اور معلومات کے حصُول کی قوی اُمید ہے۔ اگر عربی آثار سب سے زیادہ قدیم دریافت ہُوئے تو اہلِ یُورپ ہمارے اِس دعوٰے کو ماننے کے لئے تیار ہو جائینگے کہ عرب اور اس کی زبان تمام اقوامِ دُنیا کی زبانوں کا ماخذ ہے ورنہ اب تک تسلیم نہ کرتے تھے کیونکہ اوّل تو عرب کی تاریخ قدیم سب قوموں سے زیادہ تاریکی میں تھی جس کا سبب تمام متمدن اقوام کے آغازِ تہذیب سے پہلے فراموش ہو جانا تھا۔ دوسرے آثارِ قدیمۂ عرب تک بدویان عرب کی خونریز غارتگری و تعصب کے باعث اہلِ یُورپ کی رسائی نہ تھی تیسرے قوموں کا اتحاد ثابت کرنے میں سب سے بڑا اصل الاصول زبانوں کا الفاظی اِتحاد ہے۔ جس میں انہیں قطعی ناکامیابی ہُوئی۔ کیونکہ اِن کے اِبتدائی محققین نے عربی ادب کی محض سرسری واقفیت کے سبب سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ سامی و آرین و تورانین۔ زبانوں کے تین خاندان باہم کُلیتاً غیر مماثل و اجنبی ہیں جن میں بجز چھ سات الفاظ کے جو اتفاقاً مشابہ نظر آتے ہیں کوئی مطابقت نہیں ہے، اور اِسی غلط فیصلہ پر تمام متوسطین و متاخرین یقینِ کامل کرتے چلے آ رہے ہیں۔

آثارِ قدیمہ سے اہلِ یُورپ عرب کی قدامت کا ثبوت حاصل کر لینگے مگر اِتحادِ السنہ ثابت

کرنے کے لئے اِن کو ہدایاتِ ذیل پر عمل کرنا چاہیئے۔ اِن ہدایات پر عمل کرنا اہلِ تحقیق کے لئے اعجاز نما عینک ہوگا تمام دُشواریوں کے پہاڑ جو اِس وقت حائل ہیں کافور بن کر اُڑ جائینگے اور تمام دُنیا میں بجز عربی کے اور کوئی زبان نظر نہ آئیگی۔

۱۔ اِس خیال کو ترک کر دینا چاہیئے کہ مشہور متمدنہ ممالک کے مقابلہ میں عرب جدید التہذیب ہیں یا اُن متمدنہ ممالک کی زبانیں انکی خود ساختہ ایجادیں ہیں اور اِن کے اہلِ زبان عُلماء لغت کی تشریح و تجزیہ بالکل صحیح ہے۔

۲۔ ہر لفظ کے لئے خواہ وہ کسی مُلک کی زبان کا ہو سہ حرفی عربی مادّہ تلاش کریں بڑا لفظ ہو تو تجزیہ کرلیں

۳۔ اگر لفظِ تحقیق طلب میں ایسے حرف ہوں جو عربی میں نہیں آتے تو قواعدِ فلولوجی کے تحت میں اُن حروف کو عربی حرفوں سے بدل لیں۔

۴۔ اگر لفظِ مذکور بلحاظِ صُورت و معنی عربی میں مل جائے تو فبہا۔ ورنہ غور کریں کہ وہ عربی کے کس مادّہ کے تحت میں آسکتا ہے جب ایک مادّہ تجویز کر لیا تو دیکھیں کہ اسی مادّہ کے مشتقات میں لفظِ مطلوبہ کے غیر زبان والے معنی کہیں شامل ہیں یا نہیں۔ اگر شامل ہیں تو دیکھنا چاہیئے کہ اُس مادّہ سے کسی عربی قاعدۂ صرف کے تحت میں لفظِ غیر کا ہمشکل بن سکتا ہے یا نہیں۔ اگر بن سکتا ہے تو سمجھ لیں کہ وہ اسی مادہ سے ہے مگر دوسرے قاعدۂ عربی سے بنالیا ہے۔ اگر شامل نہیں تو تحتِ فلولوجی دوسرا ہمشکل مادّہ تلاش کریں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

۵۔ مطابقت کے وقت قلیل الاستعمال قواعدِ صرف پر بھی نظر رکھیں جن میں سے بعض اگرچہ متداولہ کُتبِ صرف عربی میں مذکور نہیں مگر ان کے تحت میں بنے ہُوئے بہُت سے الفاظ کُتبِ لُغات میں لکھے ہُوئے ملتے ہیں۔

۶۔ الفاظ کے معانی کی مطابقت کے وقت انکے خصوصی لوازم کو مقدم قرار دیں صرف عمومی قرینہ پر اکتفا کرنا جیساکہ عُلماء یُورپ کا طریقہ ہے محض غلطی ہے۔

عمومی قرینہ کو کافی سمجھنے کی ایک مثال مولوی شبلی نے الفاروق میں نقل کی ہے اور وہ یہ کہ دیوان۔ دفتر۔ دبستان۔ دبیر۔ چاروں لفظ فارسی مادہ دب سے جس کے معنی نگاہ داشتن ہیں بنے ہیں۔ مگر ان چار لفظوں کے پہلے دو دو حرف تو قائم مقام دب کے ہیں جو مُتبدلی یا اصلی حالت میں ہیں اور ستان بھی

جگہ فارسی کا متعارف لفظ ہُوا۔ باقی وان۔ تر۔ تیر کے کیا معنے؟ یہ نہیں بتایا۔ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں علامت فاعلی فارسی ہے جیسی مہربان میں اس کا مبدل وان ہے مگر تر۔ یر پھر بھی مجهول المعنی رہے۔ مجبوراً تر کے مشہور معنی بسیار لینگے عربی میں دیوان کے معنی ہیں فراہم آمدنگاہ کتب وکتاب کہ درآں لشکریان واہلِ عطیہ مکتوب باشند یہ معنی اہل عرب کے بیان کئے ہُوئے ہیں اور انہوں نے یہ نام اور اس کے معنے اہلِ فارس سے لئے تھے اس واسطے یہ لفظ مع اپنے مفہوم کے فارسی سمجھا گیا ہے۔ ہندوستان کی فارسی میں دیوان کے معنی مختارکل یا وزیرِ اعظم یا نائب حاکم کے ہیں چنانچہ عالمگیر نے داراشکوہ کے مختار پہاڑا مل کو رقعاتِ عالمگیری میں دیوانِ سرکارِ برادرِ نامہربان کہا ہے اور اب تک یہ نام اسی معنی میں مشہور ہے چنانچہ خانقاہِ اجمیر شریف کے سجادہ نشین دیوان جی کہلاتے ہیں یعنی خواجہ صاحب کے دیوان اور چیتوڑ کے رانا سری دیوان جی سے مخاطب ہوتے ہیں یعنی انکے دیوتا ایکلنگ جی کے (جو پاس کے پہاڑی مندر میں ہیں) دیوان۔

دیوان کے ایک معنی قاضی یا منصف یا جج کے بھی ہیں چنانچہ عدالتِ دیوانی کے لفظ میں دیوان کے یہی معنی ہیں۔ پانچویں معنی مجموعہ اشعار کو کہتے ہیں چنانچہ شاعروں کے کلام کے مجموعہ کو دیوان کہتے ہیں اب ہم ان سب کی شرح لکھتے ہیں۔

(۱)۔ کتب خانہ عربی دِیْحَ وَعَنْ کا مخفف ومبدل ہے کیونکہ دِیْحَ از دوح بمعنی کتاب نگاشتہ وَعَنْ بمعنی جائے حفاظت۔

(۲)۔ رجسٹر فوج واہلِ عطیہ۔ دیوان از دَین مثل جزءِ واض وجزواط حساب خدمت وپاداش (انعام و تنخواہ) خادمان وبندگان بدیانت دارندہ۔

(۳)۔ نائب حاکم یا وزیر یا مختار آن دیوان مبدل دِوْوان از دون۔ مردے کہ درتحت کسے کارکند

(۴)۔ منصف یا قاضی دیوان از دَین آیۂ مالکِ یومِ الدِّین میں دین کے معنی عدل وانصاف ہیں۔

(۵)۔ مجموعہ اشعار اصلاً ضَحْوْ وَعَنْ ہے ضَحْوْ کلامِ روشن وواضح وَعَنْ بمعنی مجموعہ۔

دفتر کو لغت نویسانِ عرب نے معرب نہیں بتایا۔ بلکہ خالص عربی قرار دیا ہے۔ مگر مخبوطانِ عجم پرستی نے جس طرح اور صدہا عربی الفاظ کو فارسی الاصل ٹھہرا دیا اسی طرح اسکو بھی فارسی کہدیا ورنہ یہ اصلاً تفتر مادّہ نتر سے ہے۔ اظہارِ مبالغہ کے لئے عین کلمہ کو اول میں اضافہ کرکے عَفعَل کے وزن بنالیا ہے جیسے رَقف سے قَرقَف۔ فُتر کے معنی برگ ہائے درخت۔ منشتنی یا بنشتہ فراہم کردہ اسی واسطے لغاتِ عرب میں تفتر کا

ترجمہ دفتر کیا ہے اور مادہ فتر میں درج ہے۔ تتّ دِ متبادل ہیں رواج کاغذ سے پہلے درختوں کے پتّوں پر لکھا کرتے تھے۔ ہندوستان میں بھوج پتر لکھنے کے کام آتا تھا اِسی فتر سے ہندی پتّر بمعنی برگِ درخت بنا ہے ہندی میں چِٹھی کو پتری اور برہمنوں کے مستعملہ خلاصۂ جوتش کو پتّرا اسی واسطے کہتے ہیں کہ پہلے پتّوں پر لکھے جاتے تھے۔ کاغذ کو پتّر اِس واسطے کہتے ہیں کہ وہ پتّوں کی جگہ کام آیا ہے۔

دبستان میں دَبْ عربی دَبّ بمعنی طریقۂ مذہب و عدل و نرمی اختیار کر دن یا آموختن ہیں تعلیم کے بہترین مقاصد یہی ہو سکتے ہیں۔ ستان فارسی کو ستھان ہندی کا متبدل بتاتے ہیں۔ مگر ستھان عربی سطحان بوزن اِنسان بمعنی جائے ہموار یا مکان مُسَقّف ہے دبّ سطحان کے معنی تعلیمگاہِ مذہب و اخلاق و سیاست ہُوئے جس کا بگاڑ دبستان ہے۔

دبیر اصلاً خبیر از خبر بلفظ دال بمعنی کاتب و دفتری و مثلخوان۔ خ کا دَ بنالیا اہلِ نظر دیکھ سکتے ہیں کہ عربی ہر لفظ کی اصلی وحقیقی شرح بتلاتی ہے اور فارسی شرح صرف ایک اوپری بے محل قرینہ ہے جو مقصود سے تقریباً بعید ہے۔ کیونکہ صرف نگہبان سب کے معنی میں کہدینے سے تمام الفاظ کی جُدا گانہ لازمی خصوصیات شارح فارسی کے پیٹ میں رہ جانے کے سبب سے سامع کو معلوم نہ ہو سکیں اور صرف نگہبان کا لفظ عام سمجھ میں آیا جس میں گنجائش ہے کہ دیوار بمعنی نگہبان خانہ۔ دوات بمعنی نگہبانِ سیاہی۔ دوش بمعنی نگہبانِ دست دُور بمعنی نگہبان درازئی فاصلہ دیر بمعنی نگہبان درازئی وقت دَیرَ بمعنی نگہبانِ اصنام وغیرہ اپنے دل میں قرار دیکر سب کو دبّ کے مادہ سے سمجھ لیں۔ پس فارسی شرح ایک بیخبرانہ تحقیق ہے بھروسہ کے لائق نہیں۔ خود دبّ فارسی عربی دبّ سے بنا ہے جس کے معنے نکتہ چینی و سیاست ہیں جو نگہبانی کے مرادف ہیں۔ یہ بات کہ عجمی لغت نویسوں کی تشریحات ناقابل اعتبار ہیں مندرجہ بالا تشریحات سے ثابت ہو گئی ہے نیز یہ کہ ان کی املا بھی غلط ہو جاتی ہے جیسے خبیر کا دبیر بنگیا اور یہی انکے عربی سے غیر ہونے کا سبب ہے۔

۷۔ اہلِ تحقیق کو خود عربی ڈکشنریاں بھی بعض دفعہ دھوکا دیتی ہیں کیونکہ انکے لکھنے والے فلولوجی سے واقف نہ تھے نہ انہوں نے الفاظ کے خصوصی لوازم سے سروکار رکھا۔ جن الفاظ کا تلفظ فنِ کتابت سے پہلے ہی بدل گیا تھا انکو لغت نویسوں نے اپنے زمانہ کی مشہور قرءت کے موافق ان مادّوں میں درج کر دیا جن کے تحت میں وہ موجودہ قرءت کی بنا پر آ سکتے تھے حالانکہ بلحاظ خصوصیاتِ معنی وہ اس مادہ سے متعلق نہ تھے۔ اس لئے اِن کا مفہوم اپنے مندرجہ لغت مادہ سے غیر بن گیا اور اسی مغائرت کی وجہ سے بعض علماء نے انکو معرّب

قرار دیا جیسے لینہ بمعنی کھجور کا درخت لین کے مادہ میں درج کردیا حالانکہ لون سے متعلق تھا نیل کو جو دریائے مصر کا نام ہے ن ی ل میں درج کرکے یا حالانکہ نول سے متعلق تھا یا بعیر اونٹ کا نام اصلاً بحیر تھا مگر اسکا تلفظ فن کتابت سے پہلے بدل گیا تھا اسلئے بعیر کو اہل لغت نے بعر کے مادہ میں لکھدیا پس اہلِ تحقیق کو چاہیئے کہ ہمیشہ عربی لغات میں لکھے ہوئے مادہ پر منحصر نہ ہیں بلکہ اسکے ہمشکل مادوں میں لفظِ تحقیق طلب کے خصوصی لوازم کو تلاش کریں مثلاً خبیر بمعنی نویسندہ و کاتب وغیرہ کی بابت شبہ ہو تو اسکا ہمشکل زبیر موجود ہے کیونکہ اسکے مادہ زبر میں معنی نوشتن و خط و کتابت کردن ہیں۔ض کی آواز د و ز دونوں کے مطابق ہے۔

تجزیہ کی مثال یہ کہ مثلاً ٹکسال ہندی لفظ بمعنی سکہ بنانیکا گھر ہے اور پنج حرفی ہے یہ معلوم ہے کہ سال ہندی میں گھر کو کہتے ہیں اسلئے اسکے دو ٹکڑے ٹک ۔ سال ۔ کرلئے ۔ اب ٹک کو عربی صورت میں لاکر معنی تلاش کئے تو تک ۔ طک ۔ تق ۔ طق سے کچھ پتہ نہ لگا تقع ثلاثی اور کچھ بامعنی معلوم ہوا مگر مطابقت معنی اس میں بھی کچھ نہیں ملی خیال ہوا کہ مادہ وقع سے تقع بن سکتا ہے جسطرح وقی سے تقیا بنا جو اصل ہے تقوی کی اسی طرح وقع سے تقعا بنگیا جو ہم معنی وقع ہے۔ تقعا کا مخفف تقع اور ہندی میں تک ہوگیا وقع کے معانی کا استنباط ہے۔ دھات کے ٹکڑے کاٹ کر انکو سنگ فسان پر جلا دینا اور حروف نشان منقش کرنا یہی صورت قدیم سکہ سازی کی ہے۔

سال عربی میں ثال فاعل ثل ہے اسکے معنی ہیں مویشی اور آدمیوں کے آرام کرنیکے لئے آراستہ و رخنہ دار گھر ہندی میں عام گھر کیواسطے مستعمل ہے غرض ٹکسال کے معنی سکہ بنانیکا گھر ہوا یہی مطلوب تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ ٹکسال کے معنے ٹکے بنانیکا گھر ہوگا۔ مگر ٹکہ دو پیسے کو کہتے ہیں اور ٹکسال میں پیسہ روپیہ اشرفی سبھی بنتے ہیں اس لئے یہ شرح درست نہیں۔

اصلاً ٹکہ مخفف و مبدل تہ قہ کا ہے تہ کے معنی دو قہ دوسری صورت وقع کی ہے جیسے ضعتہ دوسری صورت وضع کی ہے۔ تہ قہ کے معنی دو پیسہ یا ٹکہ۔ اہل یورپ تلاش کرتے ہیں کہ ٹکسال یا ٹکہ اپنی اصلی صورت میں لکھا ہوا مل جائے سو ایسا حلوائے بے دود کہاں رکھا ہے۔ یہ تو تب ہو سکتا تھا جب ہندی سے عربی میں یہ الفاظ منتقل ہوتے جیسے تکر ٹھاکر کا معرب ہے اور اہلِ عرب نے راجپوت رئیسانِ سندھ سے سنا تھا مگر راجپوتانہ میں ٹھاکر کہتے ہیں ہندی میں اسکی شرح ٹھاہ گرو کرتے ہیں۔

ٹھاہ بمعنی جگہ گرو بمعنی آقا یعنی آقائے مقامی عربی میں ٹھاہ کے مقابل تاہ بمعنی زمین یا قلعہ بلند ہے کرہ بمعنی فوجدار و سیاست کنندہ تمام ٹھاکر گڑھیاں رکھتے ہیں۔

گرو مذہبی استاد کو کہتے ہیں۔ راجپوتانہ میں گرو کہتے ہیں یہ عربی لفظ کرو بوزن فعول از کرو بمعنی قائم اللیل در عبادتِ خدا و وعظ و ذکر بندگی بسیار گوئیندہ و باجرت کار کنندہ گرو اپنے چیلوں سے خدمت اور تنخواہ بھی لیتے ہیں۔

باقی آئندہ

قیصری

کلام خسرو پر اعتراضات
کا
تحقیقی جواب

امیر خسرو؎ بہ بازی سوئے من آمد بہ شوخی دل ز من بستد
بدو گفتم چہ خواہی کرد گفتا کار مے آید

عام محاورہ بکار آمد ہے کار آمد امیر خسرو کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزرا۔

شعر العجم مولانا شبلی حصّہ دوم بیان امیر خسرو صفحہ ۱۸۰

امیر خسرو؎ سالہا شد کہ نیابم خبرِ در کوئیت — دل ویران شدہ را آیم و آواز کنم
من از سر زندہ گردم گر تو یارا یک سخن گوئی — تو مے دانم نگوئی لیک من گفتار میگویم
(مجھ کو معلوم ہے کہ تم نہ کہو گے لیکن میں بات کہتا ہوں)
دعوائے خوں بہائے دِل خویش مے کنم — یک بوسہ بر لبم زن و مالا کلام کُن

امیر نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو اُن کے سوا کسی اور اہلِ زبان کے کلام میں نہیں ملتے مثلاً از گرہ او چہ[1] میرود

آواز کردن	پُکارنا
گفتار میگویم	یُوں ہی ایک بات کہتا ہوں
مالا کلام کردن	کسی کو ساکت اور بند کرنا

اِس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی محاورے اُن کی زبان سے نکل جاتے ہیں ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن چونکہ ہمکو اپنے تتبع اور استقراء پر اعتماد نہیں اس لئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے

شعر العجم حصّہ دوم صفحہ ۱۸۱ و ۱۸۲

---

[1] امیر خسرو؎ جان میرود ز تن چو گرہ میزند بزلف — مردن مراست از گرہ او چہ مے رود

شعر العجم حصّہ دوم صفحہ ۱۸۲ "

اس کو مولٰنا شبلی مرحوم کی ہضم نفسی کیئے یا ارادتمندی کہ وہ اِس بدگمانی میں بدگمانوں کے ساتھ شریک نہیں ہیں بخلاف اُن مُصنّفین کے جنہوں نے اپنی استقراء اور تتبع پر بھروسہ کرکے اِسی قسم کے شبہات کو سنگین اعتراضات کے لباس میں ظاہر کیا ہے عبدالباسط مُصنّف شرع الشعراء نے بابِ پانزدہم در پیروی طریقت شعرا میں لکھا ہے کہ

اُستواری مہارت ایں فن را لازم ست کہ اعتماد بر محاورہ شعرائے ہندوستان نکند ہرچند از کامل تریناں باشد چنانچہ بعض محاورۂ اشعار امیر خسرو دہلوی کہ خسرو شاعران بود ست نیز خالی از شبہ نباید شمرد مطابق ہندوی وقتے بطریق ظرافت بستہ باشد — چنانکہ دریں بیت امیر مذکور ؎

اومے رود بناز و گرہ مے زند بزلف

مردن مراست از گرۂ او چہ مے رود

از گرۂ او چہ مے رود اغلب کہ محاورہ از گرہ او چہ مے رود مطابق ہندوی بستہ باشد جائے دیگر نیامدہ۔

غالباً مولٰنا شبلی مرحوم کا ماخذ اِن شبہات کے متعلق ہندوستانی محققین کی تصانیف ہی ہوگا کسی ایرانی مُصنّف کا کوئی اعتراض اس قسم کا ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

ہمارا حسنِ عقیدت جو ہمکو حضرت امیرِ خسرو کے کلام وکمال سے ہے ان شبہات کے قبول کرنے سے روکتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ امیر خسرو اگرچہ ہندوستان میں بمقام پٹیالی ضلع ایٹہ پیدا ہوئے لیکن اُنکی گھر کی زبان فارسی ہی تھی اُن کی ماں عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے اُن کی گھر کی زبان بھی فارسی تھی۔

اگر والہ داغستانی کی روایت پر اعتبار کیا جائے تو امیر خسرو باپ کے ساتھ ہندوستان میں آئے ہیں اِس صورت میں وہ ہندی نژاد بھی نہیں ہیں۔ لیکن یہ روایت اور تمام تذکرہ نویسوں کے خلاف قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

دس سال کا بچّہ مادری زبان سیکھ جاتا ہے اگر کوئی خاص وجہ غیر اہلِ زبان لوگوں میں آمیزش کی نہ ہو تو اُس کی زبان بیرونی اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

امیر خسرو امیرزادہ تھے اُن کے والد سیف الدین محمود ترکستان کے رئیس تھے اور ہندوستان

آکر سلطان محمد تغلق کے دربار میں ممتاز عہدہ پر مامور ہوئے پس کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ امیر خسرو کی زبان پر اس قدر جلد ہندوستان کی ماند و بود کا اثر پڑا ہو۔

ان وجوہ سے حضرت امیر خسرو کی مادری زبان فارسی اور اکتسابی زبان ہندی مروج الوقت قرار پاتی ہے ہمیشہ اکتسابی زبان میں نظم کی پابندی اور خیالات کی ترجمانی سے لغزش ہو سکتی ہے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ ہمیشہ جو خیال انسان کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے وہ اُس کی مادری زبان میں پیدا ہوتا ہے پھر خواہ اُس کو کسی زبان میں ترجمہ کر کے ظاہر کیا جائے۔

امیر خسرو کی مادری زبان فارسی ہے اُن سے یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ جو خیال اُن کے دماغ میں پیدا ہو وہ اُس کو فارسی نما ہندی میں ظاہر کریں درانحالیکہ وہ فارسی ہی میں ادا کرنا چاہتے ہوں + -

امیر ابو سعید مسعود سعد سلمان لاہوری بھی حضرت امیر خسرو کی طرح ہندی نژاد ہیں اور امیر خسرو کی طرح ہندی زبان کے بھی شاعر ہیں لیکن اُن کی فارسی زبان میں ہندی محاورات کی آمیزش بیان نہیں کی جاتی یہ ضروری نہیں ہے کہ جو ہندی نژاد ہو اُس کی مادری زبان فارسی نہ ہو اور اُس کی زبان میں ہندی محاورے اور ہندوستان کی سکونت کا اثر پایا جائے +

بعض محققین ہند کو اُن کی غائیت احتیاط و حزم نے متشکک و متوہم بنا دیا ہے وہ جب تک ایک محاورہ کو چند فارسی شعرا کے کلام میں نہ دیکھ لیں اطمینان نہیں ہوتا۔ چنانچہ خان آرزو نے اسی قسم کے اعتراضات تنبیہ الغافلین میں شیخ علی حزیں پر وارد کئے ہیں کہ یہ محاورہ شیخ کے سوا اور کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا جن میں سے اکثر کے جواب مولوی امام بخش صہبائی نے قول فیصل میں دئے ہیں۔ میرے نزدیک یہ کوئی معقول وجہ اعتراضات کی نہیں ہو سکتی اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ جو محاورہ کسی اہل زبان نے لکھ دیا ہے جبتک ہم اُسکو چند دیگر شعراء فارسی کے کلام میں نہ دیکھ لیں اس پر اعتبار نہ کریں +

یہ ناممکن ہے کہ کسی زبان کے کل محاورے قید نظم میں آگئے ہوں اور کوئی محاورہ نظم ہونے سے باقی نہ رہا ہو۔ اہل ایران سے ہزاروں ایسے محاورہ سننے میں آتے ہیں جو اب تک کسی نے نظم نہیں کئے ہیں زبان شعر بہت مختصر سی زبان ہے اکثر پیشہ وروں کے محاورے مستورات کا روزمرہ اور تقریبات کی رسمیں وغیرہ نظم میں نہیں ملتے۔ اگر بسحق اطعمہ کا کلام اور میر نجات اصفہانی کی گل کشتی ہمارے پاس نہ ہو تو ہم نہ کھانوں کے نام نہ کشتی کے داؤ پیچ سعدی و حافظ کے کلام سے معلوم کر سکتے ہو اور نہ انوری و خاقانی کے قصائد اس بارہ

میں کچھ ہماری مدد کرتے ہیں۔

اسی طرح اور دوسرے پیشہ وروں کی زبان پر قیاس کر لینا چاہیئے۔

اس بنا پر میری خوش اعتقادی اُن تمام شبہات کو صحیح نہیں سمجھتی جو امیر خسرو کے کلام پر متشککین نے کئے ہیں ۔

---

(۱) امیر خسرو ؎ بہ بازی سوئے من آمد بشوخی دل ز من بستد — بدو گفتم چہ خواہی کرد گفتا کار می آید

کہا گیا ہے کہ عام محاورہ بکار آمد ہے امیر خسرو کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزرا نظر سے نہ گزرنا تو کوئی معقول دلیل تغلیط نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا کہ جس کی نظر سے اُن تمام شعرا کا کلام گزرا ہو جو آغاز شاعری سے آج تک ہر ملک و ہر دیار میں ہو چکے ہیں لیکن اس کی نظیر تو ظہیر فاریابی کے کلام سے ہم پیش کر سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

جائے چاکے زر گریبانم نماند

اے ظہیر امروز کار آمد نہ ذیل (دامن)

اس کے علاوہ اہل ایران کا قاعدہ ہے کہ وہ حرف ظرف کو (خواہ بائے موحدہ ہو یا در ہو) اکثر روزمرہ میں حذف کر دیتے ہیں۔ جیسے ماہے می آید ایک مہینہ میں آتا ہے۔ سالے میرود ایک سال میں جاتا ہے شب میرسد رات کو آتا ہے شعر میں بھی اکثر ایسا دیکھا گیا ہے سعدی ؎

شب تاریک دوستانِ خدا

مے بتابد چو روزِ رخشندہ

یعنی دوستانِ خدا در شب تاریک چو روز رخشندہ می تابند۔ ظہیر فاریابی ؎

گزشت عمر و نیامد شبے بہ بالینم

بکارِ من چو نیاید چہ کار مے آید

مصرع ثانی بکار آمد و کار آمد دونوں کی سند ہے یعنی بچہ کار آمد کی جگہ چہ کار آمد حرف ظرف کو محذوف عام محاورہ بچہ کار آمد ہے امیر خسرو کا شعر ہے ؎

بہ لبم رسید جانم تو بیا کہ زندہ مانم — پس ازانکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

(۲)

سالہا شد کہ نیایم خبر و در کو بیت
دل ویران شدہ را آیم و آواز کنم

آواز کردن خلافِ محاورہ بتایا جاتا ہے میں اس کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔
ظہیر فاریابی کا شعر میرا موید ہے ؎

ناخن بدل زدن بطرب ساز میکنم
آں زہرہ چہرہ را بخود آواز مے کنم

اگرچہ ظہیر کی سند کے بعد کسی دوسری نظیر کی ضرورت نہیں مگر ابوالفضل کا ایک شعر ناخواستہ زبان پر آگیا ہے از دفتر سوم ابوالفضل ؎

مطرب ترانۂ شبِ غم ساز می کنم
غمہائے رفتہ را بخود آواز می کنم

ابوالفضل معمولی شخص نہیں ہے اور جبکہ اُس کی تائید میں ظہیر فاریابی سا مسلم الثبوت اہلِ زبان ہے تو ابوالفضل کے کلام کا وہی پایۂ ثبوت ہو سکتا ہے جو ایک ایرانی اہلِ زبان کا ہونا چاہیئے۔

(۳) امیر خسرو

من از سر زندہ گردم گر تو یارا یک سخن گوئی
تو می دانم نگوئی لیک من گفتار می گویم

گفتار گفتن محل نظر ہے۔ یہ شبہ دو وجہ سے ناشی ہوتا ہے ایک یہ کہ عام محاورہ سخن گفتن ہے۔ اور امیر خسرو نے گفتار گفتن کہا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسکا ترجمہ فصیح اُردو میں مولنا شبلی نے (یوں ہی ایک بات کہتا ہوں) کیا ہے امرِ اوّل کی بابت یہ گزارش ہے کہ جو کچھ مُنہ سے کہا جائیگا اُس کے لئے گفتن ہی کا کوئی صیغہ استعمال ہوگا جیسے سخن گفتن شعر گفتن دُعا گفتن سلام گفتن ترانہ گفتن تہنیت گفتن۔

گفتار۔ گفتن کا حاصل مصدر سہی لیکن ہے تو سخن کا مرادف ہم جہاں لفظِ سخن بول سکتے ہیں وہاں گفتار بھی کہہ سکتے ہیں سخنِ شیریں گفتارِ شیریں۔ سخنِ تلخ گفتارِ تلخ پھر اگر سخن گفتن کی جگہ گفتار گفتن کہا گیا تو اس میں مخالفتِ محاورہ کیا ہے۔ محض قافیہ کی ضرورت سے بجائے سخن اُس کا مرادف گفتار کہا گیا۔ ہے جیسے کوئی پا زدن کی جگہ قدم زدن یا ساغر زدن کی جگہ ساتگین زدن کہے تو ہرگز قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ پا اور قدم ساتگیں اور ساغر مرادف ہیں۔ اسے کلیہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ کسی لفظ کا مرادف لانے سے محاورہ

میں اختلاف نہیں ہوتا۔ الا ماشاء اللہ ایسے مواقع پر مطالبۂ سند لازم نہیں یہ عام طور پر شائع ہے۔

دوسرے اس کا ترجمہ روزمرہ اُردو کے مطابق نہیں کرنا چاہیئے۔ اہلِ فارس کا محل استعمال پیش نظر رکھ کر ترجمہ کرنا چاہیئے۔ اہلِ فارس کا محل استعمال صرف یہی ہے کہ میں بات کہتا ہوں۔ اس موقع پر بات کی جگہ سخن بھی کہینگے اگر اُس کا مرادف گفتار بضرورت قافیہ کہا گیا تو اس میں میرے نزدیک کچھ قباحت نہیں ہے

جانِ میرود زتن چو گرہ مے زند بزلف
مردن مراست از گرُہ او چہ مے رود

(۴) امیر خسرو

ازگرہ گرفتن پر اعتراض ہے۔ پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جو چیز جس ظرف میں ہوگی جب وہ اُس سے نکل جائیگی یا جاتی رہیگی تو اُسی ظرف کی طرف منسوب کرکے کہینگے مثلاً زر از دست رفت۔ دامن از کف رفت موزہ از پا رفت آب از مشک رفت۔ جان از جسم رفت اور جب کوئی چیز کسی ظرف میں موجود ہوگی تو اُسی ظرف کی طرف منسوب کرکے کہینگے۔ مثلاً دامن در دست ہست زر در کف ہست موزہ در پا ہست آب در مشک ہست یہ محلِ استعمال عام ہے جو چیز جس ظرف میں ہوگی اُسی کے ساتھ نسبت کیجائیگی۔ اب سُنئے گرہ بھی ایک ظرف ہے جب کوئی چیز گرہ میں ہوگی تو کہیں گے در گرہ ہست۔ چنانچہ مرزا صائب نے گرہ کو ظرف قرار دیکر کہا ہے ؎

نیست چوں نافہ حاجت اظہار
در گرہ مُشکِ ناب اگر داری

اگر مُشک گرہ سے نکل جائے تو اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ مُشک از گرہ رفتہ اب امیر خسرو کا شعر پڑھئے ؎

او مے رود بناز و گرہ مے زند بزلف
مردن مراست از گرُہ او چہ مے رود

مقصود یہ ہے کہ میری جان اُس کی زلف میں ہے وہ زلف میں گرہ دیتا جاتا ہے یعنی اُسے مروڑتا جاتا ہے اس صدمہ سے مری جان جو زلف میں پھنسی ہوئی ہے نکل جائیگی اور میں مرجاؤں گا

سنہ ؎ مولنا شبلی مرحوم نے کسی غلط نسخہ سے یہ شعر نقل کیا ہے صحیح نسخہ یہ ہے ؎ او میرود بناز و گرہ میزند بزلف
شعر العجم میں اور ہمارے پاس جو قلمی نسخہ ہے اُس میں اسی طرح ہے۔

زلف کی گرہ سے کچھ نہیں جائیگا۔

او کی ضمیر زلف کی طرف راجع ہے نہ کہ زلف والے کی طرف عجب نہیں کہ او کی ضمیر صاحبِ زلف کی طرف راجع کرنے سے یہ شبہ پیدا ہُوا ہو۔

یہ نکتہ فراموش کرنے کے قابل نہیں ہے کہ جیسے امیر خسرو نے گرہ زلف سے مضمون پیدا کیا ہے اسی طرح مرزا صائب نے گرہ نافہ سے مضمون نکالا ہے دونوں شعروں میں بنائے مضمون گرہ ہے اِس لئے دونوں شعر ایک حد تک متحد اور ایک ہی محاورہ میں ڈوبے ہُوئے ہیں۔

یہ محض اتفاقیہ امر ہے کہ اُردو کا محاورہ (گرہ سے جانا) اس اسلوبِ بیان کے مطابق ہے اسی وجہ سے اس شبہ کو زیادہ تقویت ہُوئی۔ شرح الشعرا کا یہ فقرہ کہ "مطابق محاورہ ہندی بستہ باشد کہ جائے دیگر بنظر نیامدہ" پڑھ کر مرزا صائب کا مرقومہ بالا شعر پڑھیئے اور اُس کی تحقیق و زباندانی کی داد دیجئے۔

اکثر محاورے فارسی اور اُردو کے مُطابق ہیں مثلاً فارسی میں ترا چہ افتادہ اور اُردو میں تجھکو کیا پڑی دونوں ایک ہی ہیں خواجہ حافظ ؎

برو بکارِ خود اے واعظ ایں چہ فریادست
مرا فتاد دل از کف ترا چہ افتادست

ذوق دہلوی ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

(۵) امیر خسرو ؎

دعوائے خون بہائے دلِ خویش می کنم
یک بوسہ بر لبم زن و مالا کلام کن

مالا کلام کردن بمعنی ساکت کردن پر اعتراض ہے۔

ہم نے اس شعر کو نسخۂ مطبوعہ و قلمی دونوں میں اسی طرح لکھا دیکھا ہے۔ اگر اس میں کاتب کی غلطی و تصرف نہیں ہے تو ضرور ایک عدالتی اصطلاح ہے مالا کلام بیچ قطعی کو کہتے تھے۔ اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ابتک جے پور کی عدالتوں میں (جو اسلامی عہدِ سلطنت کے کُہنہ نقش و نگار ہیں) یہ اصطلاح مروج ہے۔ یہاں اکثر و بیشتر اصطلاحیں دفاترِ شاہی سے منتقل ہو کر آئی ہیں غالباً ایران کی عدالتوں میں یہ اصطلاح مروج ہوگی یا خاندانِ تغلق کے زمانہ حکومت کی یہ اصطلاح ہوگی۔ اِس خیال

کا مؤید دعوے خوں بہا شعر میں موجود ہے۔ اسکو ہندی محاورہ کا ترجمہ فارسی بھی نہیں کہہ سکتے اُردو میں ایسا کوئی محاورہ بھی موجود نہیں ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ ہندی محاورہ کو فارسی میں ادا کرگئے ہیں نہ اس خیال کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ ہندی فارسی کے خلاف ایک جدید محاورہ ایجاد کیا گیا ہے۔ قدما کے کلام میں ایسے بہت محاورے ملتے ہیں جو اس زمانہ کی زبان میں نامانوس اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ زبان ہر زمانہ میں رنگ بدلتی رہتی ہے۔ چونکہ ہمکو، سو سال پیشتر کی زبان سے کلیتہً واقفیت نہیں ہے ہماری واقفیت صرف اُسی حصہ زبان تک محدود ہے جو بذریعہ کتب ہم تک پہنچی ہے اس لئے ہر ایسا لفظ ہر ایسا محاورہ جو ہم نے مروجہ کتب میں نہیں دیکھا ہمکو نامانوس و غیر فصیح و غیر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ شاہنامہ پڑھیئے کوئی صفحہ آپ کو ایسا نہیں ملیگا جس میں چند لفظ نامانوس نہ ہوں اور اُن کی سند بھی بجز شاہنامہ کے اور کہیں نہیں ملیگی اگر مالاکلام کردن کوئی اصطلاح نہیں ہے تو ضرور اس شعر میں کتابت نے تحریف کی ہے اور یکے بعد دیگرے نقل در نقل ہوتے ہوئے یہ غلطی عام ہوگئی ہے میرا خیال ہے کہ مصرع ثانی اصل میں یوں ہوگا ؎

یک بوسہ بر لبم بزن و لاکلام کن

کاتب نے بزن کی جگہ زن اور لاکلام کی جگہ مالاکلام لکھ کر شعر مسخ کر دیا ہے۔

اس صورت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ جیسے لاجرم لابد لاریب اسی طرح لاکلام۔ امیر خسرو نے یہاں بھی لاکلام کو بے سخن کا مرادف استعمال کیا ہے جو شخص بے سخن ہوگا وہ ضرور خاموش ہوگا۔ مصرعہ

یک بوسہ بر لبم بزن و لاکلام کن

ایک بوسہ دیکر مجھے خاموش کر دے۔ واللہ اعلم

علامہ شبلی مرحوم نے شعر العجم کے صفحہ ۱۰۹ میں امیر خسرو کی یہ رباعی نقل کی ہے

ہر موئے کہ در زلفِ آں صنم است صد بیضۂ عنبرین براں موئے ضم است
چوں تیر بداں راس دلش را زیرا کہ چوں خربوزہ دندانش درونِ شکم است

مولٰنا نے مصرع اول پر نوٹ دیکر لکھا ہے کہ جس نسخہ سے رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا۔ ہمارے خیال میں رباعی کے مصرعہ اول پر اور کوئی وجہ نوٹ دینے کی نہیں ہوسکتی۔ بجز اس کے کہ اس مصرع کا وزن نامانوس ضرور ہے اسی سے مولٰنا کو اس پر ناموزونی کا شبہ ہوا ورنہ معنی

دل دینا

عُشاق ہر صورتِ زیبا کو دِل دے دیتے ہیں۔ شعرا کا دِل ہمیشہ کسی کی زلفِ گرہ گیر میں رہا کرتا ہے داستان گو دِل دینے اور دِل لینے کے افسانے بڑے ذوق و شوق سے سُنایا کرتے ہیں۔ ناول نویسوں کا سارا زورِ قلم اِس کوشش میں صرف ہُوا کہ کیسے کوئی دل دیتا اور کوئی لیتا ہے؟ خلاصہ یہ کہ دِل دینا ایک نہایت ہی آسان شغلہ سمجھ لیا گیا۔ اور ہمارے عاشق مزاج نوجوان دِل ہاتھوں میں لئے پھرنے لگے کہ کوئی اچھی صورت دیکھیں اور حوالے کر دیں۔

مگر افسوس صحیح طور پر نہ آج تک کسی نے دِل دیا۔ نہ کسی نے لیا اور نہ کوئی سمجھا کہ دِل دینا کیا چیز ہے اور کیسے دِل دیتے ہیں۔ صد ہا عاشقوں اور معشوقوں کی داستانیں دِلدہی و دلیری کے دلچسپ نمونے سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن غور کرو تو نہ کسی نے دل دیا نہ کسی نے لیا۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ سچے اور صحیح معنوں میں دِل دینے کا کہیں پتہ نہیں۔

لیکن ہاں یورپ کا ایک واقعہ جو قرونِ وسطیٰ میں پیش آیا تھا وہ البتہ دِل دینے اور لینے کا سچّا معاملہ ہے چونکہ ہمارے عاشقوں اور شاعروں کے کان اس سے نا آشنا ہیں۔ اِس لئے ہم اس واقعے کو اُن کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں کہ لوگ دیکھیں اور سمجھیں کہ دل دینا کیا چیز ہے؟

جن دِنوں صلیبی لڑائیوں کے معرکے در پیش تھے۔ اور بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے لئے سارا یورپ اُمڈا چلا آتا تھا فرانس میں نواب شانپین کے دربار میں ایک بڑا معزز سردار تھا لارڈ کوسی جو خوبصورت اور قابل ہونے کے ساتھ اپنے وقت کا بڑا پاکباز بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں وہاں ایک اور بڑے معزز رئیس تھے لارڈ فائل۔ لارڈ فائل کی نازنین و زہرہ جبین بیوی لیڈی فائل اپنے حسن و جمال اور ناز و انداز کے لحاظ سے سارے ملک میں منتخب تھی۔ اور فرانس کی ساری مہ جبینوں کے حُسن کی شمعیں لیڈی فائل کے آفتابِ رخسار کے سامنے ماند تھیں۔ دونوں کی خوبیوں نے یہ شرمناک کرشمہ دکھایا کہ لارڈ کوسی اور لیڈی فائل ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے۔ اور ناجائز اُلفت نے دونوں کے دل شمعیں روشن کر دیں۔ لارڈ فائل بیوی کے اس شرمناک عشق سے ناواقف نہ تھا

ر کچھ زور نہ چلتا۔

اِسی اثنا میں نواب شانپین تیار ہوا کہ ارض مقدس میں جا کر مُسلمانوں کے مقابلے میں جہاد کرے جو مجاہدینِ فرانس اُس کے ہمراہ روانہ ہونے والے تھے اُن کے زُمرے میں لارڈ کوسی نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ اپنے اِس ارادے کی خبر جب اُس نے لیڈی فال کو کی تو معشوقۂ دلنواز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ روئی اور رلایا۔ مگر آخر ضبط سے کام لیا۔ دِل میں کہا "اچھا ہے۔ لارڈ کوسی کے چند روز باہر رہنے سے لارڈ فائل کی آتشِ رقابت ٹھنڈی پڑ جائیگی۔ اور شاید اُن کی بدگمانیاں دُور ہو جائیں"۔

اِس کے بعد ہنسی خوشی عاشق دلدادہ کو گلے لگا کے رخصت کیا۔ اور کہا لو یہ ہماری الفت و محبت کی یادگاریں ساتھ لیتے جاؤ۔ اور ان کو ہمیشہ اپنے دل سے لگائے رکھنا۔ یہ یادگاریں چند انگوٹھیاں تھیں۔ کچھ جواہرات تھے۔ اور سب سے زیادہ قیمتی ایک نازک ڈوری تھی جس کو لیڈی فائل نے اپنی سنہری زلفوں کے بالوں کو ریشم کے دھاگے میں گوندھ کے بنایا تھا۔ اور اُس کے دونوں سروں پر دو بڑے بڑے موتی گھُنڈیوں کی وضع میں لگے ہُوئے تھے۔ ان دنوں یُورپ کے بانکوں اور فرنگی سرداروں کی وضع تھی کہ اپنے فرغل کو ایک خوب صُورت ڈوری سے خود میں اٹکا لیا کرتے۔ اور اسی مقصد کے لئے لیڈی فائل نے یہ ڈوری خود اپنے ہاتھ سے بنا کے اپنے عاشق کو دی تھی۔ الغرض بصد حسرت و اندوہ عاشق و معشوق جُدا ہُوئے۔ اور لارڈ کوسی نے شانپین کے نواب کے ہمراہ ارضِ مقدس فلسطین کی راہ لی۔

یہ ۵۸۷ھ کا زمانہ تھا جبکہ فلسطین کے مشہور ساحلی شہر عکّہ کا مشہور محاصرہ قائم تھا۔ شہر کے اندر مُسلمان تھے۔ لاکھوں فرنگیوں کی خلقتِ عظیم چاروں طرف سے یورشیں کر رہی تھی۔ اور ان محاصرہ کرنے والوں کو سُلطان صلاح الدین اعظم خشکی کی طرف سے گھیرے ہُوئے تھے۔ خونریزیوں کا سِلسلہ جاری تھا اور مسیحی کسی طرح شہر پر قابو نہ پا سکتے تھے۔

نواب کوسی نے نئے مجاہدینِ فرنگ کے ساتھ ساحلِ فلسطین پر قدم رکھا تو وہ بھی زور و شور سے اصرار کرنے لگا۔ اور ایک دن ایسے جوش و خروش سے دھاوا کیا کہ تیروں پتھروں اور آتش باری کے قمقموں ...ہوا عکّہ کی شہر پناہ کے نیچے جا پہنچا۔ اور سیڑھی لگا کے اوپر چڑھنے لگا۔ فصیل کے اوپر سر... نے تلوار کا ایسا زبردست ہاتھ مارا کہ کاری زخم کھا کے نیچے آ رہا۔ اور لوگ

فوراً خیمے میں اُٹھالے گئے۔

خیمے میں لیٹ کر لارڈ گوسی نے خیال کیا کہ اب میری زندگی کے چند ہی لمحے باقی ہیں۔ ساتھ ہی محبوبۂ جاں نواز یاد آئی اور ارادہ کیا کہ زندگی کے اِن باقیماندہ لمحوں کو اسی کی یاد میں صرف کرے۔ چنانچہ لیڈی فائل کے نام ایک عاشقانہ خط لکھا۔ اور اپنے ایک قدیم وفادار و جاں نثار ملازم کو دے کر کہا "میرے مرنے کے بعد تم فرانس میں جانا اور اس خط کو میری دِلدار مہ جبین کے ہاتھ میں دے دینا۔ اس کے ساتھ یہ تمام چیزیں بھی جو اُس نے مجھے یادگارِ محبّت کے طریقے سے دی تھیں اُسے واپس کر دینا۔ اس کے علاوہ جب میں مرچکوں تو سینہ چاک کر کے میرا دل نکالنا۔ اور اُس کو تیل میں ڈال دینا کہ سڑنے نہ پائے۔ اور اس کو بھی لیجا کر اُسی آفتِ جاں کی نذر کر دینا۔"

یہ وصیتیں کر کے لارڈ گوسی مر گیا۔ اور وفادار ملازم نے ان پر پُورا عمل کیا۔ سفر کر کے فرانس میں پہنچا۔ اور لارڈ فائل کے قصر کے قریب جاکر پھاٹک کے سامنے جنگل میں چھُپ رہا کہ لارڈ فائل کہیں باہر جائے تو قلعہ میں داخل ہو کر اپنے آنجہانی آقا کی امانتیں اُس کی محبُوبہ کے حوالے کرے۔ اِسی انتظار میں کھڑا تھا کہ لارڈ فائل کی نظر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی پہچان گیا کہ لارڈ گوسی کا ملازم ہے اور اپنے آقا کا کوئی پیام لے کر میری بیوی کے پاس آیا ہے۔ غیظ و غضب کے ساتھ اُس کے سر پر جا پہنچا اور کہا "سچ سچ بتا یہاں کس لئے آیا ہے ورنہ تیری جان کی خیر نہیں۔" ملازم نے قسمیں کھا کر کہا "میرے مالک تو ارضِ مقدس میں مُسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے اب پیام دینے والا کون ہے؟" لارڈ فائل کو اس کا یقین نہ آیا۔ سمجھا کہ فضول باتیں بنا رہا ہے۔ تلوار میان سے کھینچ کر اُسکے سر پر بلند کی اور ڈپٹ کے کہا "بتا ورنہ سر زمین پر پڑا لوٹتا ہوگا۔" خادم سہم گیا۔ ہوش و حواس جاتے رہے۔ اور جان کے خوف سے ساری باتیں قبول دیں جو چیزیں ساتھ لایا تھا اُس کے سامنے رکھ دیں۔ اور لارڈ گوسی کا خط بھی اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔

خط پڑھ کر لارڈ فائل کے غصّے کی اِنتہا نہ تھی۔ اور جوشِ غضب میں ارادہ کیا کہ بیوی سے ایک نئے طریقے کا اِنتقام لے۔ فوراً قصر میں آکر اپنے باورچی کو بُلایا۔ اور وہ لارڈ گوسی کا دِل اُس کے ہاتھ میں دیکر کہا "اِس کو اور گوشت میں ملا کر بہت اچھے نفیس کباب پکاؤ۔" کباب لیڈی فائل کی نہایت ہی مرغوب غذا تھی۔ جیسے ہی پک کر آئے لارڈ فائل نے میز پر بیٹھ کر اُن کو بیوی کے سامنے پیش کر کے کہا "تمہارے شوق کے مطابق اِن کو بڑے اہتمام سے پکوایا ہے۔" بیوی نے اُن کبابوں کو بڑ۔

لے لے کر کھایا۔ اور جب کھا چکی تو میاں نے ایک زہرخند کے ساتھ پوچھا "کیسے پکّے ہیں؟" جواب ملا کہ "بہت اچھے پکّے ہیں۔ اور مجھے بہت مزہ آیا" کہا "ہاں یہ مزہ آنے کی چیز ہی تھی۔ تمہارے مرغوب ہونے ہی کے خیال سے میں نے اسکو بڑی کوشش سے تیار کرایا۔ اور تمہیں پسند کیوں نہ آتا؟ یہ خاص لارڈ گوسی کا دِل تھا جس کی قدر تم سے زیادہ کون کرے گا؟" لیڈی فائل کو اس کا یقین نہ آیا مگر جب میاں نے ساری سرگزشت من وعن بیان کردی۔ اور بیوی کے دئیے ہُوئے یادگارِ محبت تحفوں کے ساتھ لارڈ گوسی کا خط بھی نکال کے سامنے رکھ دیا تو کانپ گئی۔ اور یقین آیا کہ شوہر نے جو کچھ کہا سچ ہے۔

اُس کے خون شدہ دُکھے دِل پر یاس و نامرادی کا ہجوم ہُوا۔ مگر ضبط کیا۔ اور استقلال کے تیوروں سے بولی "ہاں سچ کہتے ہو۔ یہ دِل میرا محبوب تھا۔ کیونکہ یہ محبّت کرنے کے قابل دِل تھا اور کبھی اس سے زیادہ شریف دل نہیں دیکھا گیا تھا۔ اور میں نے چونکہ ایسا اچھا اور شریف گوشت کھایا ہے اور میرا معدہ ایک ایسے بہترین اور قیمتی دِل کا مقبرہ بن گیا ہے لہذا اب میں کوئی اس سے کم درجے کی چیز نہ کھاؤں گی۔ نہ اس اچھے دِل کو کسی ذلیل چیز سے آلودہ کر کے ناپاک کروں گی" یہ کہتے کہتے پُرحسرت زبان رُک گئی۔ اُٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے دروازہ بند کر کے بیٹھ رہی۔ دوستوں۔ عزیزوں۔ ملازموں اور خود شوہر نے لاکھ کہا اور قسمیں دلائیں مگر دروازہ نہ کھولا۔ یہاں تک کہ اسی رنج میں فاقے کرتے کرتے چوتھے روز مُلکِ عدم کی راہ لی۔

محمد عبدالحلیم شرر

قابلیت اک ذمہ داری ہے۔ قوّت کے ذرّے ذرّے میں فرض پنہاں ہے!

۔۔۔ آدمی کی ہمت نرم لفظوں اور پختہ کاموں میں نظر آتی ہے۔

۔۔۔ جو کسی نے کیا ہو۔

اِن ننھے روشن کھلونوں میں کیا وہ روشنی عیاں و پنہاں ہے جسے میری تاریک و نابینا قسمت ڈھونڈتی ہے؟
کیا وہ عصمت ہویدا و پوشیدہ ہے جسے میرا گناہ آلود ضمیر تلاش کیا کرتا ہے؟
کیا وہی راز منظور و مستور ہے جس کے لئے میرا نفس خراب و خستہ حال ہو رہا ہے مگر سرگشتگی سے پناہ کہیں نہیں؟ ــــــ اور اگر یہ نہیں تو پھر تاروں کی اس دُنیا میں اَور کیا ہے جو مجھے اپنی سمت کھینچتا ہے؟

یہ میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا سب سے اٹل جذبہ جذبۂ عشق اور کائنات کا صادق ترین جلوہ جلوۂ حسن ہے۔ اور مجھے اِس کا اِحساس بھی ہے کہ جب میں اِن دُور دراز روشنیوں پر نگاہ دَوڑاتا ہوں تو میری محبّت تلاطم میں آجاتی ہے اور میری ساری زندگی درہم برہم نظر آنے لگتی ہے! اُس وقت میرا دل جان لیتا ہے کہ اُس نے قابلِ حصول آرزؤں کے تعاقب میں قوتِ ضبط کو کھو دیا، اپنی انمول فطرت کو سیم وزر کے بدلے بیچ ڈالا۔ اور محبّت کو جہاں مروت کا نام و نشان تک نہ تھا بکھیر دیا!
اِک عُمر یُونہی کٹی کہ میں نے محبّت کو غرض کے ساتھ ہمکنار پایا، وفا کو جفا سے دو چار ہوتے دیکھا، ضمیر کو اپنے ہی نفس سے دست و گریباں ہوتے نظّارہ کیا! میرے دن یُونہی گذر گئے! ــــــ افسوس!
ــــــ لیکن صد شکر کہ اِک تنہا سامانِ انبساط میرے لئے باقی ہے کہ ہنوز میری راتیں اُن حسین روشنیوں سے معمُور ہیں جن کے پر تو نے دلِ حزیں میں اک اچھوتی آرزو پیدا کر دی! میں نے جان لیا کہ آرزو حصول کے لئے نہیں کہ عشق حقیقی وہ ہے جو وصل سے نا آشنا رہے کہ حیاتِ اِنسانی کا صحیح سکون سکونِ اضطراب ہے!!
میں نے جانا کہ سچّی کشش وہ ہے جو ہمیشہ دِل کو اپنی طرف کھینچتی رہے! سچّی آرزو وہ ہے جو تکمیل کی متجسس نہ ہو اور سچّی محبّت وہی ہے جو مدعائے محبّت کے لئے جدوجہد کرتی رہے اور اس جدوجہد ہی کو مآلِ حیات تصور کرے!!

بشیر احمد

مَیں کیا ہوں ؟

پھُولوں سے بار ہا پُوچھا۔ سُنا، سمجھا سب نے۔ گردن ہلاتے بھی نظر آئے مگر ہمیشہ مُسکرا کر چُپ رہے۔ اے ظریف طبع پری زادو! تمہیں سب کچھ معلوم ہے مگر تم بتاتے نہیں +

بادلوں سے۔ کن بادلوں سے؟ وہ جو شبِ ماہ میں چاندنی کی جھولیاں بھر بھر بچپن کی ادا لئے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں بار بار یہی سوال کیا مگر وہ ہمیشہ یہ کہہ کر کہ پھر ملیں گے تو بتائیں گے ٹالتے رہے۔

تاروں سے۔ اُن پیارے تاروں سے جن کی پیام محبوب رساں کرنیں ولولہ انگیز ہی تخیل پروری کی سحر کاریاں کرتی ہیں برسوں یہی تکرار رہی مگر نتیجہ ندارد!

پھُولوں میں، بادلوں میں، تاروں میں ایک ہی سازشِ خموشی کا اثر ہے۔ یہی میرے دوست ہیں اور یہی دلدادۂ حسنِ ستم روائی!

کیا کروں! کس سے پوچھوں؟

ہاں! وہ ایک بھولی بھالی لڑکی پانی بھرنے لئے گاگر سر پر تولے ہُوئے دامنِ کوہ والے چشمے کی طرف خوشی خوشی جا رہی ہے۔ کیا مجھے معلوم ہوتا ہے یا واقعی زمین اُس کے پاؤں چُوم رہی ہے؟ نہیں نہیں! سچ مچ پگ ڈنڈی کے اِدھر اُدھر کے پھُول اُس کی طرف جُھک رہے ہیں۔ اے لو! دیکھو! وہ چھوٹی چھوٹی شرمیلی جھاڑیاں جھوم جھوم کر اُس پر نظر کا دم کر رہی ہیں۔ اُسے دیکھ کر ایک کبوتر نے خوشی سے بازی لگائی۔ چڑیاں ناچ کرنے لگیں +

ارے! ایک دلیر تنکے نے لپک کر اس کا دامن جا لیا۔ ہیں ہیں وہ اسے کیا کہہ رہا ہے؟

تنکا:۔ "آپا تم کل کیوں نہ آئیں؟

لڑکی:۔ لو! اُلٹی بات۔ مَیں تو کل آئی تھی، تم میں سے کوئی تھا ہی نہیں!

"یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے؟ آپ نے کل وہ برقع پہن لیا ہوگا جس کی تاثیر سے بھولی لڑکیاں اوجھل ہو جاتی ہیں۔

لڑکی۔ کیسا برقع؟

تنکا۔ بی آپا بُرا نہ مانو تو صاف صاف کہہ دوں۔

لڑکی۔ (مُسکراکر) بھائی! تمہاری دِل لگی کی عادت نہ گئی۔ میں اور تمہاری بات کا بُرا مانوں؟

تنکا۔ بی آپا۔ اِس بُرقع کا نام خود بینی ہے۔

ارے غضب پھر تم نے وہی پہنا۔ اچھا رخصت!

یہ کیا ہُوا؟ پھُول تنکے۔ جھاڑیاں کبوتر چڑیاں سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ اس بھولی لڑکی کو اب کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ چلوں اس لڑکی سے پوچھوں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ نہیں کیا پوچھنا ہے۔ نہ اس کی وہ چال ہے نہ وہ نگاہ ہے۔ یہ پل کی پل میں کیا طِلسمات کا کھیل ہُوا۔ وہی دامنِ کوہ، وہی گاگر مگر لڑکی بدل گئی۔ لو نیا گُل کھِلا۔ گاگر میں اور پانی میں باتیں ہونے لگیں۔

چشمے کا پانی:۔ کب سے تمہاری راہ تک رہے ہیں۔ دیر سے بلا رہے ہیں کہ تم آؤ اور ہم تمہاری گود میں شہر کے گھروں کی سیر کر آئیں۔ لو آؤ۔ اُٹھا بھی لو۔ ہم اور تم مل کر گائیں گے۔

گاگر:۔ مجھے تمہارے بغیر کب چین آتا ہے۔ آؤ شوق سے مگر ذرا میں بھی تو نہا لوں۔

کیا خوب! پھر سین بدلا۔ پھر وہی اصلی لڑکی ہے۔ گاگر کو مانجھ رہی ہے۔ گاگر خوب جھمجھانے لگی۔ چشمے کا پانی تالیاں بجانے لگا کہ آپا آئیں آپا آئیں۔ چلوں اب اس لڑکی سے پوچھوں کہ مَیں کیا ہوں؟

مَیں:۔ کیوں بُوا؟ میں کیا ہوں؟

لڑکی:۔ کانوں میں اُنگلیاں دیجئے تب میں بتاؤں۔

اس لڑکی کی پانی کی۔ ہوا کی آواز اس وقت ایک ہے! میرے جِسمانی کان بند ہو گئے۔ آنکھیں بھی! مَیں مَیں نہیں ہوں اور یہ سُن رہا ہوں:۔

پانی۔ ہوا۔ لڑکی۔ پھُول۔ تنکے۔ (ایک زباں ہوکر) آپ دیوتا ہیں۔ بلکہ اِس سے بھی بالاتر۔ آپ کچھ بھی نہیں بلکہ اس سے بھی کمتر۔ انحصار صرف اس بات پر ہے کہ آپ کی نیت کیا ہے۔ اے عزیز اپنا دھوبی آپ بن اور دل کو دھو ڈال۔ قلی بن اور نیکی کی گٹھڑی اُٹھا۔ خود پسندی چھوڑ

جگ پسند بن۔ سمجھ سمجھ! خدمت کو ایمان۔ ایمان کو جان"!!

بات تو صرف اِتنی تھی کہ میں گزر رہا تھا اور میں نے معمولی طور پر ایک بھری گاگر کو سر پر دھروانے میں مدد دی۔ اس ایک ثانئے میں اِتنا ڈراما کِس طرح ہو گیا؟ مگر میں نے حقیقتاً سب کچھ دیکھا۔ سب کچھ سُنا۔

مَیں بعض دفعہ آناً فاناً کِس طرح بدل جاتا ہوں۔ کیا میری بیداری غفلت ہے اور میرے یہ کبھی کبھی آنے والے خواب حقیقی بیداری؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا ہوں؟

یہ تم سے نہ ہو گا

نہیں! کلیوں کو شگفتہ کرنا، یہ تم سے نہ ہو گا!

کلی کو ہلاؤ، اُسے جھٹک دو لیکن یہ تمہارے بس میں نہیں کہ اُسے شگفتہ کر سکو۔ تمہارا مَس اُسے خراب کر دیتا ہے تم اُس کی پنکھڑیوں کو پاش پاش کر دیتے ہو اور پھر اُنہیں خاک پر منتشر کر دیتے ہو لیکن نہ اُس میں رنگ آتا ہے اور نہ خوشبو پیدا ہوتی ہے۔

آہ! کلیوں کو شگفتہ کر دینا، یہ تم سے کبھی نہ ہو گا!

وہ جو کلی کو کِھلا سکتا ہے کس سادگی کے ساتھ اُسے کھلاتا ہے۔ وہ صرف اُسے اک نظر دیکھتا ہے اور خونِ حیات اُس کلی کی رگوں میں دوڑ جاتا ہے۔ اُس کے نَفَس پر پھُول اپنے پر پھیلا دیتا ہے اور ہوا میں پھڑپھڑاتا ہے۔ رنگ دل کی اُمنگوں کی طرح اُس میں بھر جاتے ہیں اور خوشبو اک شیریں سا راز آشکار کر دیتی ہے۔

وہ جو کلی کو کِھلا سکتا ہے کس سادگی کے ساتھ اُسے کِھلاتا ہے!

بشیر احمد

بزمِ تحقیق

اِس عنوان کو بھی ہم مستقل کرنا چاہتے ہیں اِس کے ذیل میں اُردو زبان کے متعلق تحقیق طلب سوال اور اُن کے محققانہ جواب درج ہُوا کرینگے۔ کسی خاص مسئلہ زبان پر مشاہیر اہلِ زبان کے خیالات باہمی اختلافات پھر اُن پر محاکے شایع ہوں گے۔ ذیل میں اُردو زبان کے اہل الرائے کی توجہ منعطف کرنے کی غرض سے چند سوالات درج کئے جاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ماہرینِ زبان اپنے گرانقدر خیالات سے مستفید فرمائیں گے!

(۱)۔ اُردو زبان کو ہندوستان کی مشترکہ مُلکی زبان قرار دینے کے لئے اسکو وسعت دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہر قسم کے خیالات۔ مضامین۔ دقیق سے دقیق علمی مسئلے اس کے ذریعہ سے بطورِ احسن بیان کئے جاسکیں، دوسری علمی زبانوں کے ترجمے اس شان سے اُردو میں ہوں کہ اصل زبان کا زورِ کلام، فصاحت و بلاغت، لُطفِ ادا ظاہر ہونے کے ساتھ ہی اردو بھی اپنی صفات سے اجنبی ہوجائے،

اس مقصد اہم کے حصول کے لئے ضرورت ہے کہ

ا۔ اُردو مصادر کو وسعت دی جائے۔

ب۔ الفاظ کی صفاتِ مقررہ کی حدود وسیع کی جائیں۔

ج۔ تشبیہات کو طویل الذیل بنایا جائے۔

د۔ اُردو گرامر کی محدود چار دیواری کو منہدم کرکے حدِ نظر تک محیط قلعہ تعمیر کیا جائے۔

ہ۔ دِلّی اور لکھنو کی بیجا بندشوں سے اُردو کو آزاد کرکے لامرکزیت کے اصول رائج کئے جائیں۔

و۔ اُردو نظم کو معینہ بحور و اوزان میں محدود رکھنے کی بجائے بلینک ورس اور اسی قسم کی نثر نما نظموں کو رواج دیا جائے۔

(۲) (الف)۔ اُردو گرامر کی رُو سے غیر فارسی و غیر عربی لفظ کی اضافت فارسی و عربی لفظ کی طرف نہیں ہوسکتی اسی طرح اس کے برعکس اِس مسئلہ میں اِس قدر غلو سے کام لیا جاتا ہے کہ وہ عربی و فارسی الفاظ جن کے ہندی استعمال میں ذرا سا اختلافِ حرکت و لہجہ پیدا ہونے کی وجہ سے انہیں مُہنّد کا خطاب دیا جاتا ہے اُن کی اضافت بھی جائز نہیں مثلاً لفظ "موسم" بکسرۂ سین عرب نژاد ہے۔

"صادف موسم الخیف مهمان الضیف"

اُردو میں "موسم" بفتح سین استعمال ہونے کی وجہ سے یہ مُہنّد ہوگیا ہے اور اس کی اضافت بصورتِ مُہنّد جائز نہیں چنانچہ مرہمِ گل کا قافیہ اگر موسمِ گل باندھا جائے تو غلط سمجھا جاتا ہے کیونکہ اضافت کی حالت میں موسِم مُوہِم کا ہمقافیہ ہوگا نہ کہ مرہم کا۔

(ب)۔ وہ اسمِ صفت جو کسی اسم و امر کی ترکیب سے بنایا جاتا ہے جیسے دل دار۔ دُوربیں۔ اِس کے متعلق بھی یہی حکم ناطق ہے کہ اس مرکب میں امر کے جو اسم ہو عربی یا فارسی ہونا ضرو

ہے کہ ان سختیوں کو کسی اصول کے ماتحت کم کیا جائے۔ سوال کے دونوں پہلوؤں پر غور کی بہت گنجایش ہے۔

حصہ (الف) میں سائل کے منشا کی تائید "لبِ سڑک"۔ "مزدور پارٹی" "آبِ رواں" "لیگ اقوام" "ایڈیٹر زمیندار" وغیرہ الفاظ کرتے ہیں۔

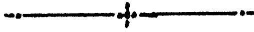
یہ الفاظ روزمرہ میں داخل ہو کر فصحا کی زبانِ قلم و دہن پر بھی قابض ہو چکے ہیں۔ سامعہ کو حَکَم بنا کر ایسے بہت سے مرکب تراشے جا سکتے ہیں۔ جنہیں کثرتِ استعمال کچھ دنوں میں فصیح بنا کر اُردو لغات میں معتد بہا اضافہ کرے گی۔

حصہ (ب)۔ پر عملدرآمد کی سفارش الفاظِ ذیل کا استعمال کر رہا ہے۔

سمجھ دار۔ لچھے دار۔ لٹو دار۔ گاڑیبان وغیرہ

(۳)۔ سنسنی خیز۔ رہایش۔ فوق البھڑک۔ ہر سہ الفاظ بالا کو کثرتِ استعمال نے قبولیت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زبان سے بولنے والے اِن سے دلوں کو بھی صاف کر لیں۔

(۴)۔ لفظ صحیح بروزنِ فعیل ہندوستان کی علمی دُنیا میں بھی اب صرف زبانِ قلم پر باقی رہ گیا ہے۔ بولنے والی زبان اس سے قطع تعلق کر چکی ہے۔ اُن مٹھی بھر مذہبی عُلما کو چھوڑ کر جو اپنے روزمرّہ میں حروفِ حلقی کو حجازی لہجہ میں ادا کرتے ہیں فصحائے اُردو میں سے غالباً کوئی متنفس بھی "صحیح" کو فعیل کے وزن پر نہیں ادا کرتا بلکہ صحی بوزن نفی استعمال ہوتا ہے تو کیا اردو کو مستقبل کی عام ملکی زبان بنانے کی غرض سے اس قسم کے الفاظ کی کتابت کو مروجہ تلفظ کے مطابق بنایا جا سکتا ہے؟



میں چاہتا ہوں کہ ان معروضات پر وسیع الخیالی کو پیشِ نظر رکھ کر اہلِ ادب غور فرمائیں۔

جوابات مختصر۔ مدلل۔ متین ہوں اور تحریر سے مکابرہ کی شان نہ پیدا ہوتی ہو۔

حضراتِ ذیل سے خاص طور پر توجہ فرمائی کی درخواست ہے:۔

علامہ طباطبائی لکھنوی۔ مولانا شوق قدوائی لکھنوی۔
مولانا شاداں لکھنوی۔
حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی۔
لالہ سری رام ایم اے مولف خمخانۂ جاوید۔
مولانا وحید الدین سلیم (عثمانیہ یونیورسٹی)
مولانا عبد الحق بی اے۔ (انجمن ترقی اردو)
پنڈت برج نرائن چکبست مدیر صبح امید۔
حضرت بیخود دہلوی۔

تاجور

محفلِ ادب

یورپ کے علم وفن پر اسلام کا اثر

مسٹر ایچ اے سلمین سی۔ آئی۔ ایم پروفیسر عربی کنگس کالج لنڈن اپنی تصنیف "سلطنت عرب کا عروج وزوال" میں ایک جگہ علم وفن کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اس مادہ میں نئی روح پھونکنے کا فخر صرف عربوں کو حاصل ہے۔ یہ عرب ہی تھے جنھوں نے گم شدہ یونانی مصنفوں کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اہل عرب نے علم کی وہ شمع روشن کی جس نے تاریخ کے سیاہ صفحوں کو چمکا دیا۔ اور یقیناً اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تاریخ اتنی شاندار نہ ہوتی"۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ قوموں کی علمی ترقی بجائے تصنیفات کے تراجم وتالیفات سے شروع ہوتی ہے اور عرب کے فضلا اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ وہ دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ترجموں کی بدولت سنسکرت اور یونانی مُصنّفوں کو جن کو دُنیا بھول جانے والی تھی زندۂ جاوید بنایا اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ یونانی فلسفہ کو ترقی دی۔ جبرو مقابلہ۔ علم ہیأۃ۔ علم نباتات وغیرہ کو ایجاد کیا اور انتہائی درجہ تک پہنچایا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد ۱۶ صفحہ ۵۹۶) نے اقرار کیا ہے کہ الخوارزمی کی تصنیفات نے یورپ والوں کے لئے جو الجبرے کے نکات حل کرنا چاہتے تھے رہبر کا کام دیا۔ موجودہ علم کیمیا ابو موسےٰ جعفر کوفی کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے"۔ (عبرت)

ہندوستان اور چین کا سیاسی رفارم

اس عنوان کے تحت میں معاصر "صوفی" نے صدرِ جمہوریۂ چین کی سیاساتِ حاضرہ پر ایک تصنیف کا دلچسپ اقتباس درج کیا ہے سطور ذیل اُسی روشنی کا عکس ہیں۔

"ہم لوگ چین میں اپنی گورنمنٹ کو موجودہ تہذیب کے معیار پر لانا چاہتے ہیں اور قریب قریب یہی حال ہندوستان کا ہے جہاں کی پرجوش نوجوان جماعت حکومت و نظام حکومت کے لئے مغربی معیار کو پیش نظر رکھتی ہے۔ لیکن یہ ایک اصولی غلطی ہے کیونکہ قومیت کا سیاسیات و نظامِ حکومت کا اختلاف ہے۔ اور مشرق میں وہی حکومت باعثِ امن وخیز ہو سکتی ہے جو مشرقی تہذیب کی حامی ہو۔ جس طرح مغ[illegible] کی حکومت مغرب تہذیب کے دوش بدوش ترقی کر سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ جو ملک [illegible] وہ اپنی ہی زمین کے تجربات ومشاہدات، اپنی ہی قوم کے دیرینہ روایات [illegible]خلاق و[illegible]

قایم کرے۔ ورنہ حقیقتاً اختلافِ مذاق اک ایسا اختلاف ہے کہ باوجود تمام کوششوں کے اُن میں تصادم ہو جانا ضروری ہے" ۔

(صوفی)

مرنے کے بعد ذیل میں مشہور ہندی شاعر ہریش چندر کی اک دلگداز ہندی نظم کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے :-

مرنے والے کا چہرہ وہی ہے جسے زندگی میں چاند کا لقب دیا جاتا تھا۔

وہی بازو ہیں جن سے بہادری کے بڑے بڑے کارنامے ظاہر ہوئے ۔ آہ ! وہی پاؤں ہیں جن پر بہت سی پیشانیاں جُھک جاتی تھیں ۔ وہی سڈول جسم وہی سحر کار زبان جس کی شیرینیٔ گفتار امرت کا کام دیتی تھی وہی ہاں وہی دل و دماغ ہے جس میں عالی جذبات اور بلند ترین خیالات جگمگا رہے تھے۔ سب چیزیں وہی ہیں۔ صرف اک جان کی گم شدگی سے وہی پیارا جسم زمین پر پڑا ہوا ہے۔ آہ زندگی میں جس کو سب پیار کرتے تھے جو سب کے دل لبھاتا تھا صرف ایک جان کے نہ ہونے سے اسے سب دہکتی ہوئی آگ میں جلانے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ اُف جن کی نزاکت پھول کے بوجھ کی بھی متحمل نہ تھی جنہیں دردِ سر کی بھی سہار نہ تھی آج ان کے جسم پر بھاری بھاری لکڑیوں کا ڈھیر ہے۔ انکے سروں کی کپال کریا ہو رہی ہے ۔ جنھوں نے اپنے عزیز و اقربا کو کبھی نہ چھوڑا تھا آج سب انہیں چھوڑے جاتے ہیں۔ آہ وہ آنکھیں چیل کوؤں کی غذا بن رہی ہیں۔ جن کی جنبشِ التفات کبھی بڑے بڑے راجاؤں کی اُمیدوں کا مرکز تھی۔ جو اپنی بہادری اور فتوحات کی وجہ سے ساری دُنیا میں بھی نہیں سما سکتے تھے آج دو گز کفن میں مُنہ چھپائے پڑے ہیں۔ اب راجا اور پرجا کا کوئی فرق نہیں رہا وقت نے سب کو ایک ہی نظر سے دیکھا۔ اِس وقت خوبصورت و بدصورت ۔ امرت اور زہر۔ ایک ہی قیمت رکھتے ہیں راجہ پرو اور راجہ دد ہیچ موت نے کسی کا نشان نہیں چھوڑا۔

صرف کتابوں میں نام کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔

(ستیہ ہریش چندر)

قومیت کیا ہے ؟ ہم نے ممالک غیر کے اخبارات و ادبی رسایل منگائے ہیں اُمید ہے کہ آیندہ نمبروں سے عراق عرب مصر۔ و ایران کے جرایدکا بہترین انتخاب زینت افروز ہمایوں ہُوا کریگا۔ گاہے ماہے مرہٹی، ہندی، بنگالی کی ادبی کانوں کے درخشاں جواہر بھی نظر نوازی کیا کرینگے ۔

ھر نے اپنے تازہ ترین نمبر میں قومیت کیا ہے ؟ کے عنوان سے ایک جاذبِ نظر مقالہ شایع کیا کی تنگ دامانی کو اس کی تمام فرو فزانیوں کے لئے ناکافی دیکھ کر اس کا مختصر اقتباس

ہدیۂ التفات کرتے ہیں :

"افرادِ انسانی کے ہر مجموعہ کو گروہ اور قوم کا خطاب نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ قومیت کا اعتبار افراد سے نہیں بلکہ اُن رابطوں سے ہوتا ہے جو افراد کو باہم منضبط کرتے ہیں۔ اور حقیقتہً انہیں روابط سے افراد میں روحِ قومیت پیدا ہوتی ہے۔ ان ہی کے قوت وضعف سے کوئی قوم ترقی یافتہ و تنزل پذیر کہلاتی ہے یہ رابطے گویا شعورِ قومی ہیں۔ قومیت اس شعورِ قومی کے سوا ہیچ ہے۔ یہ شعور افراد میں یگانگت پیدا کرکے ان میں یہ سمجھنے کا احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت ہیں جس کی زندگی باہم مشترک ہے۔ اس حیاتِ مشترک کی حفاظت پر وہ جان و مال قربان کر دینے میں مضایقہ نہیں سمجھتے۔ پھر یہ رابطہ یا شعورِ قومی جن اسباب سے پیدا ہوتا ہے جن امور کے وجود پر اس رابطہ کا ظہور موقوف ہے ان میں سب سے اہم ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱)۔ اتحادِ جغرافی (۲) اتحادِ جنسی (۳) اتحادِ لسانی (۴) اتحادِ مذہبی (۵) اتحادِ تاریخی ..... الخ

ہندوستانیوں کی اہم ضروریات مسٹر کے۔ ایل۔ رلیارام ہماری اہم مُلکی ضروریات بیان کرتے ہُوئے سب سے پہلے اشاعتِ تعلیم پر زور دیتے ہیں :۔

آج ہندوستان میں چار دیہات میں سے صرف ایک گاؤں میں اسکول ہے اور تیس کروڑ بچے جنہیں اوائل عمر میں تعلیم ملنی چاہیئے ان پڑھ رہتے ہیں + ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق اکتیس کروڑ پچاس لاکھ ہندوستانیوں میں سے صرف ایک کروڑ پچاسی لاکھ اشخاص جن میں ایک کروڑ اُنہتر لاکھ مرد اور سولہ لاکھ عورتیں تھیں پڑھے ہُوئے تھے جس سے ۸،۵ فی صدی کی تعلیمی اوسط نکلتی ہے + اس کے مقابل میں جاپان کی اوسط ۹۵ فی صدی برطانیہ کی ۹۴ فی صدی اضلاع متحدہ (امریکہ) کی ۹۰ فی صدی ہے + برطانوی ہند میں ابتدائی تعلیم کے ۱،۴۲،۲۰۳ اسکول ہیں جن میں ۵،۸۱،۴۷،۰۳ طلبا پڑھتے ہیں۔ ان میں ۵۱،۸۸،۴۱۱ لڑکے اور ۶،۴۳،۳۱۹ لڑکیاں ہیں + اگر ہم ہر قسم کی درس گاہیں شمار کریں تو آبادی کے ہر ۱،۷ اشخاص کے حِصّے میں صرف ایک درس گاہ آتی ہے + زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں اسکول میں پڑھنے والے اشخاص آبادی میں ۱۵ سے لے کر ۲۰ فی صدی تک ہیں + صنعتی تعلیم کا حال تو سخت افسوسناک ہے۔ ۱۸-۱۹۱۷ء میں سارے مُلک میں صرف ۱۶،۵۹۴ اشخاص صنعت و حرفت کی تعلیم پا رہے تھے + اسی تعلیمی کمی کی وجہ ہے کہ اخباروں رسالوں کی مانگ مُلک میں کم ہے۔ ۱۸-۱۹۱۷ء میں صرف ۳۹۷۸ اخبارات و رسائل تھے + ہندوستان میں دس لاکھ اشخاص کے حِصّے میں ان کی اوسط ۱۲ برطانیہ میں ۱۹۰ جاپان میں ۵۰ اور اضلاعِ متحدہ میں ۲۲۵ ہے +

مُلک کی دوسری بڑی ضرورت زراعت کی ترقی ہے +

موجودہ ہندوستان کے لئے یہ امر باعثِ ننگ ہے کہ حالانکہ اُس کی آبادی کے تین چوتھائی حصے کا صرف زراعت پر گذران ہے لیکن تاحال اس کام کے لئے دُنیا کے جدید تریں ایجادات کو مُلک میں رائج نہیں کیا۔ بلکہ اُنہیں دقیانوسی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں +

صحتِ عامہ کی بہتری ایک اَور ضروری چیز ہے +

یہ امر مُسلّمہ ہے کہ شہروں اور قصبوں میں حفظانِ صحت کا انتظام شرمناک ہے + پچھلے دس سالوں کی شرحِ موت کی اوسط ۸ء۳۱ رہی ہے اِس مدت میں جاپان کی اوسط ۹ء۲۱ کینیڈا کی ۱۲ء۱۵ برطانیہ کی ۱۴ء۶ اضلاعِ متحدہ کی ۱۴ء۰ اور آسٹریلیا کی صرف ۱۰ء۵ ہے + یہ بات دلچسپی کا موجب ہو گی کہ ایک ہندوستانی کی اوسطِ عُمر ۲۳ برس ہے جب کہ مغربی ملکوں میں یہ اوسط ۴۵ سے لے کر ۵۵ تک پہنچ جاتی ہے +

(دینگ مین آف انڈیا)

شذرات

عام طور پر ادبی رسالے ناقدری کے ہاتھوں نالاں رہتے ہیں۔ ادبیات کی کساد بازاری کے افسانے اس درجہ حوصلہ سوز ہو چکے ہیں کہ کسی نئے کام کرنے والے کو اس میدان میں قدم رکھتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ "ہمایوں" کو شائع ہوئے ابھی بیس روز نہیں ہوئے اور اس وقت خریداروں کے رجسٹر میں آخری خریداری نمبر چھ سو اکتیس ۶۳۱ تک پہنچ چکا ہے دو سو ۲۰۰ سے اوپر تو صرف لاہور میں خریدار ہو گئے۔ آثار ترقی کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین تو نہیں البتہ ظنی اعتماد ہے کہ چھٹے ساتویں نمبر تک ہمایوں کی بارہ پندرہ سو تک اشاعت ہو جائیگی۔ پہلی ہی اشاعت میں چھ سو اکتیس ۶۳۱ خریداروں کا بہم پہنچ جانا قابلِ رشک ضرور ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئیے کہ آمد و خرچ میں یکسانیت کا کوئی امکان پیدا ہو گیا ہے۔ بارہ سو کی اشاعت تک رسالہ نقصان ہی پر چلتا رہیگا +

بہت سے گرامی قدر معاونین کا عموماً اور خان عبدالرحیم صاحب بار ایٹ لا ممبر لیجسلیٹو اسمبلی۔ سید علی منظر صاحب بار ایٹ لا (پٹنہ) ڈاکٹر حسن سہروردی پی ایچ ڈی ممبر لیجسلیٹو اسمبلی (بنگال) سید محمد سلیم بی اے بار ایٹ لا۔ ڈاکٹر ولی محمد صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی۔ شیخ نور احمد صاحب بار ایٹ لا (دہلی)۔ ایم عبدالمجید صاحب اختر بی اے۔ میاں محمد اسلم صاحب منصف (لاہور) کا خصوصاً شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ ان حضرات نے بلا تحریک "ہمایوں" کی اشاعت میں سرگرم حصہ لیا اول الذکر محترم نے پچاس کے قریب اور ثانی الذکر کرم نے بیس خریدار عنایت فرمائے۔

جنوری کے "ہمایوں" میں فروری نمبر کے اہلِ قلم کی فہرست دیگئی تھی۔ ان میں سے اکثر حضرات کے مضامین موصول ہو چکے تھے اور کچھ مضامین آنیوالے تھے۔ اسلئے اس امر کا اندازہ کئے بغیر کہ مندرجہ فہرست اہلِ قلم کے مضامین ایک نمبر میں سما بھی سکینگے۔ فہرست شائع کر دی گئی۔ فروری نمبر کو ترتیب دیتے وقت یہ تجربہ بھی ہوا کہ مستقبل کے لئے کوئی وعدہ بے سوچے سمجھے نہیں کرنا چاہئیے۔ مندرجہ بالا فہرست اہلِ قلم کے مضامین دو رسالوں میں بھی مشکل سے سما سکینگے۔

مشاہیر اہلِ قلم کی گرانقدر توجہ کا ہم شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ انکی بیکراں توجہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج جنوری کی ۲۴ تاریخ ہے اور ہم جون تک کے رسالے ترتیب دے چکے ہیں +

"بزمِ تحقیق" کے متعلق جو حضرات کچھ تحریر فرمائیں اُن سے مودبانہ درخواست ہے کہ حد سے زیادہ اختصار سے کام لیں کیونکہ دوسرے مضامین کی کثرت نے "بزمِ تحقیق" کو "چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ" کا حکم سنا دیا۔ ہ۔ م +

(تاجور)

حصۂ نظم

کلامِ اکبر

سکوں ہوتا نہیں دل کو مرادیں بر نہیں آتیں　　یہ آہیں عرش تک جاتی تو ہیں کچھ کر نہیں آتیں
شبِ غم کو بسر کر صبحِ راحت کی امیدوں میں　　بلاؤں سے نہ ڈر۔ خاموش رہ۔ کس پر نہیں آتیں
ہماری گردنیں تو صرف مسجد ہی میں جھکتی ہیں　　مگر دیکھیں کہ یہ کب تک تہِ خنجر نہیں آئیں

(غیر مطبوعہ)

رباعیاتِ گرامی

ذیل میں مولانا گرامی کی چند روح فرد زر باعیاں درج کی جاتی ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ رباعیاتِ گرامی کے بالمقابل سحابی نجفی عمر خیام۔ ابو سعید۔ سرمد جامی کی ہم مضمون رباعیاں شایع کر کے ان پر محاکمہ کی خدمت نقادانِ سخن کی رائے کے سپرد کر دیں مگر افسوس ہے کہ اس مرتبہ ہم اس ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے کیونکہ ابو سعید کی رباعیات (مرتبہ پروفیسر کشوری موہن صاحب بترا ایم اے) زیر طبع ہیں اور سرمد کی رباعیات طبع نہیں ہوئیں امید ہے کہ آیندہ نمبر میں ہماری جستجو مکمل طور پر کامیاب ہو جائیگی　(تاجور)

برعرشِ بجوشش درستیزہ آمدہ ایم　　آخر بزمینِ فتنہ خیز آمدہ ایم
بر ما تمیانِ آرزو حرف مگیر　　ما گریہ کناں وسجدہ ریز آمدہ ایم

از کنگرِ لامکاں بزیر آمدہ ایم　　در دامگہِ بلا اسیر آمدہ ایم
ہاں اے اجل! انداز تغافل تا چند　　کز سیرِ نظر فریب سیر آمدہ ایم

ما دلشدگان زلامکان آمدہ ایم　　از کشورِ جاں بخاکداں آمدہ ایم
اے مرگ! یکے ز آستین دست بر آر　　در پنجرہ جسم بجاں آمدہ ایم

پیامِ اُمید

نغمۂ دیر و حرم بھر دے ہمیں اک تار میں　　اور پرو دے دانۂ تسبیح کو زنّار میں

فتنۂ شیخ و برہمن سے بہت بالا ہو تو — چھوڑ کر پستی کو اوپر دیکھنے والا ہو تو
مثلِ نقدِ جاں ہو تو جیبِ زبانِ ہند میں — اک درخشاں لعل ہو تاریک کانِ ہند میں
آبِ گنگا کی روانی ہو تری تقریر میں — اور ہمالہ کی بلندی معنئ تحریر میں
ملک کی تاریک شب میں صورتِ مہتاب ہو — یعنی جسمِ قوم میں اک دیدۂ بے خواب ہو
شامِ غم میں دیکھنا چاہے جو صبحِ عید کو — خونِ دل سے سینچ اپنے گلشنِ امید کو
نخل کی ہر ایک رگ آبِ بقا سے سیر ہے — پھول ہیں نکلے ہوئے پھل میں ذرا سی دیر ہے
باغ کا ہر برگ اور ہر پھول ہوگا ہوشیار — دیدۂ نرگس سے اڑ جائیں گے آثارِ خمار
داغ ہر لالے کا سینے پر سپر ہو جائے گا — قصہ تاراجِ خزاں کا مختصر ہو جائے گا
ہو نہ کچھ نقشِ تعصب تیری روحِ پاک پر — برق بن کر گر من تو کے خس و خاشاک پر
رہنمائی کے لئے مشعل بنا سینے کا داغ — اہلِ دل روشن کریں اس آگ سے اپنے چراغ
تو فنا فی القوم کے ساغر سے لذت گیر ہو — تیرے ہر انداز میں اک جادوئے تسخیر ہو
باغباں ہیں برقِ فطرت۔ اپنے گلشن میں بہت — خضر کے انداز اب پیدا ہیں۔ رہزن میں بہت
پر ترا دل بادۂ ایثار سے سرشار ہو — سوز سے بھرپور سازِ روح کا ہر تار ہو
جل گئے گو ظلم کی آتش سے پروانے کے پر — شمع کے بھی پھول ہو جائیں گے تا وقتِ سحر
رنگ لائے گا طلسمِ نازِ قاتل ٹوٹ کر — گر پڑے گی خاک پر زنجیرِ باطل ٹوٹ کر
ہو کے دانا امتیازِ زیور و زنجیر میں — پھنس نہیں سکتا ہے پھر ہرگز کوئی تزویر میں

(خلیفہ عبدالحکیم ایم اے)

لذتِ عرفان

(۱)

رنگِ فطرت ہے وجہ حیرانی — عقل ہے وقفِ شرمِ نادانی
گلِ ظرفِ قفس نہیں گلِ باغ — چھوڑے اس پر نہ مرغِ بستانی
حسنِ باقی نے دل کو کھینچ لیا — رخصت اے حسنِ ہستیٔ فانی
طمعِ زر کیا ہے؟ عافیت سوزی — مسکنت کیا ہے؟ سلطنت رانی

رازداں مدعا کو کہتے ہیں — حسنِ الفت کا داغِ پیشانی
دل ہے وقفِ رجائے رحم و کرم — جان ہے نذرِ رضائے ربانی
برقِ نظارہ ہے فروغِ حیات — بار دل کو کیوں نہ ہو گراں جانی؟
یوسفِ روح! مصرِ قدس میں جا! — تن کو چھوڑ اے عزیزِ زندانی!

غم نہ کر ہے نقیبِ ابرِ بہار　　خشکئِ موسمِ زمستانی
دلِ صد پارہ کے اَلَم گن لوں　　دیکھی جائے گی سبحہ گردانی
اب میں سمجھی کہ ہے فنائے خودی　　انبساطِ بہشتِ لافانی
مفت ہے مفت ہے، خدا کی قسم　　جان کے بدلے کمالِ روحانی
کر سکے طے نہ مُلکِ عرفاں کو　　رومی و مغربی و کرمانی[1]
کنہ رب سے علوم ہیں لاعلم　　عربی سیکھ، خواہ عبرانی
تونے سب کچھ پڑھا پر کچھ نہ پڑھا　　نہ پڑھا علم نفس انسانی
قوتِ برقِ روح کو نہ سمجھ　　سحرِ افسونگری، پری خوانی
عرش کے کنگرے پہ طائرِ قدس　　رات کرتا تھا یوں خوش الحانی
کہ ہے انساں طلسمِ شانِ خدا　　قدر اپنی اُس نے پہچانی
بند کیں اس نے جب ذرا آنکھیں　　کھل گیا رازِ بزمِ امکانی
حسنِ احمد ہوا ظہور پذیر　　تھی یہ کس نور کی خود افشانی
آج کل "مادہ" ہے زوروں پہ　　الغیاث اے حکیمِ روحانی
عشق[2] کے فلسفہ کو چھوڑ دیا　　دیکھنا عقل کی تن آسانی
ٹھوکریں کھائے کیوں قیاس پرست　　دیدۂ دل ہو اگر نورانی
جس عمل کا قیاس ہے آغاز　　اس کا انجام ہے پشیمانی
حال پوچھا قضا نے جب آکر　　رہ گئی ساری فلسفہ دانی
چارۂ روحِ فلسفی ہے شیخ　　ایک وہ بھی ہے ایک خفقانی
عشق کی خرد بیں نے دکھلایا　　قطرہ میں طول و عرضِ عمانی
خاک میں انجلائے ہستئِ پاک　　ذرہ میں مہر کی درخشانی
بُعد میں قرب، پردہ میں جلوہ　　جنس کی وقتِ قحط ارزانی

کثرتِ این و آں میں وحدت دیکھ　　گنجِ نایاب کی فراوانی
شیخ ارنج بیانِ راز نہ کر　　لا بیاں ہے یہ کیفِ وجدانی

مشغلہ ہے اور شکایتِ ہجر
ہم ہیں اور شکرِ لطفِ پنہانی

(۲)

بحرِ غم میں ہے سخت طغیانی　　سر سے اوپر گزر گیا پانی
کب تک اے خاطرِ حزیں آہ تک　　شورِ "یارب" سے عرش جنبانی
رونے دھونے سے جان کھوتے ہے　　کہیں بنتے ہیں کام دیوانی!
دردِ دل درد آفریں کو سنا　　کر گزر جی میں ہے جو کچھ ٹھانی
دشتِ وحدت ہے، دشتِ وحدت ہے　　دیکھ آہستہ کر فرس رانی
بے خبر! اپنے نقش کو دل پر　　عظمتِ بارگاہِ یزدانی
مایۂ رشک، یاں بضاعتِ مور　　ہیچ داں شوکتِ سلیمانی
پہلے دے صدقہ ماسوی اللہ کا　　پہلے کر جان و دل کی قربانی
چاہئے بہرِ نذر جنسِ گراں　　چاہئے خون کو بُسّد افشانی
صدفِ فکر سے نکال گہر　　تر بہ تر کر عرق سے پیشانی

آج اک بے نوا ہے ہدیہ بدست　　ہو قبولِ جنابِ سلطانی
ہدیہ کیا، ایک سادہ دفتر پر　　لکھ کے لائی ہوں "لفظ لاثانی"
دین ہے الفت، وطن افغانستان
عرف مجنوں ہے، پیشہ حسانی

ز۔ خ۔ ش۔ آف علی گڑھ

[1] تین مشہور صوفی شعرا　[2] عشقِ حقیقی سے مراد

جذباتِ عالیہ

طباطبائی

آپ کو میرے دلِ زار سے کچھ کام نہیں!
خیر یونہی سہی تکرار سے کچھ کام نہیں

رشکِ نجمِ سحری ہے ترا آویزۂ گوش
اس ستارہ کو شبِ تار سے کچھ کام نہیں

مجھ کو طوطی کی طرح ذوقِ نوا سنجی ہے
ورنہ آئینۂ رخسار سے کچھ کام نہیں

ابر کی طرح سبک روح گذر جاتے ہیں
خلشِ وادئ پُرخار سے کچھ کام نہیں

شعلۂ شمع نہیں ہوں میں ہوں دامانِ نسیم
مجھ کو غارِ سرِ دیوار سے کچھ کام نہیں

مرکزِ صبر و سکوں زیرِ قدم ہے اپنے
گردشِ گنبدِ دوّار سے کچھ کام نہیں

سعد و نحس اپنا ہے اپنا ہی سکون و حرکت
کوکبِ ثابت و سیّار سے کچھ کام نہیں

اپنا مُنہ اشکِ ندامت میں نظر آتا ہے
مجھ کو آئینۂ پندار سے کچھ کام نہیں

اس کے جاتے ہی چلی چاندنی بھی گھر سے مرے
کہ مجھے اب در و دیوار سے کچھ کام نہیں

موج مارے جو غمِ دل تو فلک تک پہنچے
اس کو تمکینِ لبِ اظہار سے کچھ کام نہیں

میں جگر بندِ پیمبر کا ہوں شیدا اے نظم!
پسرِ ہندِ جگر خوار سے کچھ کام نہیں

وحشت

ترا حسن خود آرا دہر میں ہے جلوہ گر مجھ سے
ترے انداز پیدا ہیں باندازِ دگر مجھ سے

نتیجہ موجبِ عبرت ہے شب کی بزمِ عشرت کا
کہا رو رو کے قصہ شمع نے وقتِ سحر مجھ سے

نہ تیرگی قبر کا ہے شب کی تاریکی
کفن کا ذکر کرتی ہے سپیدئ سحر مجھ سے

معافی کے نہ تھی قابل محبت کی خطا شاید
کہ جب بگڑے تو بگڑے ہی رہے وہ عمر بھر مجھ سے

تغافل ہے ادا اور میں ادادانِ محبت ہوں
خبر ہے خوب مجھکو تو نہیں ہے بے خبر مجھ سے

وہ جرمِ عشق کی تفتیش میں ہیں۔ دل لرزتا ہے
چھپائی جائے گی کیونکر محبت کی نظر مجھ سے

مجھے دینا نہیں منظور اُن کو طعنِ بیداری
کہا جائے گا کیونکر قصۂ دردِ جگر مجھ سے

طوافِ کعبۂ مقصود اب قسمت میں ہے وحشتؔ!
تقاضا سجدے کا کرتا ہے اُس کا سنگِ در مجھ سے

رضا علی وحشتؔ

وجاہت

کیوں دلفریب وضع نہ ہو مہر و ماہ کی
دونوں یہ ٹوپیاں ہیں کسی کج کلاہ کی

آنے دیں اپنی زلف کو وہ کان تک ذرا
یہ ترجمان ہے مرے حالِ تباہ کی

محشر میں دل بھی ان کا طرفدار ہو گیا
نیت بدل گئی ہے ہمارے گواہ کی

رکھتے ہیں لاگ اس شہِ خوباں سے جاں نثار
بگڑی ہوئی تمام رعیت ہے شاہ کی

مٹی سے میکدے کی ہم اے شیخ بعد مرگ
بنیاد ڈال دینگے تری خانقاہ کی

نکلو ہمارے خانۂ دل سے تم اے بتو!
کعبے میں اب نہیں کوئی صورت پناہ کی

خنجر چلا رہے ہیں وہ حلقوم پر مرے
تصویر کھینچ لے کوئی اب قتلگاہ کی

قاتل پڑا نہیں مرے دل پر نشانِ زخم
تصویر کھینچ گئی ہے یہ تیری نگاہ کی.

وقت سفر قریب وجاہت حسین ہے
کچھ فکر چاہیے تجھے اب زادِ راہ کی

جوش

مجھے تعلیم دی ہے یہ مری فطرت نے بچپن سے
کوئی روئے، تم آنسو پوچھ لینا بڑھ کے دامن سے

چمن میں رو رہا ہے کون مل مل کر نشیمن سے
کوئی کہہ دو کہ شادابی اڑی جاتی ہے گلشن سے

ادب کو دخل دے اس بحر میں لہریں ہیں وحدت کی
غبارِ ماسوا! ہٹ کر ذرا شاعر کے دامن سے

بلندی عرش کی اس کی سرافرازی سے جھکتی ہے
تری حرمت یہ جس کا سر جدا ہوتا ہے گردن سے

بھرے آنکھوں میں آنسو عذرخواہی کے لئے آیا
صفائے نفس تو نے کہہ دیا میرے دشمن سے؟

ملائے ہیں یہ کس استاد نے پردے کہ آتی ہیں
صدائیں ایک سی اب بربطِ شیخ و برہمن سے

نچھاور کے لئے حسنِ ازل! لایا ہے اک شاعر
چنے ہیں اُس نے تازہ پھول کچھ فطرت کے گلشن سے

الہ آباد اب ہم عنقریب اے جوشؔ جائینگے
لپیٹ کر روئیں گے جی کھول کر اکبر کے مدفن سے

تپش

جب سے دل حسرت نواز ہوش ہے
سر گرانجانی سے بار دوش ہے

آرزو میں موت کی مرتا ہوں میں
زندگی میری فنا آغوش ہے

منتظر ہے کس کی؟ اے باد خزاں!
میری شمع آرزو گلپوش ہے!

رنگ رخ تفسیر حرف مدعا
جنبش لب معنیٔ خاموش ہے

اشک گلگوں شمع افروز حیات
درد غم طاقت ربائے ہوش ہے

دیدۂ پرشوق کیسا انتظار؟
حسرت فردا ز محو دوش ہے!

دے رہی ہے موت تسکین وصال
درد دل درماں سے ہم آغوش ہے

ہو گئی پیش نظر دنیائے یاس
یہ تماشائے وداع ہوش ہے

شورش نظارہ ہے آتش فشاں
ذرہ ذرہ طور در آغوش ہے

نقش حیرت ہو گیا طرز جنوں
ساز وحشت نغمۂ خاموش ہے

اے تپش! سرشار ہیں مستان عشق
ہر طرف گلبانگ نوشا نوش ہے

تاجور

حشر میں پھر وہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے
آج بھی وعدۂ فردا نظر آتا ہے مجھے

خلش عشق مٹے گی مرے دل سے جب تک
دل ہی مٹ جائیگا، ایسا نظر آتا ہے مجھے

رونق چشم تماشا ہے مری بزم خیال
اس میں وہ انجمن آرا نظر آتا ہے مجھے

عبرت آموز ہے بربادیٔ دل کا نقشہ
رنگ نیرنگیٔ دنیا نظر آتا ہے مجھے!!

وادیٔ عشق ہے وحشت کدۂ ویرانی
ایک اک ذرے میں صحرا نظر آتا ہے مجھے!!

ان کا ملنا ہے نظر بندیٔ تدبیر اے دل!
صاف تقدیر کا دھوکا نظر آتا ہے مجھے

دیکھ کر تجھ کو ہوئے نذر تحیر مرے ہوش!!
کیا بتاؤں تجھے؟ تو کیا نظر آتا ہے مجھے

رہتی ہے غمکدۂ دل میں تجلی اس کی
دل میں اک داغ تمنا نظر آتا ہے مجھے

بت کو بت جان کے پوجوں تو میں کافر اے شیخ!
بت میں بت ساز کا جلوہ نظر آتا ہے مجھے

تجھ سے میں کیا کہوں؟ اے سوختۂ جلوۂ طور
دل کے آئینے میں کیا کیا نظر آتا ہے مجھے

دل کے پردے میں چھپایا ہے ترے عشق کا راز
خلوت دل میں بھی پردہ نظر آتا ہے مجھے

بچ رہا تھا فقط اک تاجور شعلہ طراز
وہ بھی برباد تمنا نظر آتا ہے مجھے

تقریظات

"رسالہ عبرت" نجیب آباد (یو پی) جیسا کہ اہم تاریخی مقام ہے۔ وہاں سے ہندوستان کے مشہور اسلامی مورخ مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نے مقامی عظمت کے مطابق اک گراں پایہ ماہوار خالص تاریخی رسالہ جاری کیا ہے تاریخ ایک خشک مضمون ہے لیکن فاضل مدیر نے اپنے دلربا انداز تحریر سے اسے نہایت دلچسپ بنا دیا ہے ہر مضمون محققانہ اور نتیجہ خیز ہوتا ہے "عبرت" اپنی نوعیت مقصد کے لحاظ سے ہندوستان کا واحد رسالہ ہے اسکے صفحات کے آئینہ میں اسلام و اسلامیت کے جلوے درخشاں نظر آتے ہیں لکھائی اچھی چھپائی اور کاغذ درمیانہ ہے اک آدھ مضمون "عبرت" میں ایسا بھی ہے جس میں مضمون نگار سے مروت برتی گئی ہے عبرت ہی کیا ہر رسالہ کی سیاست ایڈیٹر سے ایسی جبری مروت حاصل کر لیا کرتی ہے۔

سالانہ چندہ پانچ روپے ہے۔ نجیب آباد دفتر رسالہ عبرت سے طلب کیجیے۔

"داغِ جگر" جناب علی سکندر صاحب رضا جگر مراد آبادی ملک کے بلند پایہ سخن طرازوں میں شمار ہوتے ہیں مرزا احسان احمد صاحب بی۔ اے ایل ایل بی نے ان کا مجموعہ کلام مرتب کر کے داغ جگر کے نام سے کتابی صورت میں شایع کیا ہے ابتدا میں مرتب دیوان نے کلام جگر پر اک بسیط فاضلانہ تبصرہ درج کیا ہے اس سے پہلے مولانا سید عبدالسلام ندوی کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے اسکے بعد ۲۰۰ صفحات میں غزلیات جگر ہیں کلام جگر سوز و گداز درد و غم کے موثر جذبات سے لبریز ہے۔ زبان دہلی ہوئی کنجلک سے پاک مضامین اکثر اشعار میں بلند ہیں۔ لکھائی چھپائی نہایت اچھی کاغذ درمیانہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ مرزا احسان احمد صاحب بی۔ اے وکیل اعظم گڈھ سے مل سکے گی۔ (زناجور)

خونابۂ عشق۔ حکایات شرلک ہومز پروفیسر فیروز الدین صاحب مراد (علی گڈھ کالج) کا نام ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں انہوں نے مختلف علوم طبیعیات کے تراجم اور تصانیف سے جو خدمت اردو علم ادب کی سرانجام دی ہے بہت قابل قدر ہے۔ حال میں انہوں نے مشہور انگریزی مصنف سر آرتھر کانن ڈایل کی دو کتابوں کا ترجمہ ہے۔ خونابۂ عشق جو مصنف موصوف کے "بلا خوف تردید بہترین" قصے کا ترجمہ ہے اوقات فراغت کے مطالعہ کیلئے ایک نہایت اچھی کتاب ہے، یہ ایک سراغرساں کی کہانی ہے جس میں عمدگی کے ساتھ ایک مربوط سلسلہ واقعات کو بیان کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ضروری مشاہدات اور صحیح استدلال کی وساطت سے ایک سمجھدار آدمی کیا کچھ کر سکتا ہے۔ قیمت عمہ

حکایات شرلک ہومز [illegible]

ہمایوں

کے متعلق اہلِ قلم کی رائیں

عدم گنجایش کے باعث "ہمایوں" کے متعلق اظہار رائے فرمانے والے حضرات کے بیسیوں خطوط میں سے اس مرتبہ صرف چار خطوں کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ آیندہ نمبروں میں ملک کے نامور اہل قلم و باوقار اخبارات و رسائل کی حوصلہ افزا راؤں کا اقتباس درج کیا جائیگا

(تاجور)

"ہمایوں کا پہلا نمبر وصول ہوا۔ چار روز سے علیل ہوں اس لئے صرف اک مختصر کارڈ پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ جی چاہتا تھا کہ آپ کو خوب دل کھول کر داد دوں۔ اس پہلے نمبر کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ آپ نے ایک ادبی رسالے کا صحیح تصور ذہن میں قایم کیا ہے اگر اس کی ظاہری خوبیوں سے آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں تو باطنی محاسن سے بھی دل و دماغ دامن گلچیں بن جاتا ہے کیوں نہ ہو جس کے نام سے رسالہ منسوب ہے اسکی عالی دماغی کی جھلک اس رسالے میں معنی ہی چاہئے تھی خصوصاً جب کہ مدیر "علامہ فصیح" کا خلف رشید ہو کہ الولد سرلابیہ میں اس رسالے کی اجرا کی خبر پر مبارکباد دے چکا ہوں لیکن اب نمونہ دیکھ کر دوبارہ بصد مسرت مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ اور بھی اچھا کیا کہ فاضل نجیب آبادی کو شریک ادارت کر لیا۔ مجھ کو فاضل موصوف سے اتفاق تعارف نہیں ہوا لیکن انکے ادبی کارناموں کو دور بیٹھا نگاہِ تحسین سے دیکھتا رہا ہوں

(نیرنگ)

"ہمایوں" کا پہلا نمبر پہنچا۔ اکثر مضامین نہایت دلچسپ ہیں خصوصاً مولانا تاجور صاحب کا مضمون "کلام ہمایوں" ایک قابل قدر اور مستند علمی تبصرہ ہے۔ آپ کی تعریف شاید تکلف پر محمول کی جائے اس لئے اس سے گریز کرتا ہوں "نغمات الجاہلین" و "محفل ادب" دونوں انوکھی چیزیں ہیں۔ آپ کی جدت طرازی قابل داد ہے۔ ایک بات سے بالخصوص خوشی ہوئی کہ نظم کا حصہ مختصر اور بھرتی کی چیزوں سے پاک ہے۔ (سعید[1])

رسالہ "ہمایوں" کا پہلا نمبر موصول ہوا جس کے محاسن صوری و معنوی کا اعتراف نہ کرنا بڑی بے دردی سے تعبیر کیا جائے گا۔ مرزا احسان احمد صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی کا مضمون بڑے شوق سے پڑھا۔ اس مضمون کے علاوہ ہمایوں کے اسٹاف کی کارگزاری بھی مختلف اعتبار سے قابل تحسین اور ملک کے خاص شکریہ کی مستحق ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "ہمایوں" کے اسٹاف نے مل کر کام کرنے کی فقط تلقین ہی نہیں کی بلکہ عملی طور پر ثبوت دیا ہے۔ اور ملک کے سامنے ایک ایسا خوان ادب چنا ہے جس سے قوم کی دماغی نشو و نما معتدل طریقہ پر ہوگی حصہ نظم میں سنجیدہ مذاق کے نمونے پیش کئے گئے ہیں مقام شکر ہے کہ اردو زبان کی خدمت پر پنجاب ہمہ تن مستعد ہے۔ (ریاس)

"ہمایوں" پہنچا میں اس عنایت کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں لکھائی چھپائی کاغذ کی صفائی اور اندرونی لطافت کے لحاظ سے یعنی اس رسالہ کی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ (وحید الدین[2])

[1] جناب مرزا محمد سعید صاحب ایم اے اسسٹینٹ سکرٹری صیغہ تعلیم گورنمنٹ ہند
[2] مولانا وحید الدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی

فہرستِ مضامین بابت ماہ مارچ ۱۹۲۲ء

جلد ۱ — نمبر ۳

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذباتِ عالیہ

ہُمایُوں کیجانب سے سو روپے
کا
اِنعامی مضمون

اُردو رسالوں میں غالباً "ہُمایُوں" سب سے پہلا رسالہ ہے جسے حالات کی مساعدت نے یہ موقعہ دیا ہے کہ وہ اہلِ قلم کو بیگاری کے درجہ سے بالاتر سمجھے۔ اِسی لئے اُسکے پہلے نمبر میں یہ عام اعلان کر دیا گیا کہ جو پُرمغز و پُر معلومات، اچھوتے مضامین محنت و کاوش سے لِکھّے جائینگے۔ صاحبِ مضمون کے اِیما پر اُنکا معقول معاوضہ پیش کیا جائیگا۔ اِسی سلسلہ میں اب یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ذیل کے اہم عنوان پر انعامی مضامین لکھوائے جائیں۔

اُردو ہندوستان کی ملکی زبان کیونکر بن سکتی ہے؟

(۱)۔ سب سے بہتر مضمون پر جو منصفوں کی رائے میں اوّلیت کے معیار پر پورا اُترے ہُمایُوں کے سرمایۂ سے ساٹھ روپے اور اسی حیثیت میں دوم نمبر کے مضمون پر چالیس روپے بطورِ انعام پیش کئے جائینگے۔

(۲)۔ اور اگر مضامین میں سے مقرر کردہ معیار پر کوئی بھی پورا نہ اُترے مگر اِن میں بعض مضامین مفید اور جاذبِ توجہ ثابت ہوئے تو اول و دوم پر انعام کی مقدار منصفوں کی رائے پر مقرر کیجائیگی۔

(۳)۔ تمام مضامین ایک کمیٹی میں پیش ہونگے۔ جسکے ایک رکن آنریبل خان بہادر شیخ عبدالقادر بی اے بار ایٹ لا جج ہائی کورٹ پنجاب ہونگے باقی دو "ہمایوں" کے دونوں اڈیٹر۔

(۴)۔ مارچ کا ہمایوں چھپنے کے بعد سے تین ماہ تک مضامین کا انتظار کیا جائیگا۔ یہ سہ ماہی مدت اس لئے تجویز کی گئی ہے تاکہ زیادہ غور و مطالعہ کے بعد مضامین پرمغز و پر معلومات اور مدلّل پیرایہ میں لِکھے جائیں۔

(۵)۔ مضامین فلسکیپ سائز کے زیادہ سے زیادہ تیس ۳۰ اور کم سے کم دس ۱۰ صفحات پر ہونے چاہئیں۔

(ناتمام)

شذرات

ہماری خواہش ہے کہ "ہمایوں" کا حصۂ نظم باعتبارِ حسنِ انتخاب بہت بلند پایہ ہو۔ اس میں حتی الامکان کوئی ایسا شعر خواہ وہ کسی کا ہو درج نہ کیا جائے۔ جو غیر متین و غیر موثر ہو۔ جسے بھرتی کا کہا جا سکے جس میں کوئی بات نہ پیدا کیگئی ہو۔ تخئیل کی ندرت اور اسلوب بیان میں کوئی اچھوتا پن ہو اگر حضرات سخن طراز ہماری مدد کریں تو یہ "خواہش" ناممکن الحصول نہیں ہے اسکی آسان صورت یہ ہے کہ اہل نظم پہلے ایک غیر جانب دار نقاد کی حیثیت سے اپنی نظموں کو خود دیکھیں اور انتخاب کا حق ادا کریں۔ اسکے بعد پھر یہ غیر خوشگوار فرض یہ کہتے ہوئے ہمیں سونپ دیں کہ "تو دانی حساب کم و بیش را"

ہم چشم پوشی و مروت کو سپرد نسیان کرکے جو اشعار درج کردیں تو ہماری جائز قطع و برید پر چیں بجبیں نہ ہوں۔ ذرا سے ایثار کی ضرورت ہے۔ ان دو انتخابوں کے بعد جو شعر درج ہونگے یقیناً پھر وہ شعر نہیں ہونگے سحر ہونگے لیل و نہار کی گردش اُن پر اثر انداز نہ ہوسکیگی سب سے پہلے اس نصیحت پر ہم کاربند ہوتے ہیں اور اپنے بائیس اشعار میں سے مذکورہ بالا دو بیدردیوں کے بعد چھ شعر درج کررہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ملک کے مایۂ ناز سحر نگار اپنی چھائی ہوئی شہرتوں اور جنبہ داری شخصیتوں کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اس قابل قدر ایثار پر بخندہ پیشانی آمادہ ہوکر اردو شاعری کو زندہ قوموں کی شاعری بنانے میں سرگرم عمل ہوجائینگے۔

اک علم دوست شخصیت نے سال بھر کے لئے پانچ ایسے مستحق طالب علموں کو ہمایوں مفت عطا کرنیکی خواہش ظاہر کی ہے جو ادبیات سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ ہم نے مدارس ذیل پر اس عطیہ کو تقسیم کردیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند۔ ندوۃ العلما لکھنؤ۔ الٰہیات کانپور۔ جامعۂ اسلامیہ علیگڈھ۔ بنارس ہندو یونیورسٹی لہٰذا ان مدارس کے منتظمین کی خدمت میں التماس ہے کہ اپنی اپنی درسگاہ سے ایک ایک ایسے طالب علم کے نام سے ہمیں مطلع فرمائیں جو اردو ادب سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ہی کوئی ادبی رسالہ خریدنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

ہم مہاشہ سدرشن جرنلسٹ کا (جو چھوٹی چھوٹی دلچسپ و نتیجہ خیز کہانیاں لکھنے کی وجہ سے پنجاب کے پریم چند کہلاتے ہیں) شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے محفلِ ادب کے لئے ہندی و گجراتی زبان کے بلند پایہ رسالوں کے تازہ ترین نمبروں میں سے دلچسپ اقتباسات کا ترجمہ عنایت فرمایا اور اس عدہ کے ساتھ کہ یہ سلسلہ عنقریب غیر منقطع ہوگا۔

ہندوستان کی نسوانی دنیا میں ز۔خ۔ش۔ صاحبہ مرحومہ کی اچانک موت کی خبر رنج و اندوہ سے سنی جائیگی۔ یہ پیکر کمال نہ صرف مسلمان عورات کے لئے بلکہ کل ہندوستانی نسوانی طبقہ کے لئے سرمایۂ ناز تھی۔ اس قابلیت کی عورتیں ہندوستان میں بہت کم ہونگی مرحومہ اردو کی اک غیر معمولی شاعرہ تھی انکی آخری نظم "لذتِ عرفان" جو انہوں نے خاص "ہمایوں" کے لئے لکھی تھی فروری کے "ہمایوں" میں باصرہ فروز ہوچکی ہے۔ خدائے تعالیٰ مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگاں کو صبر جمیل +

تاجور

جہاں نما

ہم خود۔ حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو آج کل ہندوستان ہی ہمارے لئے جہاں نما ہے۔ دُنیا کی تازہ ترین تحریک کا مرکز یہی مُلک ہے۔ دُنیا بھر کی نظریں ہماری طرف لگی ہیں اور خود ہم کتنا بھی باہر کو نگاہ دوڑانا چاہیں ہماری آنکھیں اندرونی حالت دیکھنے کو بند ہوئی جاتی ہیں۔ ہم نہیں جانتے ہم کہاں ہیں اور کدھر کو جا رہے ہیں۔ پہلے ہم مُردہ قوموں میں شمار ہوتے تھے آج اتنے زندہ ہو چکے ہیں کہ زندگی کے جوش میں ہم میں سے بعض آتشِ موت میں قدم رکھنے سے دریغ نہیں کرتے۔ آخر وہ کونسا انقلاب ہے جس نے خاموشی کے ساتھ خواب کو بیداری مجبوری کو رضا کاری اور غفلت کو ہوشیاری میں تبدیل کر کے پُرانی دُنیا کو اک نیا جنم دیدیا ہے۔ سب جماعتیں اقرار کرتی ہیں کہ ہندوستان اَور کا اَور ہو گیا ہے لیکن سبھی اس کا احساس بھی کرتی ہیں کہ موجودہ حالت خطر سے خالی نہیں۔

"مصورِ فطرت" کے لفظوں میں ہم بھی دست بدعا ہیں کہ "اے ہر دوار کے دوارے رہنے والے! سُن اور دیکھ! امیدیں ڈُوب رہی ہیں۔ ارمان جل رہے ہیں۔ ماتم برپا ہے۔ نوحوں کا شور مچ رہا ہے یہ ملکِ ہندوستان! اس کو تیری امان! فساد و خونریزی قحط و بیماری کاہلی و بیکاری سب آفتوں سے جو زمین کی ہوں یا آسمان کی، مشرق کی ہوں یا مغرب کی، دین کی ہوں یا دُنیا کی حفاظت دے۔ حفاظت دے!!

قرض خواہِ مغرب۔ فتح مند اتحادی امریکیوں کے بارِ قرض کے نیچے دبے پس رہے ہیں۔ انگلستان پر امریکہ کا قرضہ ایک ارب پچیس کروڑ پونڈ تک پہنچ چکا ہے۔ انگریزی اخبار آؤٹ لُک اہلِ امریکہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے "صاحبو! ہم نہیں کہتے کہ اس بارِ عظیم کا ہمارے سر سے اُٹھا لینا آپکی فیاضی یا عالی ہمتی ہوگی بلکہ ایسا کرنا آپ ہی کے لئے مفید ہوگا۔ آپکی تجارت ہمارے مقروض ہونے کے باعث خستہ حالت میں ہے آپ کے لاکھوں مزدور اسی سبب سے بیکار پڑے ہیں اور آپکی صنعتیں اسی وجہ سے پریشاں حالی میں ہیں۔ ہماری رائے میں آپ یہ قرضہ ضرور ہی چھوڑ دیں گے"۔

انگریزی چانسلر نے اعلان کیا ہے کہ انگلستان نے اس بھاری قرضے کا سُود ادا کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ سُود پچاس کروڑ پونڈ سالانہ ہوگا۔

جلسہ آفرینی۔ دُنیا میں کم پیشہ وروں کو ایسے عجیب کام سے سابقہ پڑتا ہوگا جیسے اُس شخص کو جو پارلیمنٹ کی ممبری کے اُمیدواروں کے لئے لوگوں کو گلی کوچوں میں جمع کرتا ہے + مشہور گذرگاہوں میں تو وہ سڑک کے بیچ میں کھڑا ہوکر آسمان کی طرف ایک فرضی چیز کو دیکھنے لگتا ہے لیکن چُپ چاپ کوچوں میں اُسے اس کام میں بہت سی دقتیں پیش آتی ہیں۔ وہ کھڑا ہوکر ایک فرضی آدمی کو "ہی ہی" کرکے پُکارتا ہے اور چند لمحوں کے بعد نہایت زور سے چیختا ہے کہ "جون جون! تم جا رہے ہو؟ دیکھئے دیکھئے جواب تک نہیں دیتا"۔ یہ شور و غل سُن کر لوگ جمع ہونے شروع ہو جاتے ہیں اتنے میں مُقرّر آدھمکتا ہے اور تقریر کرنے لگتا ہے"۔

شادی اور شادمانی۔ بحرالکاہل کے جنوبی حصے میں (نیو ہیبرڈیز کے مجمع الجزائر میں) ایک جزیرہ مالی کُولا ہے جہاں کی اکثر شادی شدہ عورتوں کے دو اگلے دانت نہیں ہوتے + گاؤں کی بڑھیا عورتیں لڑکی کی منگنی کے وقت اُس کے دو دانت اُکھاڑ دیتی ہیں جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اب دوشیزگی کا زمانہ ہو چُکا +

ایک اور عجیب دستور یہ ہے کہ ہر ننھّی بچّی کے سر کے گرد ایک رسی مضبوطی کے ساتھ باندھ دی جاتی ہے جس سے اُس کا سر بیضوی رہنے کی بجائے آہستہ آہستہ مخروطی شکل اختیار کر لیتا ہے جن لڑکیوں کے سر اس وضع کے بن جائیں وہ خوش نصیب سمجھی جاتی ہیں +

مُعلّق گاڑی۔ برلن اور ہیمبرگ کے درمیان ایک ریل گاڑی چلتی ہے جس کی لائن بجائے زمین پر نصب ہونے کے ہوا میں معلق ہوتی ہے۔ یہ لائن ایک نہر کے اوپر بنائی گئی ہے جس کے ساتھ لٹک کر گاڑی دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے + (ب ل)

نیویارک (امریکہ) میں "ولورتھ" دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہے۔ سطح زمین سے (۷۹۲) قدم بلند اور زمین میں اس کا عمق (۱۵۰) قدم تک ہے۔ اس کی ساٹھ منزلیں ہیں۔ چار سَو دارالمطالع ہیں اس عمارت کا اک اعلیٰ افسر ہے جس کے ماتحت چار سَو آدمی عمارت کے مختلف حِصّوں کا انتظام کرتے ہیں۔ سات لاکھ پونڈ سالانہ اس کا خرچ ہے +

(تاجور) الہلال (مصر)

علمی شعاعیں

موجِ خیال۔ایک حیرت انگیز آلہ ایجاد ہُوا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعاعیں آنکھ میں سے نکلتی ہیں اور انہیں قلمبند کیا جا سکتا ہے + یہ آلہ ایک قسم کا "برق پیما" ہے جس کے ذریعے سے ننھی سے ننھی برقی موجوں کا اندازہ کیا جاتا ہے ۔ جب نظر "برقی پیما" پر جما دی جاتی ہے تو ایک قسم کی حرکت پیدا ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظر میں کوئی ایسی شئے ہے جو باہر کو ضیاء ریز ہو کر خود بخود حرکت پیدا کرتی ہے تعجب نہیں اگر آیندہ یہ دریافت ہو کہ ہر نگاہ کے ساتھ خیال بھی ہم رکاب ہوتا ہے۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خیال اثیر میں حرکتِ موج پیدا کر سکتا ہے تو پھر اس بات میں بھی کچھ شک نہ رہے گا کہ ایک شخص ہندوستان میں بیٹھا ہوا لندن میں ایک ہم جنس پر اپنے خیالات کا اثر ڈال سکتا ہے + اثیر کی موجیں طوالت میں مختلف ہوتی ہیں "عکسی" شعاعیں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ لاکھوں ایک ہی انچ میں سما جاتی ہیں اور بے تار کی موجیں بعض اوقات پانچ پانچ میل طویل ہوتی ہیں + ممکن ہے کہ خیال کی موج ہزاروں میل طویل ہو یا شاید بہت چھوٹی سی ہو اور اس حالت میں ایک خیالی موج جو کسی زبردست خیال کے باعث حرکت میں آئے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کریگی حتیٰ کہ وہ ایک ہمخیال دل تک رسائی پالے +

ایک موم بتی۔نیویارک کے ایک گرجے کو ایک موم بتی مشہور مُغنّی کیروزو کی یادگار کے طور پر ہدیتہً دی گئی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ بتی ۶۹۲۱ء تک برابر جلتی رہے گی (اگر دُنیا کا اس سے پہلے ہی خاتمہ نہ ہو گیا) اس کا وزن ۵۰۰ سیر ہے۔ اس پر حضرتِ مسیحؑ کی تصویر منقوش ہے اور تمام اُن لوگوں کے نام بھی اس پر کندہ ہونگے جنہوں نے اس کے تیار کرنے کے لئے چندہ دیا + موم بتی ہر سال کیروزو کی پیدایش کے دن ۲۵ نومبر کو روشن کی جایا کرے گی اور اس میں اتنا موم ہے کہ وہ پانچ ہزار برس تک جل سکے گی + وہ متواتر ایک لاکھ بیس ہزار گھنٹے جل سکتی ہے یا تقریباً ۱۴ برس نیویارک کے اطالوی یتیموں نے یہ موم بتی گرجے کو دی ہے۔ کیروزو نے ان بچوں کی اپنے کمالِ فن سے عمر بھر اعانت کی

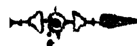
امریکی اخبارات۔ دُولِ متحدہ (امریکہ) میں ۲۳ ہزار سے زائد اخبارات چھپتے ہیں۔ ان میں ۲۵۰۰ روزانہ اخبار ہیں باقی ہفتہ وار یا ہفتہ میں دو یا تین بار چھپنے والے۔ رسالے ان میں شامل نہیں ہیں + شکاگو کے شہر میں ۴۰ روزنامے ہیں جن میں سے صرف ۱۲ انگریزی زبان میں ہیں۔ باقی ماندہ جرمن۔ بوہیمی۔ پولی۔ ہنگری۔ اطالوی۔ سلوویکی زبانوں کے اخبار ہیں۔ لیکن فرانسیسی کا کوئی روزنامہ نہیں ہے + امریکی لوگ اخبارات کے اتنے مشتاق ہیں کہ پچیس ہزار کی آبادی والے چھوٹے شہروں میں بھی ایک روزنامہ ضرور ہوتا ہے۔ کاروباری آدمی کی بھوک ہر روز تین چار اخباروں سے پوری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بیوی بچے اَور اخبار پڑھتے ہیں + اس جوع الاخبار کی وجہ ہے کہ ایک ایک امریکی اخبار دن میں کئی دفعہ چھپتا ہے۔ اور یہ عجیب واقع دیکھنے میں آتا ہے کہ صبح کے اخبار شام تک چھپ چھپ کر بکتے ہیں اور شام کے اخبار صبح کے نو بجے تک اپنا آخری ایڈیشن شائع کرتے رہتے ہیں +

دنیائے اسلام میں یہ خبر مسرت سے سنی جائیگی کہ دولتِ خداداد افغانستان کی علمی بیداری اب ایک عظیم الشان یونیورسٹی کی صورت میں رونما ہونیوالی ہے۔ کابل کے سفیرِ یورپ جنرل ولی محمد خاں اس یونیورسٹی کے لئے سائنس کے فرانسیسی اور امریکن پروفیسر بہم پہونچا رہے ہیں +

تاجور		امان افغان

لاہور کی مشہور نوتعمیر کردہ بوٹوں کی دکان "کرنال شاپ" کی پیشانی پر ہندوستان کے حیرت کار خوشنویس منشی دین محمد صاحب نے جلی حروف میں چوبیس انچ قط کے قدِ آدم قلم سے "کرنال شاپ" لکھا ہے۔ جس کا لام اٹھارہ فٹ لمبا ہے۔ اور پ بائیس فٹ لمبی سبکدستی کا کمال یہ ہے۔ کہ اپنے تن کی برابر قلم سے یہ حروف لکھے ہیں۔ مگر حروف کی نوک پلک اور باصرہ فروزی کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ قلم کے قط کی چوبیس انچہ چوڑائی اور حروف کی بائیس فٹ لمبائی فنِ کتابت کی خوبیوں میں حارج ہوئی ہے۔

مالکانِ دکان نے اِن دو حرفوں کی اُجرت دوسو روپے ادا کئے +



نسوانی دُنیا

مستوراتِ مصر کی مرکزی سیاسی انجمن کا ایک وفد لارڈ کرزن کی پیش کردہ شرائط کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے لارڈ ایلنبی گورنر مصر کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا عزیزہ علی فوزی صاحبہ نائب ناظم کی جانب سے روزنامہ "المقطم" (مصر) میں وفد کا بیان شائع ہُوا ہے۔ اس بیان کے تہوّر آمیز لہجہ کو دیکھتے ہُوئے مصر کی حیرت انگیز نسوانی بیداری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

المقطم (مصر)

ہمارے اس برِّ اعظم میں بھی یادش بخیر اک "آل انڈیا لیڈیز کانفرنس" قائم ہوئی تھی۔ لیکن مُدت ہُوئی وہ خوابِ پریشاں کثرتِ تعبیر کی نذر ہو چکا۔

مصر کی اک مشہور انشاپرداز سیّدہ روز حدّاد نے "مجلّۃ السیّدات" کے نام سے ایک گرانپایہ علمی۔ ادبی۔ اجتماعی۔ نسائی ماہوار رسالہ جاری کیا ہے۔ یہ رسالہ مصر کے منتخب ادبی رسالوں میں شمار ہوتا ہے۔

ہندوستان میں بھی بنگالی اور ہندی زبان کے بلند پایہ رسالے عورتوں کی ادارت میں شائع ہو رہے ہیں لیکن ایک بدقسمت اُردو ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ رائج گو ہر گوشہ میں اس کی تعلیم مگر اس کا ایک بھی ایسا قابلِ ذکر نسوانی رسالہ یا اخبار نہیں جو کسی تعلیمیافتہ عورت کے مطالعہ کے لائق ہو۔

الہلال (مصر) کے تازہ نمبر میں "المرأۃ الجدید" (جدید زمانہ کی عورت) کے عنوان سے ایک معرکۃ الآراء مضمون شائع ہُوا ہے جس میں دورِ جدید کی مشرقی و مغربی عورتوں پر بسیط تبصرہ کے بعد عورتوں کے متعلق مشاہیر اہل الرائے کے اقوال درج کرتے ہُوئے قابل مضمون نگار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

لڑکیوں کے سرپرست و مربّی اثنائے تربیت میں یہ خیال ضرور رکھیں کہ عورت کا سب سے پہلا اور ضروری فرض یہ ہے کہ وہ امورِ خانہ داری میں دلچسپی لے۔ اپنے بچّوں کی غور و پرداخت کا خیال ہر وقت پیشِ نظر رکھے۔ اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اُسکے نازک کندھوں پر ذمہ داریوں کا کتنا بوجھ ہے، اور وہ ان ذمہ داریوں سے کیونکر سبکدوش ہو سکتی ہے۔

تاجور الہلال

ہندوستان کے مسخ شدہ طبقے کو مبارکباد ہو کہ لیجسلیٹو اسمبلی نے بہ کثرت رائے تجویز منظور کر لی ہے کہ عورتوں کو حق انتخاب دیا جائے۔ ب ا

خزاںؔ

خزاں کا دن تھا! ---- زرد پتّیاں درختوں سے جھڑ جھڑ کر تیز بہنے والی آبجو میں گرتی تھیں اور بہتے جاتی تھیں، مرجھائے ہُوئے پھُولوں کی پنکھڑیاں ہوا میں چاروں طرف منتشر ہو رہی تھیں اور پارہ پارہ ہو کر گردِ راہ ہُوئی جاتی تھیں!

وہ اپنے دریچے میں بیٹھی حُسنِ قدرت کی پژمردگی کا یہ سماں دیکھتی تھی اور اُس کے خیالات فضائے گلشن میں اُداسی کے ساتھ محوِ پرواز تھے۔ خود اُس کی فطرت کو کوئی غم لاحق نہ تھا کیونکہ اُس کے لئے زندگی بہارِ شباب کے پھُولوں سے مُعطّر تھی لیکن ان غافل خوشیوں میں قدرت کے حُسن کی پریشان حالی اُسکے نفس پر اک اَبرِ سیاہ کی طرح چھائی ہُوئی تھی!

"کچھ یہی حال میرا ہوگا"، وہ بولی، "دو دن کی بہار پر عیش غرّہ ہے جب آخر حُسن کو زشت نمائی کا سامنا ہے جب یُوں بہار کو خزاں سے واسطہ ہے اور زندگی کو موت سے! گلشنِ فطرت میں کوئی کیوں پھلے پھُولے؟ بزمِ عشرت میں کوئی کیا محوِ طرب ہو جب مسرت کا انجام مشقت اور گویائی کا نتیجہ ابدی خاموشی ہے!"

× × × اور اُداسیاں پھر اُس کے دل پر تاریکیاں بن کر چھا گئیں!

چُوں چُوں کرتی اک چڑیا اُس کے پاس سے گذر گئی، درخت کی پتّیاں ہنوز جھڑ جھڑ کر ہوا میں بکھر رہی تھیں لیکن چڑیا اپنے چہچہوں میں مصروف و مطمئن تھی اور چاروں طرف خوشی کے نغمے گاتی ہُوئی اُڑ رہی تھی!

اُس نے حیرت سے چڑیا کو دیکھا اور کہا کہ "تیرے پھُول مُرجھا گئے، جن پتّیوں میں تیرا کاشانہ تھا وہ زرد رُو ہو کر مٹی میں مٹی ہو گئیں اور تُو اپنا گانا گا رہی ہے!"

"ہاں، لیکن خوشی کبھی نہیں مرجھاتی" چڑیا نے مُسکرا کر کہا "اور یُوں بھی پژمردگی حُسن کی بہترین نگہدار ہے"

حسینہ نے اک آہ بھری اور کہا "پژمردگی اور حُسن! میں نے تو حُسن کو ہمیشہ شگفتہ ہی دیکھا ہے۔ اے چڑیا! کیا تو خزاں کا پیغام سُنا کر بہار کے دلدادوں کی پھبتی اُڑاتی ہے؟"

ہلکی ہلکی نسیم کے غمّاز جھونکوں نے یہ باتیں ننھی ننھی پنکھڑیوں کی طرح چمن کے کونے کونے میں پھیلا دیں!

چڑیا چوں چوں چوں چوں کرتی اُڑ گئی اور سوکھے ہوئے درختوں ویران گلزاروں کا چکر لگاتی ہوئی اک جھاڑی کے قریب جا بیٹھی جس میں چند ہرے پتّے اور صرف ایک کھلا ہوا پھول موجود تھا اور باقی حسن کی مورتیں پیوند خاک ہو چکی تھیں!

"اب میں تجھ سے جدا نہ ہونگی" وہ گویا ہوئی "شیریں پھول! تو مجھے پیارا ہے" لیکن بہار کے آخری پھول نے مُنہ پھیر لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔

چڑیا نے ذرا حسرت سے کہا "محبت بھی کتنی دشوار ہے" لیکن پھول نے کچھ جواب نہ دیا۔ ہاں اُسکی کمھلاتی ہوئی پنکھڑیوں سے یہ ٹوٹی ہوئی آواز پیدا ہوئی کہ "اگر پژمردگی حسن کی بہترین نگہدار ہے تو اے چڑیا! شگفتگی لاحاصل ہے" ! تو پھول کی وہ باتیں بھول گئی اور پھول آزاد ہو گیا"۔

چڑیا بدحواس ہو کر اُڑی اور سوکھے ہوئے درختوں اور ویران گلزاروں کا چکر لگاتی ہوئی اُسی دریچے کے قریب جا پہنچی جہاں اک انسانی پھول اپنی بہار کے خیال سے سرنگوں ہو رہا تھا۔ چڑیا کے کان میں یہ لفظ گونج رہے تھے "تو پھول کی وہ باتیں بھول گئی" اُس کا دل شاید ہمیشہ کیلئے پژمردہ ہو جاتا اگر حسینوں کی دنیا میں اپنے محبوب کی بھولی ہوئی باتوں کی یاد تازہ کرنا اُس کی زندگی کی تنہا باقی مسرت نہ ہوتی۔

چڑیا نے کہا "اے حسینہ! غم نہ کر حسن پژمردگی و شگفتگی سے آزاد ہے اور آزادگی ہی حسن کی بہترین نگہبان ہے۔ غم نہ کر اے حسینہ! اور اُن رس بھری باتوں کو سن لے جو ایک بوستانی پھول نے شاید اک انسانی پھول کی شادابی کے لئے میرے گوش گذار کی تھیں۔

"حسن کی دنیا میں ظاہر باطن سے جدا نہیں، جو کچھ نظر آتا ہے وہ ان دیکھے کا جلوہ ہے! لیکن جو کچھ تو دیکھتا ہے وہ بھی فریب کاری نہیں اگر تیرا دل ہی تجھے دھوکا نہ دے۔ زشت نمائی تو محض بھٹکی ہوئی آرزو کی کج نظری ہے اور اُس کا وجود حقیقت میں نیستی۔ حسن ہر جگہ بکھرا پڑا ہے اور کونسی شے حسین نہ ہوگی جب حسن ہی کائنات کا پیدا کرنے والا ہے! چند روزہ حسن کو دل نہ دے اور دل دے تو اُس کی خزاں کو بہار سے جدا نہ دیکھ! کیونکہ بہار حسن گویا ہے اور خزاں خاموشیٔ حسن! ــــ کون کہہ سکتا ہے کہ شاہد حقیقی کی خاموشی اُسکی گویائی سے زیادہ دلکش نہیں؟ اُسکی کونسی ادا دل دینے کے لائق نہیں؟ اور کونسا جلوہ ہے جس پر دنیا حسن کے ہزاروں پھول نچھاور نہ کر دے؟!

بہار و خزاں تو نگاہِ کوتاہ بیں کی سراب آفرینیاں ہیں اور اگر تو چاہتا ہے کہ حسن کو ہمیشہ شگفتہ دیکھے تو راست روی اختیار کر کہ فقط راستی ہی ابدی مسرت ہے اور صرف حقیقی مسرت دائمی حسن!!

بشیر احمد

تحقیق الالسنہ

گذشتہ سے پیوستہ

(۸) عربی شرح تمام دنیا کے الفاظ کی لازمی خصوصیات کو ظاہر کردیتی ہے۔ برخلاف عجمی زبانوں کی شروح کے جن میں قلتِ الفاظ کے باعث صرف سطحی مناسبت کے اظہار کی بھی بمشکل گنجایش ہے۔ اِس لئے علوم کے اصطلاحی الفاظ کی شرح میں صرف اس خیال سے مایوس نہ ہونا چاہیئے کہ عربی جاہل بدویوں کی زبان ہے جن کو آج تک کبھی علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یا الفاظِ اصطلاحات یورپین زبانوں میں ہیں اور زمانۂ حال کی ایجاد ہیں اور ان کے ترجمہ یا خود الفاظ اب تک یورپ کے سوا دوسرے ممالک میں شائع ورائج نہیں ہوئے ہیں۔ کیونکہ عربی دراصل ابتدائی زبان انسان کی ہے اور اپنے حال پر اب تک قائم ہے یہ ہوسکتا ہے کہ جس طرح دوسری قدیم زبانوں کے بہت سے الفاظ متروک ہو کر گم ہوگئے۔ یا بعض موجودہ الفاظ کے سابقہ معانی میں سے کچھ گم ہوگئے۔ اسی طرح عربی کے الفاظ و معانی بھی گم ہوگئے ہونگے۔ مگر اب تک بھی عربی میں اس قدر گنجایش باقی ہے کہ ہر زبان کے ہر قسم کے الفاظ کی شرح کے لئے صرف ایک کتاب منتہی الارب کافی و وافی ہے۔ میں نے ہزارہا الفاظ مختلف زبانوں کے مشکل سے مشکل انتخاب کرکے اس کتاب میں دیکھے اور اسی کام میں مَیں پانچ برس سے لگا ہوا ہوں مگر آج تک ایک لفظ کی بابت بھی ناکامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایک روز خیال آیا کہ ستاروں کے ہندی نام جو ہفتہ کے دنوں سے منسوب ہیں انکو سنسکرت بتایا جاتا ہے۔ یہ اگر عربی سے حل ہوجائیں تو سنسکرت اور عربی کے اتحاد کی عجیب دلیل ہے۔ دیکھنا شروع کیا۔ تو تین گھنٹہ کی محنت سے مندرجہ ذیل شرح حاصل ہوئی جس کے بیان کرنے سے پہلے یہ بات بتادینی ضروری ہے کہ ستاروں کی لازمی خصوصیت جس نے انسان کو اُن کی طرف متوجہ کیا ہے ان کی چمک دمک اور روشنی ہے۔ اس لئے روشنی کا ذکر ستاروں کے ناموں میں ضروری ہے اور روشنی کے معنے رکھنے والے مادے ہی ان ناموں کی اصل ہونگے باقی خصوصیات فروعی ہیں ان کا ذکر بھی ساتھ ساتھ ہوتا گیا ہے۔

سورج کا نام ایت جو اینوار میں ہے۔ مادہ اَسَّ کا اسم فاعل مؤنث ہے۔ معنی عربی سورج

کے ہیں۔ مؤنث اس لئے کہا گیا کہ عربی میں سورج کو مونث بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے "واذا الشمس کورت"

سورج کا دوسرا سنسکرت نام آدت ہے جو بکرمادت (بکرماجیت) میں شامل ہے یہ عربی آء ضیئت" کا مخفف و مبدل ہے۔ آ۔ اسم فاعل اتے کا بمعنی آفتاب ضیئت اصلاً ضوءیت بلفظ دال بوزن عفریت اسم فاعل ضوء کا تھا مگر و ماقبل مکسور ی سے بدل جاتا ہے اس لئے ضیءیت بن گیا جس کا مخفف دِت ہے معنی مجموعی۔ آفتاب روشن۔ ہوئے۔

سورج کا تیسرا ہندی نام بھان ہے وہ عربی باحان ازلوح مثل جابان ازجوب ہے باحان کے معنی۔ آفتاب نو برآمدہ۔ یا فقط باحا ہے یا بان۔ ازبین۔ معنی سب کے آفتاب ہیں۔

سور یہ شعریہ ہے یا سورج کا مبدل کیونکہ ج ی سے بدلتا ہے۔

سورج فاعل سرج کا ہے جس سے سراج بنا ہے سورج کے معنی اسپ سفید رنگ و مسرج یعنی زین کسا ہوا و روشن کنندہ"

سن سورج کا انگریزی نام ہے عربی سن بمعنی جرم بلند و سخت روشن و تابان"

شید سورج کا نام زبانِ ژند میں ہے یہ عربی مادہ شود سے بنا ہے جیسے حیل بالفتح حول سے معنی شید آفتاب۔

مہر دوسرا فارسی نام سورج کا عربی محرٌ از حرٌ آفتاب بسیار گرم"

ہور تیسرا فارسی نام سورج کا۔ حور ستارۂ سخت روشن یا اور آفتاب آتش رنگ یا حور از حرٌ آفتاب۔

خور چوتھا فارسی نام سورج کا۔ عربی غورٌ آفتاب نیمروز یا قریب افق نمودار سے
"خور از کوہ یکروز سر بر نزد"

آفتاب۔ عربی میں آب طابٌ ہے آبٌ از ابٌ بمعنی نیمروز طاب از طبٌ بمعنی سورج یعنے مہر نیمروز۔

شمس عربی بمعنی آفتاب و اسپ سپید تیز رو د مار

سورج کے جس قدر نام دُنیا بھر کی زبانوں میں آئے ہیں ان میں سے اکثر میں معنی گھوڑے

اور سانپ وغیرہ کے آئے ہیں اسی سبب سے ایرانی اور ہنود عقائد میں سورج کے ساتھ گھوڑا اور سانپ معبود قرار پائے۔ مگر یہاں بخوف طوالت زیادہ تشریح کو ملتوی کیا گیا پھر کبھی دیوتاؤں کے حالات میں لکھیں گے۔

سوم یا چاند

سوم عربی میں سُہُوم از سہم ہے معنی ستارۂ سخت روشن باشعاع

سَتِس دوسرا نام چاند کا ہے عربی سَقسَع بمعنی ماہ اندک یا صَحص مثلہ از حَصّ۔ سیم رنگ

مُون۔ انگریزی مخفف مُوہُ یا مُوہُون بوزن حَمدُوں کا ہے بمعنی جرم نیکو تابان و درخشان

چاند عربی سَعَند از سعد ہے معنی ستارہ سخت روشن میمون" س چ متبادل

قمر عربی ہے معنی ستارہ سپید باندک تیرگی۔

ماہ فارسی از مَوہ بمعنی ستارہ نیکو تابان و درخشان۔ سیم رنگ۔ اہل جوتش چاند کا رنگ سفید مانتے ہیں اور سورج کا سنہرا کیونکہ سعر بہ جس کو سنسکرت میں سوریہ کہتے ہیں بمعنی آتشیں ہے۔

منگل

عربی مَنکَل از نکل ہے خواہ مَرحَب کے وزن پر فاعل سمجھو۔ خواہ ظرف معنی آتش دار سرخ عقوبت و عذاب رساں۔ چنانچہ رنگت سُرخ ہے اور منحوس سمجھا جاتا ہے۔

مِرّیخ از مَرخ عربی بمعنی سرخ رنگ ستارہ۔ یا اصلاً مِرّیش از ارش ہے مثل مِسکین از سکن۔ ش۔ خ متبادل۔ معنی مِرّیش آتش رنگ و تابان سخت

مارس یونانی عربی مَارِش از ارش مذکورہ۔ مثل مَنکَل ہے

ٹیوز انگریزی عربی طَیبُوس از طوس بمعنی ستارۂ روشن سرخی مایل۔ ساخت بوزن فَیعُول۔

بُدھ

عربی میں وُضّح ہے۔ معنی ستارہ روشن قدرے مائل بنیاہی۔ اہل جوتش اس کا رنگ نیلا مانتے ہیں قوم نوح کا بت وُدّ یہی وُضّح ہے ض کی قرءت د کے قریب ہے۔

عربی نام عُطارِد ہے مگر یہ مرکب ہے اصلاً عُوّ طارِد ہے عُوّ از عوی ستارہ طارد بمعنی سیارہ روشن یعنی کوکب سیارہ طارد میں معنی سیاہی مایل بھی ہیں۔

مرکری یونانی نام اصلاً مَرشَرِیّ ہے مگر اس کو یونانی میں لکھیں تو مرکری بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ مَرّ بمعنی روز چار شنبہ یعنی بدھ شَرِیّ ستارہ روشن یعنی بدھ کے دن سے منسوب ستارہ۔

وِڈَن انگریزی وِضحاً ہے بمعنی ستارہ روشن اَوڈن جرمنی اوضحاً عربی ہے معنی ستارہ بسیار روشن

برہسپت یا برہسپتی

عربی میں بِراص فتیح ہے بِراص درخشانی و تابانی ستارہ مائل بزردی۔ فتیح از فتح مالک و قابض۔ اسکو زرد رنگ بتایا جاتا ہے عربی مشتری از شری ستارۂ بسیار روشن

انگریزی تھر جو تھرس ڈے میں آتا ہے عربی طَرّ بمعنی ستارۂ روشن بہ تیزی اَس نشان یا شناخت اضافت کے لئے آتا ہے۔

شکر

عربی شُقَرّ بوزن سُنحَر کہ پرندہ الیست بمعنی ستارۂ بسیار روشن مثلِ آتش

زہرہ عربی بمعنی ستارۂ روشن۔

فرائے انگریزی عربی فَرَاع ستارۂ بلند و گرم و روشن

سنیچر یا سنشچر

سنیچر عربی میں سَنیج شَرَ ہے سَنیج از سنج بمعنی روشن مائل بسیاہی اسی سے ہندی سنجھ و سانج بمعنی شام بنا ہے شَر ستارہ روشن مثل شرار آتش۔ و بد سنیج کی ج ی سے اور ش چ سے بدل کر سَنی چر ہوگیا۔

بعض لوگ جو سَنشچر بولتے ہیں وہ سَنجش شَر ہے سَنج بمعنی روشنی سیاہی مائل۔ ش برائے اضافت ج ی سے ش چ سے بدل کر سَن یش چر بنا لیتے ہیں بدی کی وجہ سے منحوس سمجھا جاتا ہے شین اضافت کا عربی قاعدہ پہلے مضامین میں آچکا ہے۔

کیوان فارسی نام ہے عربی کاوان کا امالہ کیوان مادہ کوَ۔ سے ہے معنی ستارہ خرد و روشن مثلِ روزن خُرد۔ اس کی رنگت سیاہی مائل مشہور ہے۔ سنیچر کو ہندی میں تھاہ بھی کہتے ہیں جس کے سبب سے سنیچر والے دن کو تھاور یعنی تھاہ وار بولا جاتا ہے وار بمعنی دن جو عربی میں دَہَر بمعنی روز روشن ہے۔ تھاہ عربی طاس از طوس بمعنی ستارۂ روشن سیاہی مائل کا مبدل و مخرب ہے۔

سَیٹر انگریزی عربی سَطعَر از سطع مثل سَعبَر از سعب۔ معنی سعب آب بسیار۔ سَعبَر بہارِ بسیار آب

سطح بمعنی ستارۂ بلند و روشن و خرد و تاریکی آمیز

اس کے بعد بروج فلکی کے سنسکرت نام حل کئے گئے جو حسبِ ذیل ہیں

عربی اور سنسکرت کے بالمقابل و مشابہ ناموں کے معانی میں تھوڑا تھوڑا فرق اس لئے ہُوا کہ ہر عربی لفظ کے اندر جو خواہ ایک ہی چیز کے کئی ناموں میں سے ایک ہو ایک جدا خصوصیت موجود ہے اور سنسکرت میں خصوصیتوں کی پرواہ نہیں ہے۔ ہر لفظ عام معنی میں بولا جاتا ہے جیسا سب عجمی زبانوں کا دستور ہے ؞

عربی نام	معنی سنسکرت لفظ کے	سنسکرت لفظ	عربی لفظ	معنی عربی لفظ کے
حَمَل	مینڈھا	میکھ	میش	بُز ش کھ تبادل
ثور	بَیل	برکھ	وِرک	ستور سواری
جوزا	جوڑا	منتُھن	مِطوء	مردے کہ دوست خود را کہ نظار او باشد ہمنشیں دارد
سرطان	کیکڑا	کرک	قَرص	جانور آبی گیرندہ مثل مقراض با دو خار خمیدہ
اسد	شیر	سنگھ	صِنق	شیر قوی و بدبو ق کھ تبادل (ص ک تبادل)
سُنبلہ	لڑکی	کَنیا	کنِیۃ	دختر دوشیزہ مستور از مرد
میزان	ترازو	تُلا	طُلاع	خبر دہندۂ اندازہ و مقدار بوزنِ غلام
عقرب	بچھو	برچھک	فرضخ	کژدم
قوس	کمان	دَھن	دَہنق	کمانِ نرم زہ سنسکرت دھن۔ دَھنک کا مخفف ہے جو دہنق سے مشابہ ہے۔
جدی	بکری	بکرا[1]	معز	
دلو	ڈول یا گھڑیا	کمبھ	قُم بکرہ	سبوئے آب کمبھ بھی سبوئے آب کو کہتے ہیں جس سے ڈول کا کام لیا جائے۔ (کوہپیند سرخ شیہ)
حوت	مچھلی	مین	میعن	جانور ساکن آب رواں نفع بخش

[1] عربی میں جدی اسی برج کا نام ہے جسکو ہندی میں مکر کہتے ہیں مگر جدی عربی میں بزغالہ نر کو کہتے ہیں اور ہندی جنتریوں میں مکر کی تصویر مگرمچھ کے مانند ہے اس صورت میں مکر عربی بمعنی جانور آبی درندہ مثل شیر وحملہ کنندہ وہی مگرمچھ ہے۔ آسمان کو بارہ حصوں میں تقسیم کرکے ہر حصہ میں چند ستاروں کے ایک جھرمٹ کو کہ جسکا ہم صورت دوسری جگہ نظر نہ آئے انتخاب کرلیا۔ اور اسی جھرمٹ کے سب ستاروں میں خطوط مستقیم ملے ہوئے فرض کرنے سے جس چیز یا جانور کی شکل بنی وہی اس برج کا نام رکھدیا۔ برج کے معنے حصنے کے ہیں۔ اب جھرمٹ کے ستاروں میں سے کچھ چھوڑ دینے اور جھرمٹ میں چند متصل ستارے ملانے کے بعد تصویر بنانے میں فرق ہوجائیگا اسی وجہ سے عربنے بکری کا بچہ اور ہندؤں نے مگرمچھ بنا لیا ؞

(باقی آئندہ)　　　قیصری

فنِ تنقید

تنقید اس قدر وسیع موضوع ہے کہ اُس پر کافی بحث کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری زبان میں اس وقت تک کوئی ایسی کتاب بھی موجود نہیں جو اس ضروری علمی شعبہ کے مبادیات ہی پر روشنی ڈال سکے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ شبلی و حالی کے قدموں کی برکت سے اب قدیم تذکرہ نویسی و تقریظ گوئی کے تنگ دائرہ سے باہر نکل کر کچھ لوگوں نے علمی پیرایہ میں اس قسم کے مضامین لکھنے شروع کر دئے ہیں جن میں کسی شاعر کے کلام یا کسی مصنف کی تحریر کا صحیح موازنہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ورنہ آج سے دس بیس برس پہلے تو علمی محاکمہ کے صرف یہ معنی سمجھے جاتے تھے کہ یا تو مبالغہ آمیز تعریف کا طومار جمع کر دیا جائے۔ اور یا غلطیوں اور نقایص کا ایک انبار تیار کیا جائے جس کے نیچے کسی صاحبِ کمال کا جوہر اصلی دب کر خاک میں مل جائے۔ اس قسم کی تنقید کی اس سے زیادہ کوئی وقعت نہیں کہ وہ نقاد کی ذاتی رائے کا اظہار ہے۔ اور اگر وہ خود اربابِ بصیرت و ذوق میں سے ہے تو بسا اوقات اُس کی رائے دوسروں کی راہنمائی کا باعث ہو سکتی ہے۔ تاہم چونکہ ذاتی تعصبات سے کوئی خالی نہیں۔ اِس لئے تنقید کا یہ اسلوب اکثر حقیقت سے گمراہ کرنے کا بھی ذریعہ بن جاتا ہے۔ مولنا محمد حسین آزاد کے جو احسانات اردو زبان و ادب پر ہیں۔ اُن سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے زندہ جاوید تذکرۂ آبحیات میں کہیں کہیں ذاتیات کی بناء پر فنِ تنقید کی دیانت کو کافی طور پر ملحوظ نہیں رکھا۔ علاوہ بریں اگرچہ اُن کے جادو نگار قلم نے یادِ رفتگان کو ایک زندہ محفل بنا دیا ہے۔ مگر جہاں تک اُردو شاعری کے ارتقاءِ ذاتی کا سوال ہے۔ اُن کا تذکرہ مثل سابقہ تذکروں کے اُس ارتقاء کے مختلف مدارج و کوائف اور اُن کوائف کے مادی و روحانی اسباب بیان کرنے سے قاصر رہا ہے۔ شبلی و حالی کی نقادانہ تحریریں اس بارہ میں زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ اور جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ان بزرگوں کو مغربی علوم سے صرف دُور کی آشنائی تھی۔ تو اُن کے موازناتِ علمی کی قدر ہماری نگاہ میں اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ شعر العجم۔ موازنۂ انیس و دبیر۔ حیاتِ سعدی اور دیباچۂ دیوانِ حالی۔ بلاشبہ

ایسی تصانیف ہیں کہ جن پر کسی زبان کو ناز ہو سکتا ہے۔ اور جو تنقیدِ علمی کے شاندار نمونے تصوّر کی جاسکتی ہیں +

اس تمہید کے بعد میرے مختصر مضمون میں صرف اتنی گنجایش ہے کہ فنِ تنقید کی ترقی کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے۔ جس سے ضمناً اُس کے بعض بنیادی اصول بھی معرضِ بحث میں آجائیں +

تنقید فطرتِ انسانی کے اُن اختراعات کو جانچنے کا پیرایہ ہے جو ادب اور فنونِ لطیفہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں + چونکہ اس وقت موضوع کو محدود کرنا مقصود ہے۔ اس لئے سطورِ ذیل میں صرف ادبی یا علمی تنقید کے تذکرہ پر اکتفا کیا جائے گا + فنونِ لطیفہ کی تنقید بجائے خود ایک مستقل تحریر کی محتاج ہے۔ اور اُس کو موجودہ مضمون میں شامل کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا +

اس وقت جملہ علوم و فنون جو مغربی دنیا میں رائج ہیں۔ اُن میں سے سب نہیں تو اکثر یونانِ قدیم کے مرہونِ منت ہیں + فنِ تنقید کی بنا ڈالنے کا بھی فخر یونانیوں ہی کو حاصل ہے، افلاطون کی جامع طبیعت نے اول اس فن کے اصول بیان کرنے کی طرف توجہ کی + لیکن افلاطون پر حکیم سقراط کی اخلاقی تعلیم کا رنگ غالب تھا۔ اس لئے اُس نے ادبی خوبصورتی کا معیار حسنِ معنی کو قرار دیا۔ اور علمِ ادب کی صوری خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا + یہ ظاہر ہے کہ علمِ ادب کی دو انواع ہیں۔ ایک وہ جو واقعات کے بیان پر اکتفا کرتی ہے اور دوسری وہ جو تخیلات اور تصوّرات پر منحصر ہے + قسمِ اول کی تنقید کے لئے ایسے نقّاد کی ضرورت ہے کہ جو واقعات پر حاوی ہو۔ لیکن دوسری قسم کو جانچنے کے لئے شاعرانہ تخیّل درکار ہے +

علمِ ادب کی اس تقسیم سے یہ بھی واضح ہے کہ مخترعاتِ ادبی میں سے ہر ایک کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ نفسِ مضمون اور اُسلوب۔ قسمِ اول۔ نفسِ مضمون سے زیادہ علاقہ رکھتی ہے لیکن قسمِ دوم میں اسلوب اگر نفسِ مضمون سے زیادہ وقیع نہیں تو اُس کا ہم پلّہ ضرور ہوتا ہے + ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا پہلو بھی ہے جسے ہم اثر یا جذب کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں یعنی وہ صفت کہ جو محسوسات و تخیّل کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے + اخلاق کو نہ تو حسنِ صورت

سے بحث ہے۔ نہ لطفِ تخیّل سے + وہ تو اُن صفات کا مجموعہ ہے۔ جو کائنات کے حقایق پر مبنی ہیں۔ اور جن کا مدار واقعات پر ہے + اس لئے یہ بات سمجھنی دشوار نہیں کہ حکیم افلاطون علمِ ادب میں واقفیت اور حقیقت پر کیوں مُصر تھا۔ اور سوز و گداز کی وقعت اُس کی نگاہ میں کس لئے کم تھی + مثال کے طور پر کوئی شعر لے لیجئے۔ نفسِ مضمون کے لحاظ سے وہ خواہ کتنے اعلےٰ پایہ کا کیوں نہ ہو۔ اگر بندش (یعنی اُسلوب) سُست ہے۔ تو کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا + اور اگر دونوں باتیں موجود ہیں تو بھی ممکن ہے کہ اثر سے خالی ہو۔ اور حسنِ کلام کے انتہائی مقام کو نہ پہنچ سکے + لیکن افلاطون کے خیال میں اگر اُس کا مضمون حقیقت کے قریب ہے تو وہ اعلےٰ پایۂ کا شعر ہے + شاید یہ کہنا اُس پر تہمت نہ ہوگا کہ اُس کی رائے کے مطابق پندنامہ سعدی دیوانِ حافظ سے بہتر ادبی نمونہ ہے + لیکن یہ ایسی رائے ہے کہ جس سے بہت کم لوگوں کو اتفاق ہو گا +

افلاطون کے شاگردِ رشید ارسطو نے اپنے اُستاد کی اس کوتاہی کی تلافی کرنیکی کوشش کی۔ اور اپنی شہرہ آفاق تصنیف "بوطیقا" (پوئیٹکس) میں اُس نے اس مبحث پر طبع آزمائی کرتے ہُوئے یہ اعتراف کیا۔ کہ علم ادب کے لئے اُسلوب اور نفسِ مضمون دونوں یکساں طور پر لازمی ہیں۔ اور مضمون خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اگر طرزِ بیان دلکش نہیں تو اکتسابِ حسن سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا + علاوہ ازیں ارسطو نے سوز و گداز کو بھی کلام کا جوہر قرار دیا۔ اور قلبِ انسانی پر جو کیفیت دردناک مضامین سے طاری ہوتی ہے۔ اُس کے واضح کرنے میں بہت سا زورِ قلم دکھایا + تاہم ارسطو نے بھی ادبیات کے اجزائے متخیلہ کی ترکیب کو کماحقہ نہیں سمجھا اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اُس کے زمانہ میں علم النفس کا مطالعہ اس قدر صحیح اور وسیع نہ تھا کہ تخیّل اور اُس کے کرشموں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کر سکنے +

زمانہ حال میں فنِ تنقید کو جو فوقیت حاصل ہے وہ تمام و کمال علم النفس کی تحقیق کا نتیجہ ہے + اس کا منشاء اُس کیفیت کو واضح کرنا ہے۔ جو خوبصورت کلام سے سامع کے دل پر وارد ہوتی ہے اور اُن اسباب کا یقین ہے کہ جو اس کیفیت کو پیدا کرتے ہیں + یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ عصرِ حاضرہ کی تنقید کو زیادہ تر ادب کے اُس تیسرے پہلو سے تعلق ہے کہ جسے

میں نے سطورِ بالا میں اثر یا جذب کے نام سے ذکر کیا تھا۔ نقاد کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی شاعر یا مصنف کے کلام کو اس نظر سے دیکھے کہ تخیل کو حرکت میں لانے کی اُس کو کہاں تک قدرت حاصل ہے۔ اور اُس کے تصورات ہمارے کون سے جذبات و محسوسات میں تموج پیدا کرتے ہیں۔ مضمون بجائے خود بلند ہو یا پست۔ انوکھا یا عامیانہ۔ اُسلوب فصیح ہو یا غیر فصیح۔ مشکل ہو یا آسان۔ لیکن اگر کلام میں یہ قوت ہے کہ ہمارے دماغ کو تصورات کا آماجگاہ بنا سکے۔ تو وہ قابلِ قدر ہے۔ ورنہ نہیں۔ یہ تو ضرور ہے کہ کمال تک پہنچنے کے لئے تینوں صفات کا مجموعہ لازمی ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ کوئی تصنیف نفسِ مضمون اور اُسلوب دونوں کے لحاظ سے پسندیدہ ہو۔ لیکن اگر اُس میں یہ تیسری صفت مفقود ہے تو اُس کو اس زمانہ میں وہ شہرت حاصل نہیں ہو سکتی جو خالی اثر یا جذب کی موجودگی سے نصیب ہو سکتی ہے۔ اس وقت بہت سے ایسے مصنف ہیں کہ جن کی شہرت صرف اس وجہ سے ہے کہ اُن کی تحریر پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر ایک کیفیت طاری کر سکتی ہے۔ ورنہ اُن کے مضامین اکثر درجہ ثقاہت سے گرے ہوئے یا پیش پا اُفتادہ ہوتے ہیں۔ اور اُن کا اُسلوب بھی ان محاسن سے عاری ہوتا ہے۔ جو اکثر زمانوں اور ملکوں میں تحریر کی زینت سمجھے جاتے ہیں۔ غرضیکہ افلاطون اگر ایک حد کو پہنچا ہوا تھا تو اس زمانہ کے معنی شناس دوسری حد کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ وہ علم ادب کی خوبی کو صرف اُن صفات پر محدود کرتا تھا۔ جو کائنات کے حقایق و معارف سے علاقہ رکھتی ہیں۔ اور جو تمام عالم کے انسانوں میں مشترک ہیں۔ خلاف ازیں یہ لوگ اُس خوبی کو اُن صفات پر منحصر رکھتے ہیں۔ کہ جو مختلف آدمیوں پر مختلف کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ اور جن کا معیار قائم کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اسکا ایک نتیجہ تو یہ ہوا ہے کہ علم ادب میں جدت پسندی اور خیال آفرینی کی طرف میلان زیادہ ہو گیا ہے لیکن دوسرا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ ہر ایک مصنف خود کو مطلق العنان تصور کرنے لگا ہے۔ اور کسی قاعدہ یا اصول کی پابندی کو خواہ وہ صرفی یا نحوی قاعدہ ہی کیوں نہ ہو اگر باعثِ عار نہیں تو کم از کم ایک قسم کی ناگوار قید ضرور سمجھا جاتا ہے۔ تاہم اس رجحانِ خیال کا تنقید پر یہ مفید اثر پڑا ہے کہ اب نقاد نکتہ چیں بننا مذموم شعار خیال کرتے ہیں۔ اور ہر ایک ادبی اختراع کو نظرِ وقعت سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نقاد کا فرض یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ادیب یا شاعر کے مفہوم تک اُس کے نقشِ قدم پر چل کر رسائی حاصل کرے۔ اگر وہ ادیب یا شاعر کسی غیر ملک یا دوسرے

زمانہ کا ہے۔ تو نقاد کو چاہیئے کہ ہر ایک شئے کو اُس کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا سیکھے۔ اور اُس کے کلام کا اندازہ لگانے سے پیشتر اُن حالات و کوائف سے آگاہ ہونے کی کوشش کرے کہ جو اُس زمانہ و مُلک کے ساتھ مختص ہیں + غرضیکہ اب نقاد کی حیثیت ایک جج یا مجسٹریٹ کی سی نہیں کہ جس کے سامنے بے چارہ مصنف مجرمانہ حیثیت میں اپنی کوتاہیوں کی جواب دہی کے لئے حاضر ہوتا ہے۔ بلکہ ایک طالب یا عقیدت مند کی حیثیت ہے جو مصنف سے فیض و استفادہ کا خواستگار ہوتا ہے۔ اور اُس کے ارشاد و راہنمائی سے اپنا مقصود حاصل کرنا چاہتا ہے +

محمدؐ سعید

"ز - خ - ش"

وہ عندلیبِ خوش الحان جس کے عرفان پاش نغمے اُس کی قفس کی تیلیوں سے نکل نکل کے ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے، یکایک خاموش ہو گئی۔ نغمے فضا میں متلاطم ہیں، مگر عندلیب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساکت،

وہ حقیقت طراز مگر شیریں آواز سرا پردۂ دولت کے پیچھے سے (جہاں سے بے معنے خندہ اور فضول مکالمہ کے سوا کچھ کم سُنائی دیتا ہے) سُنا ہی تھی کہ صدق و صفا، علم و عرفان، سوز و التہاب، درد و گداز کیا ہیں۔

اور صدق و صفا، علم و عرفان، درد و گداز سوگوار ہیں کہ انکی مشاطۂ انکو دلآویز آرائشوں میں اب پیش نہ کریگی۔

وہ ایک عندلیب تھی، جو قفس میں پیدا ہوئی، قفس میں جی، اور اُس نے قفس ہی میں دم توڑا۔ اُس چند گز نیلگوں آسمان کے سوا جو اُسکے صحنِ خانہ پر حسرت بار رہا، اُس نے فطرت کی زیبائش، آفریدۂ دستِ انسان کی آرائش نہ دیکھی، آفتاب جو دُنیا کو زندگی اور حرارت بخشتا ہے، تیلیوں سے پلٹے ہوئے کپڑے سے گذر نہ سکا۔ لیکن خود اُس کے قلبِ منوّر نے ایک شمع روشن کی جس نے اُسے باہر کے نور سے بے نیاز کر دیا۔ شمعِ تخیّل!

وہ اپنی مختصر مگر متجلی زندگی میں اپنے تئیں "خاک نشیں ز۔خ۔ش" کہا کی آج حقیقتاً وہ خاک نشینی کی آرزو مند آسودۂ خاک ہے۔

"خوش درخشید مگر شعلۂ مستعجل بود"

(بلدرم)

لحم خنزیر

ہندو شاستروں میں بھی جنگلی اور پروردہ سور کے گوشت کے متعلق ذکر ہے۔ عام خیال ہے کہ سور کا گوشت یعنی لحم خنزیر جو یہودیوں اور مسلمانوں میں حرام ہے ہندوؤں کے ہاں جائز ہے۔ اور اسی خیال پر عمل ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہندوؤں میں استعمال شاید ضد سے یا کسی اور وجہ سے شروع ہو گیا ہوگا ورنہ اگر شاستروں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندو شاستروں کی رُو سے یہ گوشت حلال نہ تھا۔ اس کا ذکر ہم آئندہ کرینگے۔

ہم نے دو چار مسلمان بھائیوں سے دریافت کیا کہ اس خاص جانور کے گوشت سے منع کرنا کن وجوہات پر مبنی ہے؟ کسی نے کوئی کسی نے کوئی وجہ بیان کی لیکن ہم قائل نہ ہوئے آخر ایک وجہ ہمارے خیال میں آئی جو ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:-

ہندوؤں کے ہاں مچھ۔ کچھ۔ اور وراہ اوتار گذرے ہیں یعنی بیان کیا گیا ہے کہ وشنوجی (جو خدا کا نام ہے) اِن تینوں شکلوں میں اس کرۂ ارض پر نمودار ہوئے ہیں۔ یعنی مچھلی کچھوے اور سور کی شکلوں میں۔ بعض لوگ ان باتوں کو لفظی طور پر صحیح مانتے ہیں بعض اہل علم اس بیان کو استعارہ سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ ازمنۂ طبقات الارض کے درجے ہیں۔ سور کی پیدائش سے گویا Mammalia (بچہ دینے والی) مخلوق ظہور میں آئی ہے۔ خیر اس سے تو بحث نہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سور کا ادب ہندوؤں میں ہو چکا ہے۔ سور کی شکل کے بت اس وقت جنوبی ہند کے مندروں میں موجود ہیں اور اُن کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ خیال صحیح سمجھنا چاہیئے کہ تجربہ۔ کراہت۔ عظمت یا عزت وغیرہ کے خیالات نے اہلِ مذہب کو حلال و حرام کے قرار دینے میں ضرور امداد دی ہوگی۔ گائے کا گوشت بوجہ عظمت کے منع ہے۔ بعض جانور مثلاً مردار خور۔ شکار خور جانور کراہت کی وجہ سے منع ہوئے ہونگے۔ اور بعض دوسرے مضرِ صحت ہونے کی وجہ سے منع ہونگے۔ چنانچہ شاستروں میں مچھلی اور کچھوا بھی جائز نہیں لیکن عمل اس امتناعی حکم پر نہیں رہا۔ علیٰ ہذا ہمارا خیال ہے کہ سور کا گوشت بھی اس وجہ سے منع ہوگا کہ اس شکل کو وشنوجی نے اوتار ہونے کے لئے اختیار کیا تھا۔

ورنہ ہماری عقل میں ایسا مقوی گوشت حضرتِ انسان کے دست برد سے کیسے بچ سکتا تھا ؟

ایک کتاب موسوم بائبل اِن انڈیا میری نظر سے گذری۔ یہ کتاب ایک فرانسیسی لوئس جو کولیٹ نے لکھی تھی جو ایک انگریز نے ۱۸۶۹ء میں ترجمہ کی اور طبع ثانی پانینی پریس الہ آباد سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ مصنف ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بعض مقامات نہایت کامیابی کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ موسوی قانون ہندو قانون کی نقل ہے۔ ہمیں بعض مقابلہ کے حوالہ جات پڑھ کر تعجب ہوا۔ اور اگر وہ حوالجات صحیح ہیں تو کہیں کہیں تو بالکل نقل معلوم ہوتے ہیں اس مضمون میں اور باتوں کے ذکر کی گنجائش نہیں اتنا لکھنا کافی ہے کہ مصنف نے قوانین موسوی اور ہندو شاستروں کا مقابلہ کیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حلال و حرام کے متعلق دونوں قانون ایسے مشابہ ہیں کہ ان میں گویا خاندانی تعلق معلوم ہوتا ہے مشتاقِ تحقیقات اس کتاب کو خود پڑھ سکتا ہے۔ ہم یہاں ذیل کی عبارت نقل کرتے ہیں (صفحہ ۱۵۶)

''منو (Manu) اور دیگر برہمنی کتابوں میں ذکر ہے کہ اعلیٰ ذاتوں کو اُن چارپایوں کا گوشت نہ کھانا چاہیئے جن کے کھُر منقسم نہ ہوں اس حکم کا ایک استثنیٰ سور ہے گو اس کے کھُر پھٹے ہوئے ہیں یعنی ایک کھُر نہیں۔ یہ ممانعت پروردہ سور کے متعلق ہے نہ کہ جنگلی سور کے یعنی سور کا گوشت حرام ہے''

سانکھ سنتھا صفحہ ۶۴۷

ایک سال کی تعزیری پراسچت اُس شخص کے لئے ہے جس نے پیاز۔ لہسن۔ کھُمبہ۔ اونٹ۔ ہاتھی۔ چھپکلی۔ پروردہ سور۔ یا مرغ کا گوشت کھا لیا ہو۔

(نوٹ) اس حُکم کی تعمیل کشمیری اور بعض برہمنوں اور دیگر اہل ہنود میں اس وقت تک جاری ہے۔ چنانچہ میری قوم کے لوگ مرغ۔ لہسن۔ پیاز سے احتراز کرتے ہیں سور کا گوشت اُن کے گھروں میں نہیں پکتا گو اس کو ممنوع تصور نہیں کیا جاتا +

وشششت سنتھا صفحہ ۱۰۷ میں ذکر ہے کہ پورانوں میں جنگلی سور کے گوشت کے استعمال کے بارہ میں یعنی حلال یا حرام قرار دینے میں اختلاف رائے ہے :۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پروردہ سور تو مسلّماً حرام تھا بعض نے جنگلی سور کو بھی حرام قرار دیا ہے

آرزُو

اِنسان خلاصۂ کائنات ہے۔ وسعتِ عالم کی تمام نیرنگیاں اس کے انوارِ سینہ کا عکس ہیں۔ یہ اجمال ہے۔ دُنیا۔ مافیہا، ماورا، اس کی تفصیل ہے۔ جو لوگ اس راز کے سمجھنے سے قاصر ہیں وہ مناظرِ موجودات پر ایک لمحہ کے لئے نظر دوڑائیں۔ پھر چشمِ بصیرت اپنے اندر وا کریں اور دیکھیں کہ قدرت کی ہر بیرونی نیرنگی کے بالمقابل اُن کے اندرونِ سینہ کوئی نہ کوئی لطیف جذبہ یا احساس ہے جس کی کیفیتِ اضطراری اُس نیرنگی سے علی الدّوام وابستگی پر مجبور ہے۔ اِسی مجبورِ جذبہ کا نام آرزُو ہے۔ اگر ہمارا علم اپنی تمام غائتوں کو پا سکتا اور پھر اس علم کے ساتھ ہمیں قدرت ہوتی کہ عالم کی نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف بوقلمونیوں کو گن سکیں۔ ساتھ ہی اپنے جذبات کی گوناگونی کا بھی اندازہ کر سکیں تو یقیناً ہم اس نتیجہ پر پہنچتے کہ جس قدر قدرت میں نیرنگیاں ہیں اُسی قدر ہمارے دل کے اندر آرزُوئیں اور حسرتیں ہیں*

صانعِ مہربان نے اپنی محبوب ترین مخلوق کے سینہ میں جہاں آرزو جیسا درخشندہ جوہر پیدا کیا۔ وہاں اس جوہر کی ضو افگنی کے لئے وہ وسعتیں اور فضائیں تیار کیں کہ اگر وہ ابد تک چمکتا دمکتا رہے تو بھی ان فضاؤں کی حدّوں کو نہ پا سکے۔ صورت ہے تو ایک سے ایک بڑھ کر۔ رنگ ہے۔ تو ایک سے ایک انوکھا۔ بُو ہے تو ایک سے ایک بھینی۔ غرض کیا کیا ہے اور کس کم و کیف میں نہ ہم شمار کر سکتے ہیں نہ یہ شمار کے احاطہ میں ہے۔ اگر مناظرِ ہستی شمار میں آ سکتے تو پھر ہستی مدتوں اس سے پہلے فنا ہو چکی ہوتی کیونکہ انسانی آرزوئیں مدت کی معدود و محدود ہو چکی ہوتیں*

جو چیز دُنیا میں نیا منظر پیدا کرتی ہے یا ایک پنہاں منظر کو آشکارا کرتی ہے۔ وہ پہلوئے انسان کی نئی آرزُو یا نئی آشکارا ہونے والی آرزُو ہے۔ اگر نئی آرزوئیں نہ اُٹھیں تو نئے مناظر بھی پیدا نہ ہوں (یاد رہے کہ لفظِ مناظر اپنے وسیع ترین معنوں میں یہاں استعمال ہُوا ہے۔ ناظرین کی نظر محض قدرتی مناظر تک نہ رہے۔ تمام مادی۔ عقلی۔ روحانی مقاصد لفظِ منظر کی تعریف میں شامل ہیں) منظر و آرزُو میں صرف حواسِ خمسۂ ظاہری ہی کا رشتہ نہیں۔ نہ حواسِ ظاہری کے اطمینان سے آرزو کی ہو سکتا ہے نگاہِ غور سے دیکھو تو آرزُو کا مقصد حصولِ منظر اور آرزُو کی تکمیل ہے

ممکن ہے کہ بعض مناظر کی دید یا شنید ہی آرزو کا مقصد ہو اور اُس کی تکمیل بھی۔ مگر یہ صرف مناظر کی بعض اقسام ہیں نہ سب۔

یہ تو قلبِ انسان کا قصّہ ہے اور الم نشرح۔ حقیقت آشنا نظریں اور پتے دیتی ہیں۔ نہ صرف انسانی دل و دماغ ہی سے خواہشات و مقاصد مستلزم ہیں۔ بلکہ ہر جاندار و بے جان میں جو قوتِ عمل یا اُس کی ہیئتِ کذائی نظر آتی ہے۔ اہلِ بینش کی نگاہِ نکتہ آگاہ میں سب جوہرِ آرزو کا کرشمہ ہے اور اُس کی مادی نمود۔ علامۂ اقبال جنہوں نے ہم پریشاں خاطروں کو سرِّ آرزو سے از سرِ نو روشناس کیا ہے۔ آرزو کے اس اعجاز کو اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں یُوں بیان فرماتے ہیں :-

چیست اصلِ دیدۂ بیدارِ ما | بست صورت لذتِ دیدارِ ما
کبک پا از شوخیِ رفتار یافت | بلبل از سعیِ نوا منقار یافت
نے بروں از نیستاں آباد شد | نغمہ از زندانِ اُو آزاد شد

ہر چیز کی ہیئتِ کذائی اس کی باطنی آرزو کا نتیجہ ہے۔ یہی باطنی آرزو اصلِ زندگی ہے۔ زندگی جب مادہ کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے تو اپنی بقا و حفاظت کے لئے طرح طرح کے اسباب و آلات وضع کرتی ہے۔ مذہب کی زبان میں یوں کہینگے۔ کہ وہ احسن الخالقین جب جوہرِ حیات کو مادہ میں ودیعت رکھتا ہے۔ تو اس جوہر میں وہ زور تا بانی مخفی رکھ دیتا ہے جو اپنی خود نمائی میں اپنے لباس یعنی مادہ کو جس نشو و نما ہیئت و صورت میں چاہے بتدریج بدل دے۔ زندگی نے جس قوت و انداز سے مادہ کو احسن التقویم میں بدلا ہے۔ اور پھر آجتک اِس انتہائی و اعلےٰ پیکر سے بڑھ کر کسی اور احسن تر لباس میں جلوہ پیرا ہونے کی جستجو نہیں کی۔ اُسے اقبال کی کفایت نگاری نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

بینی و دست و دماغ و چشم و گوش | فکر و تخیل و شعور و یاد و ہوش
زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت | بہرِ حفظِ خویش ایں آلات ساخت

عقل و جذبات جو بشر کے مایۂ امتیاز ہیں۔ سب کے سب زندگی یعنی حقیقتِ آرزو ہی کی نُدرت ں کے مظاہر ہیں یہ ندرت آفرینیاں جو علوم و فنون۔ قوانین و مقاصد اختراع و ایجاد کرتی ہیں تنسیقِ سے عالم ... قیام و نظام میں صورت گیر ہوتا ہے۔ زندگی کی یہ مُصلح ہے۔ مگر جب تک عقل و جذبات اپنی جدّت

میں روز افزوں نہ ہوں۔ حفاظت و اصلاحِ مادہ میں تبدیل و تقلیب سے کام نہ لیں۔ نئے مقاصد و مناظر منصۂ شہود پر نہ لائیں۔ اُن کی ہستی معرضِ خطر میں پڑجاتی ہے۔ نہ صرف ان کی ہستی بلکہ وہ زندگی پژمردہ ہوکر مرجاتی ہے جس زندگی کا وہ حاصلِ ارتقا تھے۔ مگر عقل وجذبات کی تمام جدّت طرازیاں خود آرزو کی نُدرت کوشیوں پر مبنی وموقوف ہیں۔ اگر آرزو میں نیرنگی ہے تو عقل وجذبات بھی نیرنگی دکھانے پر مائل ہیں۔ اگر آرزو خوابیدہ ہوگئی ہے۔ تو عقل وجذبات کو پہلے مُردہ شمار کرو۔ عقل یا جذبہ کی ایک پرواز اگر تمہارے مقاصد کو عرش کی بلندی تک اُٹھا سکتی ہے تو ترکِ آرزو کی ایک جھٹک تمہارے عرش تک پہنچے ہُوئے مقاصد کو یکدفعہ زمین پر گرا سکتی ہے۔ بقول اقبال

تا اُمید از آرزوئے پیہم است　　نا امیدی زندگانی را سم است

نا امیدی ہمچو گور افشاردت　　گرچہ الوندی زپا افشاردت

آدمؑ کا خلد سے نکلنا ایک قِصّہ ہے جو لوگوں کی زبان پر ہے۔ مگر ایک حقیقت ہے جس سے لوگ ناآشنا ہیں۔ ایک آرزو کے پُتلے کو جنت سی ازلی۔ ابدی۔ غیر منقلب و غیر متبدل جلوہ گاہ میں پیدا کرنا اور پھر وہاں آباد ہونے کا حکم دینا محض ایک بہانہ تھا اور ایک حکمت۔ خدا جانتا تھا کہ آدم کی آنکھ کھلتے ہی اس کا جی ان مناظر پر للچائیگا۔ یہ جو کچھ دیکھیگا اس کے حصول کا خواہشمند ہوگا۔ جسے حاصل کرلیگا اُس پر تصرّف کی سعی کریگا۔ مگر بغیر آدم کو جنّت میں پیدا کرنے اور پھر اسے وہاں سے نکال کر زمین پر پھینکنے کے خود اس ہستی کو پیدا کرنے اور اُسے مامور کرنے کا کوئی بہتر ذریعہ مصلحت میں نہ تھا۔ پیدا تو آدم کو دُنیا میں کرتے۔ مگر دُنیا کے مناظر جنّت کے مناظر کے کب ہم پلّہ ہو سکتے تھے؟ مقصود یہ تھا کہ آدم کے سینے میں آرزوئیں تو مناظرِ جنت کی بھری جائیں۔ اور پھر دُنیا میں اُتارا جائے۔ تاکہ قیامت تک اگر مناظر ہستی ختم بھی ہوجائیں تو اس کی آرزوئیں ختم نہ ہوں ان میں جو تصرف کی حسرت ہے وہ نکل جائے تو پھر جب آدم ایک طوفانِ آرزو بن چکا آرزوئیں اپنی خامی سے پختگی تک پہنچ چکیں۔ حتیٰ کہ ایک خاص دلکش منظر کے تصرّف پر مائل ہُوا بلکہ تصرّف کر ہی چکا تو حُکم دیا گیا کہ بس یہ مناظر تصرف کے لئے نہیں۔ تصرّف کی خواہش کو پیدا کرنے کے لئے تھے۔ تیرے تصرّفات کے لئے تیرے لئے اور جنت رادنے جنت تیار ہے۔ جاؤ۔ اس میں اپنی آرزوؤں کی طاقت کو آزماؤ۔ ان کو جولانیاں دے اُ کسر اُٹھا نہ رکھو۔ ہماری شانِ خالقیت مقتضی تھی: ایک کرشمہ جو د کرشمہ پرور ط

جس سے ہماری ذات بے نیاز و مستغنی ہے۔ اسے تمہارے دل کے اندر رکھ کر اس کی نیرنگیوں کو آشکار کریں۔ اب تم اسے دل میں رکھو۔ دنیا کی جنت میں اس کے کرشمے دیکھو اور دکھاؤ۔ اعتدال میں رہو گے "کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا" پر کاربند رہو گے تو یہ دُنیا تمہارے ہی لئے ہے اور تمہاری ہے۔ اسکی نعمتوں کو ہماری دی ہُوئی نعمتیں سمجھتے رہو گے تو یہ نعمتیں جتنی چاہو گے جتنی تلاش کرو گے اتنی بڑھتی جائیں گی۔ اور جب بالآخر تمام پا چکو گے۔ اور جب ہماری مشیئت ہو گی کہ یہ ختم کر دی جائے۔ اور دیکھ لینگے کہ تمہاری تصرف کی حسرتیں نکل چکی ہیں۔ تو پھر تم اُسی گھر میں جس سے نکالے جا رہے ہو آباد کر دیئے جاؤ گے۔ پھر کبھی ابد تک نہ یہاں سے نکلو گے اور نہ یہاں واپس آؤ گے +

معلوم ہُوا یہ دُنیا اسی غرض کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس میں انسانی آرزوئیں اپنی نشوونما پائیں مناظر اپنے جلوے دکھائیں۔ ہر نئے دن نئی آرزو نئے مقصد سے ہم آغوش ہو۔ ہر سینہ ہجوم تمنا سے معمور ہو۔ دُنیا کا کوئی جلوہ۔ کوئی کرشمہ۔ کوئی مقصد۔ کوئی منظر ایسا نہ ہو جس کا کوئی چاہنے والا نہ ہو۔ غرض ہر انسان پابندِ آرزو ہو۔

کوئے عشق است ہمہ دانہ و دام است اینجا ۔۔۔ جلوۂ مردمِ آزاد حرام است اینجا

آرزوئیں اُسی وقت تک زندہ رہ سکتی ہیں جب تک وہ نئے مقاصد پر مائل ہوتی رہیں۔ خود نئے مقاصد پیدا کرتی رہیں۔ ایک مقصد کے حصول کے بعد آرزو کو نیا مقصد پیدا کرنا چاہیئے۔ نئی اُمید کی آگ انسانی دل کے اندر لگانا چاہیئے۔ نئے مدعاؤں کے مناظر اس کی آنکھ کے سامنے لانا چاہئیں۔ جب یہ ہو گا تو خواصِ ظاہری از خود آمادہ کار ہونگے۔ زندگی ایک مسلسل جستجو بن جائیگی۔ مقاصد کے رستہ کی تمام رکاوٹیں بہ آسانی مغلوب ہو کر رکاوٹیں نہ رہینگی۔ بلکہ رستہ کے طے کرنے میں ممد و معاون ہونگی مقاصد کے حصول کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنی قوت و طاقت کا احساس ہوتا جائیگا۔ حتیٰ کہ اس کی اُن مقامات پر رسائی ہو گی جن کا پہلے اُس کے وہم میں آنا ناممکن تھا۔

آرزو بُری بھی ہو سکتی ہے۔ مگر بُری آرزو کا پیدا ہونا نفس کی کمزوری اور عقل کی خامی سے ہے آرزو کو آرزو نہیں کہیں گے۔ وہ حقیقت میں ترکِ آرزو ہے۔ کیونکہ صحیح و پاک آرزو سے بعید ہے۔ کے بعد اب ہمیں یہ دکھانا ہو گا۔ کہ قوتِ آرزو نے دُنیا میں کیا کیا انقلاب پیدا عالی مقاصد تک راہنمائی کی ہے۔ اور ضعفِ آرزو یا ترکِ آرزو نے کتنے

جاتی ہے جن کا قلب سوائے ایک منتخب آتش کے شعلہ کے، ہر چیز کے لئے بند ہو چکا ہے، جو ایک یگانہ اور برگزیدہ عشق کی محشر زائیوں میں اپنی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ سال میں ایک مرتبہ اس برکت دار اور حاصل خیز زمین پر جو اُس کی صحنۂ عشق و حیات رہ چکی ہے آتی ہے، اور اُس کے بازو، اور شانے سادہ مگر پُر ارماں حرکتِ حیات سے متحرک معلوم ہوتے ہیں، بولتے وقت، خورمے کے درختوں کی شاخوں کے نیچے، ہوائیں اوپر تلے آتی جاتی ہے۔ اور اُس کی عظمتِ رفتار سے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ زمین سے کسی زیادہ بڑے سیّارہ کی ملکہ ہے، اُس کی آواز میں گہرے، صمیمی اور درد انگیز نغمے بھرے ہوتے ہیں، وہ کہتی ہے :

"اے ارضِ مقدس! جس نے میری روح کو آتش و حرارت میں مبتلا پیدا کیا ہے۔ اے تیرے پُر فیض، حیات و فراوانی بخش سینہ پر تیری حقیقی بیٹی پھر آئی۔ جس طرح تو اپنے سینے، اور اپنے دل کی گہرائیوں میں سے آخری قطرۂ محبت و فیض کسی کو دینے سے دریغ نہیں کرتی، لیکن خاموش رہتی ہے، میں بھی اپنے عشق کے درد و سوز کے بیان کرنے اور اس تصویر میں رنگ بھرنے سے احتراز کروں گی، مگر کیا یہ بھی نہ کہوں کہ تیری حقیقی اولاد یوسف نے ہی، میری اس عصمت و وقار کے باوجود، میری روح میں یہ آگ بھڑکائی تھی۔ وہ جب اس دنیا میں تھا، اس وقت جس طرح میرا دل اپنی منفرد اور پوری قابلیتِ جوش کے ساتھ، اُس پیارے چہرے کے لئے تڑپتا تھا، اب بھی اسی طرح تڑپتا ہے :

تو اپنے فیض کو، اپنی ٹھنڈی اور بیجان برکت کو آخری دم تک اپنی اولاد کو بخشے گی، میں، تیری سچی بیٹی زلیخا بھی ابد تک اپنی روح کے آخری شعلے، آخری حرارت کو اُسی محفوظ رکھوں گی"

اپنے ایمانِ عشق کی اس طرح صمیمیتِ روح سے تکرار کر کے وہ، بازوؤں کو اس نمناک و پُر فیض زمین کی طرف اس طرح بڑھاتی ہے اس کی تقدیس کرتی ہے اور آخر کار اُن سبز ہلکی موجوں میں لپٹنا چاہتی ہیں ڈوب کر چلی جاتی ہے :

:

(۲)

اس کے بعد، کلیوپیٹرا اپنے تمام طنطنۂ احتشام، اپنی تمام شان وشوکت کے ساتھ نکلتی ہے وہ اُس سج دھج سے آتی ہے جو اُس نے اپنے آخری سپاہی عاشق کو دکھائی تھی، اُس عاشق کو جس نے اُس کے متلون اور ہرجائی دل کو موہ لیا تھا،

سواری کا بجرہ سونے کا ہے، چپو چاندی کے ہیں، بادباں ریشم کے، جن میں سے وہ معطر خوشبوئیں نکل رہی ہیں جو لذیذ آرزؤں سے ہوا کو بھی مست کر رہی ہیں۔ خود زرتار تکیوں سے کمر لگائے اپنی حسرت اور ارمانوں کو لئے دعوت کار، طلبگار لیٹی ہے۔ اُس کے نازک نرم جسم کی ادنے حرکت میں لطیف اشارات احتراص پیدا ہوتے ہیں جنہیں بلیغ موسیقی سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے اور نہیں سمجھا سکتی۔ اُس کے ساؤنلے نازک چہرے کے گرد، اُس کے چمکیلے اور نرم بال، اک ادائے تسلیمیت سے اپنی پوری رونق کے ساتھ پڑے ہوئے، ایک دل آویز تصویر کا چوکھٹا بنے ہوئے ہیں اس کی دلکش پیشانی میں، اس کی مخمور آنکھوں میں، اُن ہونٹوں میں جس کی ہر جنبش میں اک داستانِ عشق پنہاں ہے، اُس کے حسین جسم کے ہر عضو میں، غم الفت۔ دیوانگیٔ محبت، ابتلا و مظفریت، جلوے دکھاتی ہیں۔ اس عورت کا سیما، اس عورت کی روح ناغنا ہی ہے۔ اس کی زندگی ایک مدید لمحۂ حرص رہی ہے۔ جس میں وہ ہر آن ایک نئے جلوے اک نئی روح سے ظاہر ہوئی ہے، اس وقت کہ اُس کا بجرہ نیل پر تیرتا ہوا جا رہا ہے، اُس کے چہرے کے گرد، ہزار ہا رحسین جنہوں نے اس کے عشق کے عذاب اُٹھائے ہیں، اب بھی اُن عذابوں سے سرتاپا، مگر پروانہ وار چکر لگا رہی ہیں۔ ان پروانوں میں کون کون ہے؟ بڑے سنجیدہ دماغ اگ ہیں جو اُس کی متلون مزاجی، کبھی متواضع، کبھی مغرور اداؤں کے شکار ہو چکے ہیں، محتشم شاہنشاہ ہیں، یہ اُس حسن کی کشش میں کھنچے چلے آئے ہیں جسے وہ بچارے سب کے سب وہ اسیر ہیں جنہوں نے تھوڑی دیر کے لئے بیدرد ہاتھوں سے زہر کے پیالے پیئے اور نیل میں ڈبوئے عالم میں وہ ایک بڑی ایکٹرس تھی، جو عشق کا کھیل کھیلنے ہی کو آئی تھی،

مگر آج کی رات، جبکہ جون کی گرمی میں ریگستان آتشِ حیات سے متحرک ہے، اور وہ زمین پر اپنا پُرانا فسانۂ عشق بیان کرنے آئی ہے، اُس کا ایک بھید ہے جسے میں ہی سمجھتا ہوں اور دُنیا میں کوئی نہیں سمجھتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بظاہر ظالم عورت، ایک کمزور عورت ہے جو تمام عمر عشق کے ہاتھوں ستائی گئی، وہ ایک مِلکہ ہے جس کی تمناؤں کا اتنا خون ہُوا، کہ وہ ایک سانپ سے موت کی بھکاری ہُوئی۔

وہ بہت کم باتیں کرتی ہے، مگر اس کے اوضاع، اس کی حرکات سے کیا کیا نہیں ٹپکتا۔ مثلاً جس وقت وہ اپنے آخری عذابِ الیم کو دوبارہ اس زمین پر بیان کرنا چاہتی ہے تو وہ صرف اپنے ہاتھ کو نیل کی کیچڑ میں ڈالتی ہے، وہاں اُسے ایک چھوٹا سا سانپ ملتا ہے جسے وہ باہر نِکال لاتی ہے، اور اُسے اپنے سینے پر رکھتی ہے۔ پھر اپنے عبا کو اپنے اوپر ڈال لیتی ہے، اور اُس جسم کو جو موت میں بھی ایک طرف قیصر و کسرے کی شان یاد دلاتا تھا، اور ایک طرف ایک پھُول ایک ستارہ، یعنی ایک عورت کا جسم تھا اُس شاہانہ لباس سے ڈھک لیتی ہے اور نیل کے سبزی مائل پانی میں جو اپنے شیریں آغوش میں اُسے لینے کے لئے منتظر ہے، اپنے تئیں ڈال کے غائب ہو جاتی ہے۔

---

(۳)

سب سے آخر میں، ہیپاشیا سبز موجوں کے پردے کو ہٹا کر یکایک نیل کے کنارے نِکلتی ہے کہنیاں گھٹنوں پر رکھے، سر ہاتھوں میں لئے ستارے کی طرح روشن۔ آنکھوں کی نمدار نظریں نیل کی طرف کئے ہُوئے وہ بڑی دیر تک، نیل سے رازِ دل کہتی ہے۔ میں اس حسین و متفکر چہرے کو بہت پیار کرتا ہوں، ایک زمانہ تھا کہ اسکندریہ، مرمر کی سفید عمارتوں، کتب خانوں، عجائب خانوں اور باغوں سے اک شہرِ مخیّل جیسا دلربا شہر بنا ہُوا تھا۔ اور وہ کاندھوں پر نرم ریشمی عبا ڈالے، پاؤں میں خوبصورت چپلیاں پہنے اس شہر میں مصروفِ خرام تھی، دماغ میں نفیس افکار، عالی فلسفے بھرے ہوتے تھے۔ اس کی روح کی طرح اس کا جسم بھی باکرہ عصمت مآب تھا، اور اس عصمت کے خطِّ تکبر سے متکبّر رہتا تھا۔ اس ملک میں جس نے اپنے سنگِ مرمر کے سوا، ہر چیز کو میلا اور لکہ دار کر دیا تھا، صرف ہیپاشیا کی روح پاک وصاف تھی، اُس کے افکار، اُس کے خیالات، اس کی نظریں اس قدر زمین سے علیحدہ، اس قدر گردوں پیما تھیں، کہ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ وہ کوئی سرابِ فلکی ہے۔ میری اور

اُس کی شناسائی اسی زمانے سے ہے، میں جس وقت اسکندریہ کے اوپر سے گذرا کرتا تھا، وہ اپنی پاک اور خوبصورت آنکھوں پر دُوربیں لگا کر مجھے گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔ اور پھر پاپیرس کاغذ پر عجیب خطوں سے کچھ لکھا کرتی تھی۔ حسب معمول میں ایک رات، اسکندریہ سے گذر رہا تھا، اور حسب معمول میں نے اس کی کھڑکی میں سے جھانکا۔ میں نے اُس کا گھر خالی پایا۔ آج زلیخا و کلیوپیٹرا کے بعد جو وہ نکلی تو میں نے اُس سے پُوچھا کہ کرۂ خاک سے وہ کیوں روپوش ہوگئی؟ اس نے اپنے پیارے سر کو جو یونان کی عقل و حکمت کی دیوی اتینا کا تجلی گاہ بنا ہُوا تھا میری طرف اُٹھایا اور اُس یاس سے جو تمام علما و کملائے دہر کو دنیا سے رہی ہے، اُس نے مجھ سے کہا:۔

"میں نے انسانوں کو قعرِ مذلت میں سے نکالنے اور اُبھارنے کی کیا کیا جدوجہد نہ کی۔ اے پیارے چاند! تو اس کا شاہد ہے۔ انسان، جس وحشت و بہیمیت میں مبتلا ہے، وہ نظارہ اپنی دل خوں کن تجلیوں میں میری آنکھوں کے سامنے تھا، مگر میں اُس وقت اُس پاک و علوی خواب کو دوبارہ دیکھ رہی تھی جو افلاطوں کی بزرگ روح نے انسانوں کے لئے دیکھا تھا، میں چاہتی تھی کہ سب انسان، آنکھ، روح اور فکر کے ذریعہ، پروردۂ حُسن و خوبی ہوں۔ نیچر کی خوبصورتی، صنعت کی خوبصورتی، اُن کے چاروں طرف تبسم ریز ہو، اور اُن کے دماغ حُسنِ سماوی کی طرف بالا پرواز ہوں۔ میں چاہتی تھی، کہ انسان کے قوائے ذہنیہ علم کے زیور سے آراستہ ہوکر (کہ قوائے ذہنیہ ہی انسان کی بلند ترین تجلی ہیں) مادّہ اور جسم کی سفلیت و تاریکی پر غالب ہوں آہ! اس کے لئے میں نے کیسی کیسی کوششیں کیں، مگر ہُوا کیا؟ اِدھر اُس مونسِ دردمند روحانی مسیحا کی امت جو انسان کو بچانے کے لئے آیا تھا، انسانوں کو عذاب و شکنجہ میں کھینچ کھینچ کر، فکر اور دماغ کو تعصب و جہالت سے بھر بھر کے تاریک کر رہی تھی، اور ظالم و خونخوار بن کر میرے پاک خواب کو برباد، اور میرے تمام مجاہدے کے مقابل میں دیوارِ آہن استادہ کر رہی تھی اُدھر، روما کے بیمار و کثیف بچے، اور پھر مال کے وحشی میرے رویائے علمی، میرے خوابِ ارتقاء و نجاتِ انسان کو، اپنے دنی اور ذلیل حرکات سے پراگندہ و پریشان کر رہے تھے۔ آخر ایک دن آیا کہ ان ہزاروں جنس والے، ہزاروں مذہب والے انسانوں کے انبوہ میں پیروانِ عیسےٰ بھی ظاہر ہُوئے؟ ان حضرات کے تشریف لانے کے نتیجے سنے، پیارے چاند! تم بیخبر نہیں ہو؟

یہ کہتے وقت اپنے حسین جسم کی پوری قابلیتِ عظمت کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے، اور اپنے کندھوں کو اونچا کرتی ہے، اور ایک لطیف وقار کے ساتھ جو اولمپا کے حسین اور بلند مرتبہ دیوتاؤں سے حاصل کیا گیا معلوم ہوتا تھا، اپنے سر کو آسمان کی طرف متوجہ کرتی ہے *

یہ پیروانِ عیسیٰ آئے اور اُس خونخوار درندوں کے غول کی طرح جو خون پینے کے لئے کسی کے پیچھے جھپٹ رہا ہو، مجھے اپنے کلیسا تک گھسیٹ لے گئے۔ اور اپنے بے گناہ عیسیٰ کی تصویر کے نیچے جو مغموم مگر روحانی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی، مجھے ذبح کیا اور میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ مجھے تو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، مگر میرے دماغ کے تخیلات کے ستارے، اب بھی مرتفع، اب بھی ضیا بار، اب بھی آسمانِ ابدیت میں درخشندہ ہیں اور رہیں گے"

اُس نے جب یہ دلدوز تقریر ختم کی، تو اُس سوز و گداز کے ساتھ، جو زلیخا اور کلیوپیٹرا کے ماجرائے عشق نے مجھ میں پیدا کر دیا تھا، میں نے اُس سے پوچھا:-

"پیاری لڑکی، یہ تو بتا کہ تیرے روحانی اور بے داغ جسم کو کبھی بشری خطاؤں کا دھبہ تو نہیں لگا؟"

اُس نے اپنی نور فشاں مگر خیال پرست نظروں سے میرے دل کی گہرائیوں تک کو چھید ڈالا، جس نے مجھے بتایا کہ جس طرح اُس کی رُوح، فضائے لاہوتی میں اپنے سفید پروں سے پرّاں ہے، اسی طرح بشری کمزوریوں کے بھنور، خطاؤں کی گہرائیوں میں بھی پھڑ پھڑا چکی ہے۔ مگر میں ان رازوں کو جن سے دُنیا بے خبر رہی ہے کبھی زبان پر نہیں لا سکتا کیا اُس نے بھی، ہر انسان کی طرح محبت کے عذاب جھیلے، تاریکیوں میں ٹھوکر کھائی شعلوں میں گری یا نہیں گری؟ اسے صرف ہیپاشیا کی روح جانتی ہے یا میں۔

وہ جب ہر سال اپنا افسانہ اپنی آنکھوں سے مجھے سُناتی ہے، میں سفید اور سنہرے بادلوں میں سے نکل کر، اور اپنی زرد اور ٹھنڈی شعاعیں اُس کے محبوب چہرے، اور اُس کے پاک جسم پر ڈال کر، شفقت و نوازش سے اُس کے بوسے لیتا ہوں، اُس کی تقدیس کرتا ہوں، آخر کار وہ بھی، اُن دونوں کی طرح، سبز پانی کی شیریں اور منتظر آغوش میں اپنے تئیں ڈال دیتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے *

(خالدہ خانم ادیب) سید سجاد حیدر

خیالات

جس نے عُسرت کا مُنہ نہ دیکھا۔ وہ زندگی کی حقیقت سے ناآشنا رہا! جس کی آنکھیں غم کے آنسوؤں سے لبریز نہ ہُوئیں اُس نے دریائے دل میں پانی کے مدوجزر کا نظارہ نہ کیا!

خوشیاں اے ہمدم! دلکش و دلفریب ہیں اور غم جانگداز، لیکن وہ سراب آفریں ہوتی ہیں اور یہ عکس ریز! اُن سے راہ چلنے والے رستہ بُھول جاتے ہیں اور یہ بُرے وقت میں بھی بھُولے ہُوؤں کی رہنمائی کرتا ہے!

رنج و افکار اضطراب انگیز ہوتے ہیں اور عشرت ساکن، لیکن جوہڑ میں پانی کثیف ہوتا ہے اور بہتی ہُوئی ندی میں لطیف و پاکیزہ!

سمندر میں طوفان اُٹھتا ہے تو خوابیدہ پانیوں میں شدت کی بے قراری پیدا ہو جاتی ہے لیکن بحرِ ناپیداکنار کی عصمت و عفت فقط اِسی بے کلی پر موقوف ہے!

بادل گرج کر جسم میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے اور بجلی چمکتی ہے تو آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے لیکن تیرہ و تار جنگل میں تنہا مسافر کا رستہ اُسی سے مُنوّر ہے!

دُنیا میں کوئی وجود نہیں جس کے نفس میں گاہے گاہے بے چینی پیدا نہ ہو اور کامل سکون تو زندگی کے لئے عین موت ہے؟

اے تُو جو سر بفلک محلوں میں مُتمکّن ہو کر اپنے نادار بھائیوں پر غلط انداز نظریں ڈالتا ہے نہیں سمجھتا کہ خس و خاشاک کے جھونپڑے میں رہنے والا مزدور اپنے خدا کے زیادہ قریب ہے اُس نے تنگی کے سینکڑوں دن کاٹے ہیں اور اپنے بال بچوں کی فکر میں اُس کی اکثر راتیں بیداری میں گذری ہیں!

وہ جس کی وزنی جیب میں سونے چاندی کے سکّے جھنکار پیدا کر رہے ہیں کیونکر جان سکتا ہے کہ سُوکھی روٹی اور ٹھنڈے پانی کے گھونٹ میں کس نعمتِ خداوندی کی شیرینیاں چھپی ہیں، اسے کیا معلوم کہ ننھے بچے کی مطمئن مُسکراہٹ میں کیسی ضیاء نورانی کی جھلکیاں آتی ہیں!

اے بدبخت جس کی قسمت میں دنیا بھر کی راحتیں لکھی ہیں اور کاوش کچھ نہیں اگر چاہتا ہے کہ جسمانی آسایش کو اطمینانِ قلبی کے بدلے کھودے اور جیتے جی موت کی خوشیاں حاصل کرے تو اپنے لاکھ کے گھر کو خاک میں ملا دے اور قدرت کی بے نیازی سے اپنی فطرت کو مالامال ہوجانے دے؟ وہ کم مایہ جس کو تو نے ابھی حقارت کی نظر سے دیکھا ہے جب کڑی دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر اُس کے دو آنسو ٹپکتے ہیں تو اس آزادروشی پر فرشتوں کا دل پسیجا ہے؟ تو دنیا سے کوچ کریگا تو ساز و سامان کے ساتھ دفن ہوگا اور چند ساعتیں اخباری یا کاروباری دنیا میں تیرے اُٹھ جانے کا خشک تذکرہ ہوگا لیکن وہ جان دیگا تو شانِ کریمی ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ اُس کے استقبال کو آئیگی اور پھولوں کے اک مطمئن کنج باغ میں اُس کا مسکن ہوگا اور یہ اس لئے کہ تو عمر بھر اَوروں سے مُنہ پھیر کر فقط اپنے نفس کی پرورش میں منہمک رہا لیکن اُس کی جان نے زندگی کے سارے دُکھ خود سہے اور کسی دل کو ایذا نہ دی!!

بہار خزاں ہوجاتی ہے۔ دن ڈھل جاتا ہے، شام چھا جاتی ہے!!

بقا صرف خدا کی ذات کو ہے!!

پرندے چہکتے ہیں اور خاموش ہوجاتے ہیں، پھول کھلتے ہیں اور مُرجھا جاتے ہیں، لہریں سمندر میں اُٹھتی ہیں پھر بہ جاتی ہیں، سورج تُور کے تڑکے رُونما ہوتا ہے پھر شام ہوتے افق میں چھپ جاتا ہے اور

بقا صرف خدا ہی کی ذات کو ہے!!

ہم پیدا ہوتے ہیں، ہمارا بچپن کھیل کود میں گذرتا ہے اور ہماری جوانی عیش و عشرت میں صرف ہوتی ہے۔ ہم مال و دولت کے جھگڑوں میں غرق ہوجاتے ہیں اور بال بچّوں کے بکھیڑے میں پڑکر سمجھتے ہیں کہ اب تو ہماری زندگی اَوروں کے لئے بھی لابُدی ہے لیکن بڑھاپا آتا ہے تو رُوح خود بخود موت کے آگے سرنگوں ہوجاتی ہے کیونکہ وہ جان لیتی ہے کہ

بقا صرف خدا ہی کی ذات کو حاصل ہے!!

بشیر احمد

محفلِ ادب

ابو نصر فارابی معلمِ ثانی۔ اگرچہ ابو نصر سے پہلے مسلمانوں کو یونانی فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر ارسطو کی نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کو ایک دوسری زبان درکار تھی۔ قدرت کے اسرار ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ اُس وقت یونانی فلسفہ عربی میں نہایت بھدے اور ناموزوں ترجموں کے لباس میں تھا۔ بے جان الفاظ کے پیکروں میں روحِ معانی کے جلوے تصور کو بھی نظر نہ آتے تھے کہ یہ نامور وجود خاکِ پاک پارس سے اُٹھا۔ اور حقائقِ اشیاء کے اظہار کا چمکتا ہُوا آفتاب تمام عالمِ افکار میں روشن کر دیا۔ جس کی کرنیں عرب و عجم بلکہ یورپ و امریکہ کے فلاسفروں کے خلوت کدۂ تخیل میں پہنچ گئیں۔ ارسطو نے گو افلاطون کی طرح تعلیم فلسفہ کے لئے اپنی ہیکل کے دروازہ پر یہ نہیں لکھ دیا تھا کہ "جو علم ہندسہ نہ جانتا ہو ہمارے پاس نہ آئے" لیکن اُس کا تسلسل خیالات اور مقدماتِ تمہیدیہ کا سلسلہ بھی فہم و خرد میں ابھی نہ آنے پاتا تھا کہ مخاطب کثرتِ غور و خوض سے مجنون ہو جاتا تھا۔ ابو نصر نے ارسطو کی کتابوں پر کثرت سے تعلیقات لکھے، اُس کے مجمل بیانوں کی تشریح اور مترجمین کے اغلاط کی تصحیح کر دی۔ جس سے عربی خزانۂ افکار میں یونانی جواہر کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ یونانی فلسفہ عام ہو گیا۔ اور عام و خاص اُس سے مستفید ہونے لگے" (عبرت)

"انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ دوسروں کے حالات معلوم کرنے میں بڑی دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جگ بیتی کی سننے میں اُسے بڑا لطف آتا ہے: حالانکہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اسکی اپنی زندگی ہی کیا کم ہے؟ اپنی ہی معاشرت اور میل ملاپ کے روزانہ مشاہدے اُس کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن شاید اس کے مزاج میں ایک عجب عیاری اور شوقِ جستجو ہے۔ وہ اپنے تجربوں کو نہایت سستے داموں مول لینا چاہتا ہے۔ دوسروں کی تقلید کی خواہش ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے۔ اور اُن کی زندگی ایسی پُر اسرار و عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اپنے مشاہدات خواہ کتنے ہی

دلچسپ و نتیجہ خیز ہوں مگر مقابلتاً کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ قصّوں اور کہانیوں کے پڑھنے یا سُننے میں اسے ایک خاص قسم کا ذوق و شوق ہوتا ہے۔ وہ اس مقصد کو پورا کرتے ہیں اور ان کی تعلیم و تلقین خواہ کتنی ہی مصنوعی و مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو مگر اُس کے وہم و تخیّل کی تسکین کے لئے کافی ہے اور اُس کی سمجھ کے موافق اُس کے علم میں بھی اضافہ کرتی ہے اور دلبستگی کا باعث بھی ہوتی ہے" (اُردو)

مہاراجہ اشوک۔ اشوک گو بدھ مذہب کا پکا معتقد تھا۔ لیکن دوسرے مذاہب کے معتقدوں کو بالکل ایذا نہیں دیتا تھا۔ اُس کے بعض احکام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ برہمنوں جینیوں۔ اور سادھوؤں کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک فرمان میں صاف طور پر لکھا ہے کہ راجہ تمام مذاہب کے لوگوں کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اُن کو انعام و اکرام دینا پسند کرتا ہے۔ اسی فرمان میں یہ بھی ذکر ہے۔ کہ راجہ مذہبی تعصّب کو ہرگز پسند نہیں کرتا، اور اس کو ایک آنکھ نہیں بھاتا کہ کوئی شخص کسی دوسرے مذہب کے معتقدوں کے ساتھ درشتی یا سختی سے پیش آئے۔

(شبابِ اُردو)

نیو یارک (امریکہ) کا ایک تاجرِ کتب حال ہی میں تمام یورپ کی سیاحت کے بعد لندن پہنچا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ امریکہ میں اب تک جو کتاب نہایت سُرعت اور عُمدگی سے فروخت ہُوئی ہے وہ "مین سٹریٹ" تھی جس کے دو لاکھ نسخے بہت جلد فروخت ہو گئے۔ مگر تاجرِ موصوف بیان کرتا ہے کہ جب وہ برلن میں تھا تو ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کی کتب کے شائع کنندگاں نے ڈاکٹر موصوف کی تصانیف کو شایع کرنے کے لئے بیس لاکھ پونڈ سے زیادہ کا غذ کا آرڈر دیا تاکہ کتب چھپ جائیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ بیس لاکھ پونڈ سے تیس لاکھ کتب شایع ہو سکیں گی" (زمانہ)

تنقید ہو یا تنقیص۔ خود اپنی ہی حقیقتِ ادراک اور ذوق طبیعت کا انکشاف ہے انگلستان کے فلاسفر روکے اب سے ساٹھ سال پہلے کہہ گیا ہے۔

بعض اوقات کسی نقاد کی خامہ فرسائی مبحث پر اتنی روشنی نہیں ڈالتی۔ جس قدر خود اپنے دل و دماغ کی کارگذاری پر۔ ایسی حالت میں موضوعِ بحث محض ایک آئینہ ہوتا ہے۔ اور بحث نقاد کی ذات کا عکس،،

تنقید۔ خواہ وہ کسی ادیب کے متعلق ہو۔ سب سے پہلے نقاد پر ایک تنقید ہوتی ہے۔ نقاد جس طرح دوسروں کی حقیقت کا مفسر ہے۔ اسی طرح خود اپنے جوہرِ قابلیت کا آئینہ دار ہے۔،،

(مخزن)

ڈاکٹر فرینک کرین۔ کانفرنس برائے تحدیدِ اسلحہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ جب تک انسانی نفس۔ یا ذہن غیر مسلح نہ ہوگا جسم کو غیر مسلح کرنا بیکار ثابت ہوگا۔

،، اگر قومیں بحری و بری طاقتوں کو غیر مسلح کر دیں گی تو اس سے کیا حاصل ہوگا اگر ہماری رُوحیں بارود سے بھری رہیں اور ہمارے خیالات توپوں کی چمک سے روشن ہوں +

تمام مادی اشیاء رُوحانی کیفیات کی مظہر ہیں۔ اور مشکل یہ ہے کہ ہم ایک ایسے دل کے ساتھ دُنیا میں زندگی گذارتے ہیں جس کے خیالات گویا تیر و تفنگ اور چاقو اور بندوق کی تیزی و تندی سے ہم آغوش رہتے ہیں + اگر ہم صلح اور خوشحالی چاہتے ہیں۔ اگر ہم دُنیا کے گلی کوچوں میں امن و سکون دیکھنے کے خواہاں ہیں تو ہمیں ذہنی طور پر اپنے آپ کو غیر مسلح کرنا پڑیگا +

وہ ذہنی اسلحہ کیا ہیں منافرت، خودپسندی، انتقام، بے اعتمادی۔ یہ باتیں خواہ کسی قوم میں ہوں یا کسی فرد میں دائمی صلح کے لئے ان کا ترک کرنا لازم ہے!

(ماڈرن ریویو)

مغلیہ حکومت کی بنیاد زورِ شمشیر پر نہ تھی۔ یہ بات قطعی ناممکن تھی کہ اتنے بڑے برِّ اعظم میں جہاں لاکھوں قصبے اور دیہات دُور دُور تک پھیلے پڑے تھے زورِ شمشیر سے حکومت کی جاتی + علاوہ بریں قرونِ وسطیٰ میں حکومت کی تواعد دان فوج اور لوگوں کے اک جمِ غفیر میں اتنا فرق نہ تھا جتنا آج کل نظر آتا ہے۔ اُن مادی زبردستی کا نتیجہ زبردستی ہوتا تھا اور زبردستی کی حکومت بہت

نہ چل سکتی تھی۔ مغلوں کا ڈیڑھ سو برس تک اپنی سلطنت قائم رکھنا زورِ شمشیر کی وجہ سے نہ تھا۔ اُس کی بنیاد مذہب یا زورِ قوت یا کسی مخصوص جماعت کی امداد پر نہ تھی۔ سترھویں صدی کی مُغلیہ حکومت عوام الناس کی حقیقی رضامندی سے نشو و نما پاتی تھی + مذہبی آزادی اس تسلیم و رضا کی پہلی شرط تھی + دوسری وجہ معاشرتی زندگی کی مکمل آزادی تھی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ہر گاؤں کی حکومت اپنے قدیم دستور کے مطابق گاؤں والوں کی مرضی پر چھوڑ دی گئی تھی +

(ماڈرن ریویو)

عراق اور علم و ادب۔ معاصر "العراق" (بغداد) عراق عرب میں دورِ جدید کی برکات کی فہرست بیان کرتا ہُوا سطورِ ذیل میں اہلِ علم و ادب کی مساعی کا ذکر کرتا ہے:-

"ادبائے عصر نے جب دیکھا کہ عربی ادب انحطاط پذیر حالت میں ہے، عراق عرب کے تاریخی وقار کو دیکھتے ہُوئے یہ ادبی انحطاط افسوسناک ہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ عراق میں ایسے گرانقدر ادیبوں اور عالیجاہ سحر طرازوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی ذراسی توجہ سے ادبِ عربی کو زمین سے اُٹھا کر آسمان تک پہنچا سکتے ہیں، جو ادبیات کو عصرِ حاضر کے مناسب جدید سانچے میں ڈھال کر جدت و اختراع کی رنگینیوں سے روح فروز بنا سکتے ہیں صرف اس بات کی کمی ہے کہ اہلِ ادب "اشتراکِ عمل" کے اصول پر کاربند ہو کر مل کر کام کرنے کے خوگر ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اس کمی کو محسوس کرتے ہُوئے چند اصول عمل بنا کر اپنی ادبی کوششیں شروع کر دی ہیں۔

اسی طرح علمائے کرام نے تعلیم کے فقدان اور اُس کے خطرناک نتائج۔ جہالت کے عموم اور اس کے مہیب انجام کو دیکھا۔ اور سمجھ لیا کہ اہلِ وطن کا نعمتِ علم سے دیر تک محروم رہنا تباہی کا موجب ہو گا اس تکلیف دہ احساس سے متاثر ہو کر انہوں نے اہلِ علم کی ایک جمعیتہ کے انعقاد کو ناگزیر تصور کرتے ہُوئے "المعہد العلمی" کا افتتاح کر کے اطراف و جوانب میں اس کے انعقاد کا اعلان کر دیا تا کہ اہلِ وطن اس میں داخل ہو کر بہرہ اندوز ہوں۔

العراق (بغداد)

قدرتی شاعر وہ ہے۔ جو روزمرّہ کی باتوں کو نہایت دلکش الفاظ میں لوگوں کے سامنے ایسی صحت وصفائی کے ساتھ پیش کرے۔ کہ وہ انہیں فوراً سمجھ سکیں۔ وہ شیریں لیکن حقیقی امور کا ایک ایسا چشمہ بہائے جس کے کنارے آکر حساس لوگ عاشق مزاج بشیا ما کے زمزمے سنیں۔ حسین پھولوں کی خوشبو سونگھیں۔ معصوم تیتریوں کا رقص دیکھیں۔ اور دو چار گھنٹے کی تفریح کے بعد رخصت ہو جائیں۔ جسے سمجھنے کے لئے گھنٹوں پریشاں ہونا پڑے اور لغات کی ورق گردانی کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ وہ شاعری نہیں ہے۔ شاعر معمولی الفاظ لے کر اُن سے اک حسین دُنیا تعمیر کر دیتا ہے ~~~ وہ الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے شاعری وہ ہے جسے سُن کر آدمی بے اختیار کہہ اُٹھے۔ ایسا تو میں بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن جب کہنے لگے تو دماغ پریشان ہو جائے۔

(پربھا (ہندی))

آرٹ کا مخزن قدرت کی لامحدود خوبصورتی ہے۔ لیکن آرٹ قدرت کا ممکن نہیں بلکہ انسانی دل کی اندرونی خوبصورتی کا بیرونی اظہار ہے۔ والٹ وہٹمین نے اپنی ایک کتاب کے پہلے صفحہ پر لکھا ہے۔ Comerads, this is no book Who touches this touches a man

یعنی اے دوست! یہ کتاب نہیں۔ جو اسے چھوتا ہے وہ گویا اس کے مصنف کو چھوتا ہے۔ آرٹ کے دیگر شعبوں کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ جس طرح شاعر اپنے اشعار میں اپنی روح بھر دیتا ہے۔ اُسی طرح مصور اپنی تصادیر میں اپنی روح نکال کر رکھ دیتا ہے۔ ہر ایک آرٹسٹ کے دل میں قدرت کی خوبصورتی کی جو دل آویز تصویر منقش ہے۔ اُسی کو وہ اپنے اظہارِ کمال کے موقعہ پر دنیا دی نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ شاعری اُسی کی زبان ہے، موسیقی اُسی کی تان ہے۔ مصوّری اُسی کا عکس ہے۔ جسے اپنے دل کی گہرائیوں میں اس خوبصورتی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے فنِ لطیفہ میں ناکام رہتا ہے۔ وہ ڈھانچہ کھڑا کر سکتا ہے۔ کہ یہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ لیکن اُس میں موزونیت اور شعریت پیدا نہیں کر سکتا جو اُس ڈھانچے کی جان ہے۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک اُس کے دل

بزمِ تحقیق

ہر زبان کی شاعری میں شاعر کا ایک مخاطب ہوتا ہے جس کی خیالی صورت پیشِ نظر رکھ کر شاعر جذبات آرائی کی مشق کیا کرتا ہے۔ ہندی زبان کی شاعری میں شاعر عورت ہو یا مرد اپنے آپکو عورت فرض کر کے اپنے محبوب مخاطب کو مرد تصور کرتا ہے۔

عربی میں شاعر مرد ہو تو عورت کو مخاطب بناتا ہے اور عورت ہو تو مرد کو فارسی کے صیغوں میں تذکیر و تانیث کا چونکہ کوئی امتیاز نہیں اس لئے شاعر کا مخاطب مرد ہو یا عورت صیغہ ایک ہی مستعمل ہوگا۔ اردو کے صیغے فارسی کی طرح تذکیر و تانیث سے ساکت نہیں ہیں اس لئے اردو شاعری پر یہ اعتراض ہمیشہ ہوتا رہیگا کہ اس کے مخاطِب (شاعر) اور مخاطب دونوں مرد ہوتے ہیں۔ فارسی کی خوش قسمتی دیکھئے کہ "مجالس العشاق" کی ناطق شہادت اور اس قسم کے جذبات

("لشکر برفت و آں بتِ لشکر شکن برفت		ہرگز مباد کس کہ دہد دل بہ لشکری")

کی موجودگی میں بھی فارسی شاعری محض اپنے صیغوں کی پردہ داری کے سبب چشم نمائی سے محفوظ ہے۔ لیکن اردو کے پاس یہ سہارا بھی نہ تھا اس لئے یہ ہدفِ ملامت بنگئی۔ اہلِ لکھنو نے چوٹی اور مانگ کے مضامین نظم کر کے فطرت نگاری کی بنیاد رکھنی چاہی تھی مگر وہ اس جرم میں اردو دنیا کے آجتک معتوب ہیں۔ میری رائے ناقص میں ضرورت ہے کہ اردو شاعری کا طریقۂ خطاب عربی کے مطابق بنا کر اُردو شاعری کو اس ناقابلِ رشک حالت سے نکالا جائے تھوڑے سے ایثار کی ضرورت ہے متستند سخن طراز پہل کریں تو کچھ دنوں کے بعد باقی شعرا اُنکے نقش قدم پر چلنے لگینگے۔

۲

اردو شاعری کے رواج سے پہلے ملک میں بھاشا کے دوہرے۔ چو بولے وغیرہ رائج تھے۔ ولی دکنی نے جہاں بھاشا میں فارسی تراکیب، استعارے، اور فارسی مضامین داخل کر کے اسے اردو بنایا وہاں اُس نے بلا ضرورت اُردو نظم کے لئے فارسی اوزان و بحور بھی اختیار کر لئے۔ فارسی اوزان و بحور ایران کی شاعری کے لئے مناسب ہو سکتے ہیں۔ اُردو شاعری تو انکی وجہ سے گرانبار پابندیوں میں دب گئی۔ فطری سادگی جو کسی زبان میں ہو سکتی ہے اُس سے اُردو محروم ہے۔ میر تقی مرحوم نے اپنی غزلیات میں جہاں بھاشا کے اوزان میں سخن سرائی کی ہے فطری جذبات کی تصویر کھینچکر رکھ دی ہے۔ سخن طراز حضرات جانتے ہیں کہ بعض وقت اُردو نظم کی غیر طبعی پابندیوں کی وجہ سے بہتر سے بہتر شعر کاٹ دینا پڑتا ہے۔ اگر یہ غیر ملکی پابندیاں حائل نہ ہوتیں تو آج اُردو نظم میں ہر قسم کے مضامین کا بیکران ذخیرہ موجود ہوتا۔ تو کیا اساتذۂ فن اس سوال پر اپنی توجہ مبذول فرمائینگے؟ اُردو شاعری اگر بھاشا کے طبعی اوزان میں ڈھلنے لگی تو اسکی ترقی کے راستہ سے رکاوٹوں کا ایک ہمالیہ ہٹ جائیگا۔ اس میں تو ایثار کی بھی ضرورت نہیں صرف رہنمائی کی ضرورت ہے۔

تاجور

حصۂ نظم

خاموشی

ذیل کے گرانمایہ اشعار ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر اقبال کے خامۂ جواہر چکاں کی تراوش ہیں۔ یہ اشعار علامۂ موصوف نے چاندنی رات میں دریائے نیکر (ہائڈل برگ جرمنی) کے کنارے موزوں فرمائے تھے۔ ناجور

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
فطرت ہے مراقبے میں گویا
وادی کے صدا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
تاروں کا خموش کاروان ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
اے دل خاموش تو بھی ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

(غیر مطبوعہ) اقبال

کلامِ اکبر

خلقت کی مصلحت سے بہم کچھ یہ پیار ہے
ورنہ ہر ایک اپنی طرف بے قرار ہے

جو ذرہ ہے یہاں اُسے اک انتشار ہے
مرجع تمام خلق کا پروردگار ہے

ہر آن میں ہے شان خدائے قدیر کی
ہر سمت اک صدا ہے الیک المصیر کی

رباعیاتِ گرامی

ما نگہتِ دوست از چمن مے جوئیم
ما بُوئے گل از دار و رسن مے جوئیم

صوفی خود را بجستجویش گم کرد
ما گم شدہ را بجویشتن مے جوئیم

از غصہ بنجود مپیچ دوری اینست
حسرت مفروش ناصبوری اینست

باخود در بیخودی رسیدن سہل ست
بیخود درخود رسی حضوری اینست

ہر سوختۂ بسینہ دردے دارد
دست آویزے زرنگ زردے دارد

گر عین نماند ست اثر میماند
دنبالۂ ہر قافلہ گردے دارد

پھُول

"پھُول" کے عنوان سے جو چند سطروں کا (بشیر احمد بیگم صاحبہ کا) مضمون ہے بڑے نازک اور دل آویز خیالات کا مرقع ہے۔ میں نے اس نثر کے مضمون کو نظم کا جامہ پہنا دیا ہے۔ یعنی پہلے نادر خیالات کے یہ آبدار موتی بکھرے ہُوئے تھے۔ اب سلکِ نظم میں پرو دئے گئے ہیں"۔

برق دہلوی

پھُول کیا ہیں؟ دل مایوس کی اُمیدیں ہیں
یہ وہ الفاظ ہیں بچے ہیں شناسا جن کے

سب سے پیاری ہے یہ مخلوق، مگر ربِّ قدیر
پھونکنی بھول گیا رُوح بدن میں اِن کے

ہم سے تو کرتے ہیں یہ پھول اشارے ہی فقط
آسماں اور خدا سے ہیں یہ محوِ تقریر
ہو کے آوارۂ دامانِ فضا نکہتِ گُل
اپنی شیرینی کی کرتی ہے دو بالا تاثیر
مست و بیتاب ہا کرتی ہے یوں موجِ شمیم
جس طرح ساز کے نغموں کی صدائے دلگیر

چرخ پر تاروں میں۔ بالائے زمیں پھولوں میں
نام لکھتا ہے قلمکارِ حقیقی اپنا
پھول ہیں مادرِ قدرت کی زبانیں گویا
جن سے کرتی ہے وہ اسرارِ محبت افشا

پھول کیا ہیں؟ یہ ہیں دامانِ زمیں کے تارے
کیسے دلکش ہیں سنہری ہیں یہ پیارے پیارے

اس لئے کِھلتے ہیں کچھ پھول کہ خنداں ہو کر
بوئے شیریں سے معطّر کریں بادِ صحرا
گُل وہ خوشیاں ہیں جہاں کی وہ گُہر ہائے اُمید
جو یہ کہتے ہیں "ہمیں بھول نہ جانا اصلا"

پھول دیتے ہیں ہمیں عیش و مسرّت کا پیام
جلوۂ حسن کا موسیقی و نکہت کا پیام

(خیالات ماخوذ)
برق دہلوی۔ بی۔ اے۔ منشی فاضل

برقؔ دہلوی

"حسنِ فردا"

اے جمالِ حسنِ فردا تو کہاں مستور ہے؟
تیرے جلووں میں پریشاں مایۂ صد طور ہے
آشکارا تجھ سے شانِ جلوہ زارِ زندگی
تیرے دم سے رونقِ حسنِ بہارِ زندگی
ذرّہ ذرّہ بزمِ جاں کا اضطراب آموز ہے
گرمیٔ ہنگامہ تیری کیا تپش اندوز ہے!

تیری آمد۔ آمدِ جوشِ بہارِ نازِ گل　　تیری رنگینی پہ ہے قربان ہر اندازِ گل
شامِ غربت میں چراغِ جادۂ منزل ہے تو　　آہ! کس لیلائے حسن افروز کا محمل ہے تو؟
ہر کلی تیری ہم آغوشِ سرودِ رازِ قُم　　پتّہ پتّہ تیرے گلشن کا نوا اندازِ قُم
تو دلِ حسرت فشاں کا کعبۂ مقصود ہے　　خواہشِ اقدام تجھ بن کاوشِ بے سود ہے
تیرے پہلو میں نہاں ہے حُسنِ پنہانِ ازل　　آشکارا جلوہ پاشی سے تری شانِ ازل
تیری آمد۔ توسنِ امّید کو مہمیز ہے　　تیری صہبا سے ایاغِ زندگی لبریز ہے
بزمِ دل زیر و زبر کر دے وہ زیبائی تری　　حُسن بھی جس کی بلائیں لے وہ رعنائی تری
جلوۂ خور۔ منبعِ تابندگی تجھ سے ہوا　　یعنی عالم روشناسِ زندگی تجھ سے ہوا
خوگرِ بیداد۔ مسحورِ تمنا تجھ سے ہے　　عشقِ حسن افروز مجبورِ تمنا تجھ سے ہے

چشمِ مشتاقِ امل کو کس قدر پیارا ہے تو!
شعبدہ ہے۔ یا طلسمِ دلنشیں ہے۔ کیا ہے تو؟

شوقِ دل۔ حُسنِ امل۔ جوشِ نمو۔ کچھ بھی نہ ہو　　تو نہ ہو گر اے نگارِ آرزو! کچھ بھی نہ ہو
عہدِ طفلی ہو کہ ہنگامِ بہارِ زندگی　　یا اترنے کو ہو سب کیف خمارِ زندگی
دل گذرگاہِ سرورِ بادۂ امید ہو　　یا سپردِ کاوشِ محرومیِ جاوید ہو
یا نصیبِ آرزو۔ عہدِ جوانی کے مزے　　انبساط افروزِ عشرت کامرانی کے مزے
یا ہجومِ یاس سے دل میں شکیبائی نہ ہو　　بازؤوں میں ضعف سے کچھ بھی توانائی نہ ہو
کوئی منظر اپنی ہستی کا غرض ایسا نہیں　　تیرے لطفِ بندہ پرور کا جہاں چرچا نہیں
اے نسیمِ گلستاں اے مشک بیزِ آرزو　　اے ضیائے آفتابِ جلوہ ریزِ آرزو
اے کہ تیری دید تسکینِ دلِ بیتاب ہے　　اے کہ تیری شمع نورِ محفلِ مہتاب ہے

اے کہ می آری پیامِ انبساط اندوز را
در تو بینم دولتِ گم گشتۂ امروز را

خالد بی اے

جذباتِ عالیہ

حسرت موہانی

رنگ تیری شفق جمالی کا — اک نمونہ ہے بے مثالی کا
لااُبالی مزاجِ یار کو غم — کیوں ہو میری شکستہ حالی کا
بزمِ ساقی میں دیدنی ہے سماں — خُمِ لبریز و جامِ خالی کا
آئینہ ہے تبسمِ لبِ دوست — حُسنِ خوباں کی بے ملالی کا
بگڑوں میں بھی۔ جو ہو لحاظ اُنہیں — کچھ بھی اس خطرۂ خیالی کا
اُس جفا کار تک کہاں پہنچا — ذکر میری خراب حالی کا

کچھ تو کر پاس اے وفا دشمن!
لبِ حسرت کی بے سوالی کا

ابر قدوائی

وفا پروردگانِ عشق میں ذوقِ فنا پایا — جسے پایا اُسے ہم نے پرستارِ قضا پایا
نہ بھولے سے غمِ جانکاہ کو لبِ آشنا پایا — دلِ غمدوست کو پابندِ آئینِ وفا پایا
نہ پوچھ لے ہمنشیں مجھ سے کہ دل آیا تو کیا پایا؟ — بُتِ ناآشنا پایا دلِ غم آشنا پایا
بڑھا دی اور رونق داستانِ غم کی اشکوں نے — کسی کو گر دلِ غمدوست کا دردآشنا پایا
خدا جانے تپِ غم سے دلِ بیکس پہ کیا گذری؟ — کہ جو اشک آنکھ سے ٹپکا اُسے حسرت نما پایا
دمِ آخر زباں تھی بند چشمِ منتظر وا تھی — وہ آئے دیکھنے کو تو درِ حسرت کھلا پایا
دمِ عرضِ تمنا اُس کے اندازِ تبسم سے — کھلا اتنا کہ دل نے کچھ سراغِ مدعا پایا
ترے دم سے بتِ سفاک کو تو مل گئی فرصت — ارے او مرنے والے! جانِ دیگر تو نے کیا پایا؟
تماشا گاہِ حسن و عشق کی اللہ رے وسعت!! — ہر اک گوشہ کو دل کے عالمِ حیرت فزا پایا

نہ پوچھو واقعاتِ زندگی اُس مرنے والے کے
کہ جس بیکس نے خاکِ گور کو راحت فزا پایا
ازل ہی سے مری تقدیر میں یہ گریۂ غم ہے
محبت میں نہ میں نے آبرُ کچھ اسکے سوا پایا

شرف

عشق کو رو رو کے پایابِ تمنا کر لیا
درد کی موجوں نے ہر آنسو کو دریا کر لیا
تیغِ قاتل سے لپٹ کر کھنچ گئی جانِ حزیں
خون کی دھاریں ملا کر ایک نقشا کر لیا
جلوۂ جاناں بہت کھیلا ہے میرے دل کے ساتھ
روز پردہ توڑ ڈالا روز پردہ کر لیا
مژدہ اے بلبل کہ پھولوں کی ہنسی میں راز ہے
عشق کی نیرنگیوں نے رنگ پیدا کر لیا
صبح تک آنسو بہائے انتظارِ یار میں
رات بھر میں موتیوں کا ہار پورا کر لیا
بیخودی! میں اُس تغافل کیش کو کیا دوں جواب؟
پوچھ بیٹھا ہے کہ یہ کیا حال اپنا کر لیا؟
کہہ گئے پروانے جل کر۔ شمع تو ہنستی ہے کیا
نور ہی ناپاک ہم نے پاک قصہ کر لیا

اُن کے آگے اشک بھر بھر لائے آنکھوں میں شرف!
آپ چپ کے چپ رہے۔ شکوہ کا شکوہ کر لیا

یاس

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے تدبیر دیکھنا
منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا
آوازے مجھ پہ کستے ہیں پھر بندگانِ عشق
پڑ جائے پھر نہ پاؤں میں زنجیر دیکھنا
پہنا دیا ہے طوقِ غلامی تو ایک دن
میری طرف بھی مالکِ تقدیر دیکھنا
مجھ ناتواں کا صبر تو کیا آزماؤ گے
راس آئے تمکو جوہرِ شمشیر دیکھنا
ہوش اُڑ نہ جائیں صنعتِ بہزاد دیکھ کر
آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا
پروانے کر چکے تھے سرانجامِ خودکشی
فانوس آڑے آ گیا تقدیر دیکھنا
مُردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے اپنی موت
ہاں دیکھنا ذرا فلکِ پیر دیکھنا
شاید خدانخواستہ آنکھیں دغا کریں
اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا

چونکے تو چشمِ شوق میں عالم سیاہ تھا — خوابِ نظر فریب کی تعبیر دیکھنا
اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور — بیربطیٔ نوشتۂ تقدیر دیکھنا
ہر خوب و زشت آپ ہی اپنی مثال ہے — حدِ کمالِ کاتبِ تقدیر دیکھنا
بادِ مراد چل چکی لنگر اُٹھاؤ یاس
پھر آگے بڑھ کے خوبیٔ تقدیر دیکھنا

ندرت

پی کر کسی کی بزم میں بیہوش ہو گئے — آنسو ہی ہمکو بادۂ سرجوش ہو گئے
کیا دل کی سرگذشت میں لذت نہ تھی کوئی؟ — افسانہ سُن کے آپ تو خاموش ہو گئے
آخر کو بات بڑھ گئی اے اضطرابِ دل — آمادۂ فغاں لبِ خاموش ہو گئے
پہلے تو میرا حال سُنا اہلِ حشر نے — پھر اُن کی شکل دیکھ کے خاموش ہو گئے
ہم نے جہاں میں آتے ہی پی لی شرابِ غم — گویا کہ آنکھ کھُلتے ہی بیہوش ہو گئے
پہلے تو خوب کی دلِ گم گشتہ کی تلاش — پھر صبر آگیا ہمیں خاموش ہو گئے
اب جوشِ آرزو دلِ مایوس میں کہاں — وہ خواب، وہ خیال فراموش ہو گئے
فریاد اپنی کوئی جہاں میں نہ سُن سکا — پچھتا کے اب ہم آپ ہی خاموش ہو گئے
پہلو ستم کے سوچتے رہتے ہیں رات دن — اللہ کس قدر وہ جفا کوش ہو گئے!
ندرتؔ بہار آتی ہے بے خوف پیجئے — رحمت کے بادل اب تو خطا پوش ہو گئے

غریب

موسمِ گُل ہے چمن سے آرہی ہے بوئے دوست — ہیں قفس میں بُلبلیں بیتاب۔ بہرِ روئے دوست
کھینچتی ہے عندلیبوں کو گلستاں کی طرف — پتے پتے میں گُلوں کے بس گئی ہے بوئے دوست
ذرہ ذرہ سے ہزاروں حشر ہوتے ہیں بپا — آسمانِ فتنہ ہے شاید زمینِ کوئے دوست
اے دلِ صد چاک تیری قدر اتنی بھی نہیں — دستِ شانہ کھولتا ہے عقدہ ہائے موئے دوست

عرشِ اعلیٰ سے بھی اونچے ہیں کہیں اُن کے دماغ
خاک میں جو مل گئے افتادگانِ کوئے دوست

بند کر آنکھوں کو دیدِ غیر سے پہلے غریب!
جب نظر آئے گا تجھ کو چہرہ نیکوئے دوست

تاجور

زبانِ حال سے کہتی ہے باغ میں شبنم
مآلِ غنچۂ خنداں پہ اشکبار ہوں میں

مٹا نہ مجھکو۔ محبت کی خود فراموشی
کہ اپنے بھولنے والے کی۔ یادگار ہوں میں!!

ہوں ننگِ زیست کہ جاں کر سکا نہ اُس پہ نثار
کسی کے دردِ محبت سے شرمسار ہوں میں

ہے میری سادگیٔ عشق رحم کے قابل
کہ بیوفا سے وفا کا امیدوار ہوں میں

ہوں مثلِ سبزۂ خوابیدہ وقفِ پامالی
چمن میں رہ کے بھی بیگانہ بہار ہوں میں

فریبِ وعدۂ صبر آزما۔ خدا کی پناہ!!
کہ ایک عمر سے پامالِ انتظار ہوں میں

معذرت

ہمایوں کے کسی گذشتہ نمبر میں ایک مضمون نگار کے قلم سے دو فقرے نادانستہ طور پر ایسے نکل گئے جنہیں مذہبی حملہ کے تحت میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے اس مضمون پر صرف بحیثیتِ صحتِ زبان ہم نے نظر ڈالی تھی۔ رسالہ شائع ہونے کے بعد ہمیں اس کا احساس ہُوا کہ اس مضمون میں دو ناگفتنی فقرے بھی شائع ہو گئے۔ مذہبی چھیڑ چھاڑ کو ہم قطعی غیر مفید تصور کرتے ہیں۔ آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ کسی قسم کے دل آزار مضامین ہرگز درج نہ ہونگے۔ ہم اپنے سب ہندوستانی بھائیوں کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہیں اور ہمیشہ کریں گے۔ گذشتہ فروگذاشت پر نادم ہیں اور طالب عفو۔

ہمایوں کے متعلق مشاہیر اہلِ قلم کی رائیں

جناب مولانا گرامی شاعرِ خاص حضورِ نظام۔

خدمتِ عالی میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لاء تسلیم۔ یکتا ہمایوں کا دوسرا نمبر مجھے مل گیا ہُمکنتب نمبر دو مگر بر ندش، یعنی رجسٹری شدہ۔ کیا گرامی حضرتِ بشیر کے ارادۂ مستقیم اور طبعِ حلیم کی نسبت کچھ لکھے یا حضرتِ تاجور فاضل دیوبندی کی عقلِ سلیم سے زبانِ قلم کو کوثر ریز کرے ؎

بسانِ تاجور در نکتہ سنجاں ارجمند آمد
تعالی اللہ ہمایوں دیوگیر و دیوبند آمد

تہی مایگانِ باطل پرست کو ہمایوں نے سرنگوں کر دیا۔ ادبی اور اخلاقی رسالے میری نظر سے بہت گذرے بجائے خود بہت اچھے ہیں انصاف یہ ہے کہ اس مجلس میں ہمایوں کے سوا کوئی دوسرا میرِ مجلس ہو نہیں سکتا ؎

ہر یکے را در خورِ آں دادہ اند
بادہ را مستی و گردش جام را

والسلام گرامی

جناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹرایٹ لا ہوم سیکرٹری حضور نظام

مکرمی۔ ہمایوں کا کیا کہنا۔ آب و تاب میں مضامین کی بلندی اور پاکیزگی میں اپنی آپ نظیر ہے۔ اگر رسالہ کا انتظام آپ ہی کے سپرد رہا اور اہلِ قلم معاونین اور مضامین کے انتخاب میں یہی احتیاط مدنظر رہی تو یہی ایک رسالہ ہوگا جو انگلستان کے مشہور رسالوں کا ہمسر ثابت ہوگا۔

خاکسار۔ ذوالقدر جنگ

شیخ فیروزالدین صاحب مراد ایم۔ ایس۔ سی۔ پروفیسر طبیعات علیگڈھ کالج۔

ہمایوں پہنچا۔ خدا اُسے دیر تک زندہ رکھے اور کامیاب ہو۔ مجھے اردو کے رسالوں پر کچھ اعتبار

نہیں رہا۔ وہ بے معنے کاروباری معاملے ہوتے ہیں جن میں فقط تخیل کی زیاں کاریاں نظر آتی ہیں اکثر رسائل پر ان اعتراضات کا اطلاق ہوتا ہے لیکن ہر کلیہ مستثنیات رکھتا ہے۔ میں نے اب ہمایوں دیکھا ہے اور میں خوش ہوں کہ ہمایوں کے ایڈیٹر اُردو ایڈیٹروں کی اُس جماعتِ اکثرین میں سے نہیں ہیں جو کام کم کرتے ہیں اور باتیں زیادہ بناتے ہیں۔ توسیع اُردو اور ترویج سائنس یہ ہے میرا منتہائے کمال۔ اپنے مشاغل سے فارغ ہو کر ان کی توجہ مبذول کرنا میرے لئے باعث مسرت ہے۔ دو ماہ کے بعد میں انشاء اللہ ہر طرح ہمایوں کی قلمی ... کے لئے تیار ہوں گا۔

فیروزالدین

جناب مرزا اعجاز حسین صاحب اعجاز دہلوی۔بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی

"ہمایوں" کا پہلا نمبر مجھے مل گیا ماشاء اللہ بڑی آب و تاب سے نکلا ہے میں آپ کو اور لایق مدیر کو اس پرچہ کی خوبیٔ ظاہر و باطن پر تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ میں بھی انشاء اللہ ہمایوں کی خدمت میں کوئی نظم یا نثر پیش کروں گا۔

خاکسار اعجاز حسین

جناب پنڈت میلا رام صاحب وفا پروفیسر پنجاب نیشنل کالج و سابق ایڈیٹر بندے ماترم۔

عنایت فرمائے وفا جناب میاں صاحب تسلیم

رسالہ ہمایوں پہنچ رہا ہے اس عنایت کا تہ دل سے ممنون ہوں ارادہ ہوا تھا کہ پہلے نمبر پر اپنی ناچیز رائے کا اظہار کروں لیکن اس کے ظاہری و باطنی محاسن کو دیکھ کر جن کی نظیر سے پیشتر ازیں میری آنکھیں نا آشنا تھیں یہ خیال آیا ایسا نہ ہو رسالہ کے اگلے نمبر میری رائے کی تردید کردیں۔ اب چونکہ دوسرا نمبر دیکھا ہے تو خود میرے اس خیال کی تردید ہو گئی ہے۔ دوسرا نمبر پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر رہے ہیں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایسا رسالہ اردو زبان میں آج تک جاری نہیں ہوا آپ کو جو مضمون نگار ملے ہیں ان کی وجہ سے اگر تمام اردو رسائل ہمایوں کو رشک کی نگاہوں سے دیکھیں تو مقام تعجب نہیں اگر اُن اصحاب کے مضامین دلپذیر سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو خود ایڈیٹوریل حصہ بھی اس امر کی ناقابل تردید شہادت پیش کر رہا ہے کہ ہمایوں و فی آپ جیسے سحر طراز ادیب اور بلیغ الملک علامہ تاجور جیسے فاضل جادو نگار کے زیرادارت ہے۔ حضرت

بلیغ الملک نے اردو زبان کی جو خدمات خصوصاً پنجاب میں سرانجام دی ہیں وہ اہلِ مذاق کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ رسالہ مخزن کو دوبارہ آنریبل خان بہادر شیخ عبدالقادر کے زمانہ کی سطح پر لانا انہی کا کام تھا رسالہ ہمایوں میں علامہ کا شریک ادارت ہونا واقعی اس کی بلند اختری کی روشن دلیل ہے۔ کلام ہمایوں پر علامہ نے جو دادِ تنقید دی ہے وہ اس فن میں ایک بیش قیمت اور مستقل اضافہ ہے۔ بہرحال اس میں کچھ شبہ نہیں کہ دنیائے اردو کا ماضی و حال "ہمایوں" کی نظیر پیش کرنے یقیناً عاجز ہے۔ نیاز کیش میلارام وفا

جناب سید سجاد حیدر صاحب بلدرم بی۔ اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی۔

ہمایوں مجھے اس قدر پسند آیا ہے کہ میں نے اس کا باقاعدہ فائل رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

خاکسار سجاد حیدر

جناب آنریبل ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ڈی وزیر قانون حکومتِ ہند

ابھی مجھے ہمایوں کا دوسرا نمبر نہیں ملا پہلا نمبر میں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ اور میں اس کے اجرا پر دوبارہ مبارکباد دیتا ہوں۔

آنریبل مسٹر لطیفی آئی۔ سی۔ ایس سکرٹری محکمہ تعلیم صوبہ پنجاب

ہمایوں کے مطالعے میں نے بہت لطف اٹھایا اور میں آپ کو اس کی ظاہری و باطنی خوبیوں پر مبارکباد دیتا ہوں مجھے یقین ہے کہ لوگ اس کے مطالعے سے بہت فائدہ حاصل کریں گے

ڈاکٹر ڈی۔ بی سپونر ایل ایل ڈی (محکمہ عمارات قدیم حکومت ہند) جنہوں نے بہت سی اردو نظموں کا انگریزی نظم میں ترجمہ کیا ہے اپنے خط میں فرماتے ہیں۔

ہمایوں پہنچا۔ مجھے بے انتہا پسند آیا۔ وہ ہر حیثیت سے قابل تعریف ہے، اور مجھے آپ سے ایسی ہی امید تھی۔ میں بہت خوش ہوں کہ آخر آپ نے میدانِ صحافت میں قدم رکھنے کا ارادہ کیا ہے جہاں ایک نہایت مفید خدمت سرانجام ہو سکتی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمایوں کو وہ کامیابی نصیب ہو گی جس کا وہ مستحق ہے۔ جب ہمایوں پہنچا تو میں عربی لفظ بشیر پڑھ رہا تھا اس نیک فال سے میرے دل کو یقین ہو گیا کہ ہمایوں ضرور کامیاب ہو گا۔

جناب لالہ کنور سین صاحب بیرسٹر ایٹ لا چیف جج جموں۔

میں بہت ممنون ہوں کہ آپ نے رسالہ ہمایوں کا پہلا نمبر مجھے بھیجا۔ میں نے رسالہ پڑھا اور اسے

غایت درجہ دلچسپ پایا۔ ایک اعلےٰ درجے کے اردو رسالے کی ظاہری شان ایسی ہی ہونی چاہئیے جیسی ہمایوں کی ہے +

ملک کے باوقار اخبارات

درحق رسالہ ہمایوں

کی

زرین رائے

ایک نیا اردو رسالہ۔ ہمیں اردو کے ایک نئے ادبی رسالے ہمایوں کا پہلا نمبر موصول ہوا ہے جس کے ایڈیٹر میاں بشیر احمد بی۔اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا لاہور اور مولانا تاجور (سابق ایڈیٹر مخزن) ہیں اور جسے میاں بشیر احمد نے اپنے والد مرحوم آنریبل میاں محمد شاہ دین جج چیف کورٹ پنجاب کی یادگار میں قایم کیا ہے۔ ہمایوں جسٹس شاہ دین کا تخلص تھا اور وہ اردو کے ایک مشہور شاعر تھے۔

اس نمبر میں اردو کے بہت سے مشہور انشاپردازوں کے نظم و نثر کے مضامین ہیں جسٹس عبدالقادر نے "پنجاب میں اردو" پنڈت شیونرائن ایڈوکیٹ نے "شالامار باغ لاہور" اور سر میاں محمد شفیع نے "تعلیم" پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں خواجہ حسن نظامی کا مضمون "شاہان مغلیہ کی آخری قبر" دلکش ہے مشہور شاعر ڈاکٹر اقبال نے "ہمایوں" پر ایک نظم لکھی ہے جس کے مقابل پر ہمایوں مرحوم کی نہایت خوبصورت عکسی تصویر ہے۔ جناب اکبر مرحوم کے چند غیر مطبوعہ اشعار اور مولانا گرامی (استاد حضور نظام) کی غزل کے علاوہ مشہور اردو شعرا مثلاً طبا طبائی۔ محروم۔ شوق۔ عزیز وغیرہ کا کلام درج ہے۔ ہمایوں میں بہت سی آل ویز جدتیں ہیں یعنی ایڈیٹروں کے نہایت دلچسپ نوٹ ہیں جو ہمیشہ موجود رہیں گے "جہاں نما" اور "علمی شعاعیں" کے تحت میں دلچسپ ادبی و علمی خبریں درج ہیں ایک صفحہ یاد ایام پر اور ایک صفحہ لغات الجاہلین پر ہے جو بہت پرظرافت ہے، اور دس انگریزی اور اردو رسالوں سے مختصر اقتباسات درج ہیں سارے کا سارا رسالہ دلچسپ ہے، اور اس میں ظاہرہ خوبصورتی کے ساتھ باطنی خوبیاں بھی موجود ہیں جس کی رو سے یہ تمام اردو ماہوار رسالوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ کاغذ اور چھپائی عمدہ ہیں اور سرورق دلکش ہم اردو سے دلچسپی لینے والے حضرات کی خدمت میں اس کی پرزور سفارش کرتے ہیں (ٹریبیون)

رسالہ ہمایوں لاہور۔ اخبار کی مصروفیتوں کی وجہ سے ہم کو لٹریچر کے پڑھنے کی فرصت نہیں ملتی لیکن رسالہ ہمایوں کی ظاہری خوبصورتی اور دلکشی نے ہمیں اس کے مطالعہ کیلئے مجبور کر دیا یہ رسالہ آنریبل خان بہادر جسٹس شاہ دین

کی یادگار میں مستقل فنڈ سے زیر ایڈیٹری میاں بشیر احمد صاحب بی اے۔ داکسن ولبیغ الملک مولانا تاجور نجیب آبادی۔ (فاضل دیوبند) جاری ہوا ہے اس کے مضمون نگاروں کی فہرست میں ہندوستان کے بہتر سے بہتر انشا پردازوں کے نام نظر آتے ہیں آنربل شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا جج ہائی کورٹ آنریبل سر محمد شفیع کے سی ایس آئی وزیر تعلیم حکومت ہند رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم پلیڈر نواب حیدر یار جنگ بہادر خواجہ حسن نظامی لالہ تلوک چند محروم بی اے مولانا نیاز کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں مضامین نثر نہایت بلند پایہ و دلچسپ ہیں اور نظمیں ملک کے بہترین شعرا کی ہیں میاں صاحب مرحوم کی تصویر شائع کی گئی ہے۔ اعلیٰ درجہ کا ولایتی کاغذ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہمایوں کے مجموعی مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ایسا دلکش اور دلچسپیوں سے بھرا ہوا اس شان کا رسالہ اردو رسالوں میں کوئی نہیں ہے ملک کو ایسے شاندار ادبی رسالوں کی قدر کرنی چاہئے اس میں ادبی علمی، اخلاقی تمدنی ظریفانہ نظم و نثر جس قدر بھی مضامین ہیں اس قابل ہیں کہ ہر علم دوست انہیں پڑھے ہم اپنے ناظرین سے پرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ ہمایوں کو خرید کر ہماری طرح اسکے مطالعہ سے لطف اٹھائیں رسالہ کی ظاہری و باطنی شان و شوکت کے مقابلہ میں پانچ روپے سالانہ قیمت کچھ حیثیت نہیں رکھتی

(روزنامہ کیسری)

فہرستِ مضامین بابتِ ماہِ اپریل سنہ ۱۹۲۲ء

جلد ۱ — حصۂ نثر — حصۂ نظم — نمبر ۴

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذباتِ عالیہ

ہمایوں کی جانب سے سو روپے

کا

انعامی مضمون

اُردو رسالوں میں غالباً "ہمایوں" سب سے پہلا رسالہ ہے جسے حالات کی مساعدت نے یہ موقعہ دیا ہے کہ وہ اہلِ قلم کو بیگاری کے درجہ سے بالاتر سمجھے۔ اسی لئے اسکے پہلے نمبر میں یہ عام اعلان کردیا گیا کہ جو پُرمغز و پُرمعلومات اچھوتے مضامین محنت و کاوش سے لکھے جائینگے۔ صاحبِ مضمون کے ایماء پر انکا معقول معاوضہ پیش کیا جائیگا۔ اسی سلسلہ میں اب یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ذیل کے اہم عنوان پر انعامی مضامین لکھوائے جائیں۔

اُردو ہندوستان کی مُلکی زبان کیونکر بن سکتی ہے؟

(۱)۔ سب سے بہتر مضمون پر جو منصفوں کی رائے میں اولیت کے معیار پر پورا اُترے ہُمایوں کے سرمایہ سے ساٹھ روپے اور اسی حیثیت میں دوم نمبر کے مضمون پر چالیس روپے بطورِ انعام پیش کئے جائینگے۔

(۲)۔ اور اگر مضامین میں سے مقرر کردہ معیار پر کوئی بھی پُورا نہ اُترے مگر ان میں بعض مضامین مفید اور جاذبِ توجہ ثابت ہُوئے تو اول و دوم پر انعام کی مقدار منصفوں کی رائے پر مقرر کی جائے گی۔

(۳)۔ تمام مضامین ایک کمیٹی میں پیش ہونگے۔ جسکے ایک رُکن آنریبل خان بہادر شیخ عبدالقادر بی۔ اے۔ بارایٹ لاجج ہائیکورٹ پنجاب ہونگے باقی دو "ہمایوں" کے دونوں اڈیٹر۔

(۴)۔ مارچ کا ہمایوں چھپنے کے بعد سے تین ماہ تک مضامین کا انتظار کیا جائیگا۔ یہ سہ ماہی مدت اس لئے تجویز کی گئی ہے تاکہ زیادہ غور و مطالعہ کے بعد مضامین پُرمغز و پُرمعلومات اور مدلّل پیرایہ میں لکھے جائیں۔

(۵)۔ مضامین فلسکیپ سائز کے زیادہ سے زیادہ تیس اور کم سے کم دس صفحات پر ہونے چاہئیں۔ (تاجور)

ضروری اطلاع:۔ جنوری کے پرچے کے لئے اتنی فرمائشیں آگئی ہیں کہ پرچہ عنقریب دوبارہ چھپوانا پڑیگا۔ جن اصحاب کو ضرورت ہو جلد اطلاع دیں سالانہ خریداروں کے علاوہ دوسروں کے لئے اس پرچے کی قیمت ۱۴ر ہوگی۔ مینیجر

ناظرین! سرورق کی متلوّن مزاجی ریلوے سٹرائیک کی وجہ سے ہے! مینیجر

بزمِ ہمایوں

بعض باذاق حضرات لکھتے ہیں کہ ہمایوں میں لکھنے کو جی تو چاہتا ہے مگر مضمون کی تلاش میں دماغ پریشان ہے! عنوان نہیں سوجھتا۔ طبع زاد مضامین لکھنے والوں کے لئے تو اس "تلاش" کی جستجو میں آوارہ پھرنا بے معنی ہے۔ جس وقت طبیعت حاضر ہو اپنے دل کی حالت کو بیان کر دینا کافی ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی کام یا انسان کے کسی شغل کے متعلق بلا کم و کاست اپنے حقیقی خیالات کو سیدھی سادھی زبان میں بے تکلف طور پر ادا کر دینا معراجِ انشا ہے۔ البتہ یہ دولت کم لوگوں کو نصیب ہے ؟

لیکن علم و تاریخ یا زبان و ادب کے متعلق اپنی یا دوسری مایہ دار زبانوں کے چمن سے گلچینی کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اس میں عنوان نہ سوجھنے کی دشواری جاتی رہتی ہے۔

اگر آپ علوم جدیدہ کے مطالعہ سے حظ اٹھاتے ہیں تو ان علوم کے ایسے شعبوں کی طرف توجہ کیجئے جو زیادہ دلچسپ و سبق آموز ہوں، ہر ایسے موضوع پر جسے آپ انتخاب کریں اک چھوٹا مقدمہ لکھئے جو غیر ماہر لوگوں کو اس علم کے بہت سے مبادیات سے آگاہ کر دے پھر انہیں زیادہ ادق مطالب کی طرف متوجہ کیجئے لیکن اس طرح کہ تحریر کی دلکشی دقتِ مضمون کو چھپائے رکھے اور پڑھنے والا اسی دھوکے میں رہے کہ یہ ادبی مضمون ہے۔ مستقل تصنیف کے لئے اتنی "ادبیت" کی ضرورت نہیں۔

تاریخ کے ضمن میں بجائے اس کے کہ واقعات اور تاریخوں کا انبار جمع کر دیا جائے یہ ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اس خاص وقت کے ماحول میں لے جایا جائے اور وہ محسوس کرنے لگے کہ میں کسی دور دراز ملک میں حقیقت کی نگاہوں سے سیر کر رہا ہوں۔ کسی ملک کی مختصر تاریخ بیان کیجئے تو اس طرح کہ سننے والا اپنے تئیں ایک ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا تصور کر لے، جہاں نگاہ جلد جلد ایک وسیع خطۂ زمین کو عبور کرتی چلی جاتی ہے۔ اردو میں یہ کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ دنیا کی مشہور تحریکات پر ایک نظرِ غائر ڈالی جائے اور تاریخ انسانی پر اس کے اہم نتائج کا اندازہ کیا جائے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھنے والا تاریخی مضمون کسی پُرعظمت شخص کی سیرت کا صحیح صحیح خاکہ کھینچتا ہے۔ اس فن سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں بلکہ اس کی سود مندی کا احساس بھی شاذ و نادر پایا جاتا ہے۔

(باقی)

(ب)

جہاں نما

چین کا مستقبل چینی سفیر (لندن) چاؤسن چوُ جنوری کے ایشیاٹک ریویو میں لکھتے ہیں "وہ شئے جسکی آج چین کو اشد ضرورت ہے انصاف ہے۔ انصاف ہی سے وہ تمام گورکھ دھندے دُور ہو سکتے ہیں۔ جنہیں "حقوقِ خاص" اور "حلقۂ اثر" کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ چین کے ساتھ انصاف برتنے سے نہ صرف مشرقِ اقصیٰ کا امن قائم رہیگا بلکہ ساری دُنیا چین سے زندگی بسر کریگی۔ مختصر یہ کہ چین میں امن ہونے اور چین کے ساتھ اِنصاف کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دُنیا بھر کو تجارت کا یکساں موقع ملے گا اور مشرقِ بعید میں دائمی سکون نظر آئیگا"

چین کے مالی حالات بحیثیتِ مجموعی درست اور تسلی بخش ہیں۔ چین کا اندرونی و بیرونی قرضہ ایک بلین ڈالر ہے۔ چالیس کروڑ نفوس پر پھیلانے سے اس کی اوسط ۲½ ڈالر (یا تقریباً ۲ روپے) فی کس بیٹھتی ہے۔ ٹیکس چین سے کم مشکل ہی کسی اَور ملک میں ہوگا یعنی فی کس ۱½ ڈالر۔ انگلستان میں ٹیکس کی اوسط تیس پونڈ فی کس ہے +

در آمد محصولات کے معاملے میں چین کو مطلق آزادی نہیں۔ اس کے ہاتھ اُن معاہدوں کی زنجیروں سے جکڑے ہوُئے ہیں جو دُولِ عظمیٰ نے اُس کے ساتھ کئے ہیں اور جن کی رُو سے یہ محصول غیر ممالک کے مال پر ۵ فیصدی سے زاید نہیں بڑھایا جاسکتا + اس سے بڑھ کر بے انصافی کیا ہوگی کہ چین کو اس معاملے میں آزادی نہ دی جائے اور یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ کے بجٹ میں ہر سال اتنا گھاٹا نظر آتا ہے۔ چین حق بجانب ہے اگر اپنی مالی حالت کو بہتر کرنے کی غرض سے وہ دُولِ عظمیٰ سے اِن محصولات میں اضافہ کرنے کی اجازت چاہے۔ واشنگٹن کانفرنس میں چین کے نمائندوں نے کہا کہ چین کو کم از کم ساڑھے بارہ فیصدی تک محصول لگانے کا حق عطا کیا جائے +"

مسٹر چوُ چین کی مالی قوت کا اندازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چین کا شرح مبادلہ زمانۂ قبلِ جنگ سے بہتر ہے اور اُس کا شمار اُن چند در چند ممالک میں ہے جہاں کاروبار میں دھات کے سکے چلتے ہیں اور کاغذ کے پُرزے مطلق نظر نہیں آتے" +

(ب)

علمی شعاعیں

حبشی سیاہ کیوں ہیں؟ اِس لئے کہ قدرت رنگ کے ذریعے سے جلد کی حفاظت کرتی ہے۔ روشنی کی شہ بنفشی کرنیں جو نظر نہیں آتیں سرسام گرمی اور امراضِ جلد کا باعث ہوتی ہیں۔ زرد یا سیاہ رنگ کا پردہ انہیں اپنا عمل کرنے سے روک دیتا ہے۔ انسانی جسم میں جلد کے نیچے ایک مادّہ ہوتا ہے جسے کرومو گن کہتے ہیں۔ جب شہ بنفشی کرنیں اس پر پڑتی ہیں تو وہ رنگ بن جاتا ہے۔ اس رنگ کے چار درجے ہیں۔ زرد (سفید قومیں) گہرا زرد (چینی اور جاپانی) سُرخ (امریکہ کے اصلی باشندے) اور بادامی (ہندوستانی اور حبشی)۔ ہمارا رنگ بھی اک معنی رکھتا ہے۔

بال اور سیرت۔ یہ بات طبعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ ہر شخص کے بال اُس کی اصل و نسل اور اُس کی سیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ جس صورت میں اُس کے بال اُگتے ہیں اور جس طرف کو بڑھتے ہیں اس سے اُس کے اعمال کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شخص آج کل کیا کر رہا ہے۔ اس کی عادات اور اکثر اس کے خیالات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غمگین طبع لوگوں کے بال عموماً سیدھے اور باریک ہوتے ہیں۔

ماہانہ مُدت۔ انگریزی مہینوں میں دنوں کی تعداد شروع میں اس قدر حافظے پر بار ڈالنے والی نہ تھی جیسی کہ اب ہے جولئس سیزر کے حکم سے جُفت مہینوں (جنوری۔ مارچ۔ مئی۔ جولائی۔ ستمبر اور نومبر) کے اکتیس ۳۱ دن قرار پائے اور باقیماندہ کے تیس۔ سوائے فروری کے جس کے عام سالوں میں اُنتیس ۲۹ دن ہوتے تھے اور ہر چوتھے سال تیس ۳۰۔ جب آگسٹس سیزر روما کا شاہنشاہ ہُوا تو اُس کی خود پسندی سے یہ نہ دیکھا گیا کہ جولائی جو جولئس سیزر کے نام پر ہے اکتیس دن ہوں اور اگست جو شاہنشاہ کی یادگار ہے صرف تیس دن کا ہو۔ بیچاری فروری سے ایک اَور دن چھین کر اگست کو دیا گیا اور ستمبر اور نومبر کی بجائے اکتوبر اور دسمبر کو اکتیس دن دیئے گئے تاکہ اکتیس ۳۱ دن کے تین مہینے یکجا نہ ہونے پائیں۔

امریکہ اور کولمبس۔ امریکہ کو کولمبس نے دریافت کیا۔ پھر اُس کا نام بجائے امریکہ کے کولمبیا کیوں نہ رکھا گیا؟ میجر جو نقشہ کشی کا ایک ماہر فن ہے اس علمی سنتم روائی کی کہانی یُوں بیان کرتا ہے:۔ سنہ ۱۵۰۷ء میں کولمبس کی وفات کے عین ایک سال بعد ایک ڈچ مارٹن والڈسی مُلر نامی نے ایک کتاب لکھی جس میں ضمیمہ کے طور پر امیریکس وسپوچی کے چار امریکی سفروں کا ذکر کیا گیا۔ اس کتاب میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ نئی دُنیا کا نام امریکہ رکھا جائے کیونکہ مُصنّف کے نزدیک وسپوچی ہی نے پہلے پہل امریکہ دریافت کیا۔ سنہ ۱۵۰۹ء میں ایک گمنام تصنیف "کرۂ ارض" میں یہ نام اس طرح لکھا گیا گو یا علمی حلقوں میں مشہور ہو چکا ہے۔ لینارد و دَونسی ایک اطالوی نقاش نے سنہ ۱۵۱۴ء میں جو نقشۂ دُنیا شائع کیا اُس میں امریکہ کا نام شمالی وجنوبی بر اعظم دونوں پر لکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک ڈچ مصنف اور ایک اطالوی نقاش کی خیالی قلم کاریوں نے کولمبس کو اپنی عملی کوششوں اور دقتوں کا ثمرہ نہ ملنے دیا۔

ستارے کیوں ٹمٹماتے ہیں؟ کسی رات کو جب مطلع صاف ہو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض تارے چمکتے ہُوئے ٹمٹماتے ہیں لیکن بعض فقط چمکتے ہیں اور اُن کی روشنی ذرا جنبش نہیں کرتی۔ چمکنے والے تارے سیّارے ہیں جو ہماری زمین کی طرح گردش کرتے ہیں۔ اور ٹمٹمانے والے تارے اصلی تارے ہیں جو سورج کی طرح ساکن ہیں اور اُن میں بہت سے ہمارے نیّرِ اعظم سے بھی زیادہ بڑے ہیں۔ سیّارے صرف چمکتے ہیں لیکن ثوابت ٹمٹماتے بھی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا سبب ہماری فضا کی نمی ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو سیّارے بھی کیوں ٹمٹماتے نظر نہ آئیں؟ ٹمٹماہٹ کے دو اسباب ہیں بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹمٹمانے والے تارے سیاروں کی نسبت بہت زیادہ بعید فاصلے پر واقع ہیں۔ فضا میں لاتعداد ایسے چھوٹے بڑے اجسام ہیں جو اِدھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں۔ ان تاروں کی روشنی ان رکاوٹوں سے ہو کر گذرتی ہے تو زمین تک پہنچ کر ٹمٹماتی ہُوئی معلوم ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سیّارے صرف سُورج کی روشنی کا عکس ڈالتے ہیں لیکن ثوابت اپنی ہی روشنی کے ساتھ شعاع ریز ہوتے ہیں جو کبھی زیادہ ہوتی ہے اور کبھی کچھ کم۔

جیب کتروں کی روز بندی۔ ایک موجد نے جیب کتروں سے بچنے کے لئے ایک جیبی ایلارم

۔ یا ہے۔ بجلی کی تار کپڑوں میں سی دئے جاتے ہیں۔ جونہی کوئی جیب کترا کچھ چُرانے کے لئے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالتا ہے چار ننھی شمعیں شعاع ریز ہوتی ہیں اور یہ روشن ہو جاتا ہے کہ جیب میں کوئی اجنبی ہاتھ اپنا کام کر رہا ہے +

نظری توانائی۔ کوئی شخص ٹکٹکی لگا کر ہماری طرف دیکھے تو ایک ناقابلِ برداشت احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے والوں میں ایک شخص جلد اپنی نگاہ ہٹا لیا کرتا ہے + ڈاکٹر چارلز روس ایک مشہور ماہر علم الجراثیم نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ انسانی آنکھ میں ایک غیر مرئی توانائی ہے جس کی طاقت ساکن اشیاء میں حرکت پیدا کر سکتی ہے + اُس کا خیال ہے کہ غالباً روشنی میں کوئی ایسی شعاع ہے جس کا انعطاف یا اجتماع قوت پذیر ثابت ہوتا ہے +

وہ اور ہم۔ انگلستان کی (۱۹۱۱ء کی) ۳½ کروڑ آبادی میں تعلیم پر ۶½ کروڑ پونڈ سے زاید خرچ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں صرف ۵۶ لاکھ پونڈ (آٹھ کروڑ سے زاید روپیہ) دوسرے لفظوں میں یوں کہئے ہندوستان کی آبادی تقریباً انگلستان سے آٹھ گنا ہے لیکن انگلستان میں تعلیم کا خرچ ہندوستان سے بارہ گنا سے بھی زائد ہے +

شکسپئیر یا ہندوستان؟ لندن میں ایک شکسپئیر لیگ قائم ہوئی ہے جس کا مقصد شکسپئیر کی تصنیفات میں غلطیوں کی اصلاح کرنا اور اُس کے ڈراموں کے شاندار اڈیشن چھپوانا ہے۔ اس تحریک میں صرف علما ہی شامل نہیں بلکہ اکثر عام لوگوں کو بھی اس سے گہری دلچسپی ہے +

کارلائل کا تو یہاں تک خیال تھا کہ "اگر اہلِ انگلستان سے پُوچھا جائے کہ تم ہندوستان کا چھن جانا گوارا کرتے ہو یا شکسپئیر کا تو وہ بلا تامل جواب دینگے کہ ہندوستان کا اس کی وجہ یہ ہے کہ شکسپئیر قدرت کا عطیہ ہے انگلستان کو اور ہندوستان کا حصول فطرت کی کارگذاریوں کا نتیجہ ہے"

(ل)

نسوانی دُنیا

حکومتِ روس نے مردوں عورتوں کی برتری و کمتری کا سوال حل کر دیا ہے۔"جیسا کام ویسے دام" کا اصول دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ حکومت کے تمام درجے عورتوں مردوں کے لئے یکساں طور پر کھول دئے گئے ہیں۔ عورتوں کو خانگی اُمور کے بارِگراں سے رہائی دینے کے لئے حکومت نے "مادریت" کو ایک معاشرتی کام تسلیم کیا ہے اور حاملہ عورت کی نگہداشت کو اپنے ذمے لے لیا ہے۔ ننھے بچے کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش سے آٹھ ہفتے پہلے اور آٹھ ہفتے بعد میں عورت کے لئے کام کرنا ضروری نہیں اور اُسے سرکاری طور پر پوری تنخواہ اور ۲۵ فیصدی زائد رقم دی جاتی ہے۔ ایامِ حمل میں عورت کو زیادہ مقررہ خوراک لینے کا حق ہے۔ اور زچگی کے سب اخراجات کی ذمہ دار بھی حکومت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی پرورش گاہیں ہیں جہاں ایک ماں بغیر فکر و تردد کے اپنا بچہ چھوڑ کر روزی کمانے کے لئے جا سکتی ہے۔ عورتوں سے جنگی کام نہیں لیا جاتا۔

ناروے میں عورتوں کا ایک اخبار نورژ کو نڈر ہے جس کی مالکہ و مدیرہ ایک عورت ہے اور اُس کے اغراض و مقاصد نسوانی ترقی پر مشتمل ہیں۔ اُس کی اشاعت بارہ ہزار ہے اور وہ ہفتہ میں دو بار چھپتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ ناروے کی آبادی صرف ۲۷ لاکھ ہے۔ ہندوستان میں پندرہ بیس کروڑ شخص اُردو بولتے یا سمجھتے ہیں۔ کیا سب نسوانی پرچوں کی اشاعت مل ملا کر اس سے نصف بھی ہوتی ہے؟ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اس مقابلے میں خاموش نظر آئیں گی۔

انگلستان میں قیدی عورتوں کی تعداد میں بہت کمی واقع ہوئی ہے۔ چند سال ہوئے عورتوں کے لئے ایک سَو قید خانے تھے آج کل صرف پچیس ہیں۔ (دب)

نشاط باغ

(کشمیر)

مُغلوں کی عمارتیں اُن کے تمدّن کی متانت ہیں اور اُن کے باغ اُن کی شان و شوکت کا تبسّم!

وہ محبوب بادشاہت جس کی سطوت کا چاردانگ عالم میں ڈنکا بجتا تھا لیکن جس کی عظمت کا نشان اب خاک پر سرنگوں ہے کیا تھی؟ ہندوالوں کے دل میں اُس کی محبت کا سکہ کیونکر بیٹھا؟ اُس کی فلاح و ثبات کے کیا اسباب تھے؟ اس کا اندازہ کسی ہندوستانی کے اُداس چہرے سے کیجئے جب وہ اک پُرانی مغلیہ عمارت یا باغ کی سیر کر رہا ہو!

عمارت میں داخل ہوتا ہے تو مُلک و قوم کی مُردہ عظمت اُس کے دل پر اک کالی گھٹا کی طرح چھا جاتی ہے اور اُس کے مُنہ سے بے اختیار آہ نکلتی ہے کہ یہ ہیں اُن لوگوں کے کارنامے جو کبھی ہمارے درمیان خلوص و شفقت کے ساتھ حکومت کرتے تھے!

باغ میں جا نکلتا ہے تو اُس شائستگی کی یاد اک لہر بن کر جی میں اُٹھتی ہے جو فطرتِ انسانی کو قدرت کے حُسنِ معصوم کے ساتھ وابستہ دیکھنا چاہتی تھی اور جس کے عیش و عشرت کا کمال ہمیشہ مناظرِ کوہ و دشت کو اپنے شاملِ حال رکھتا تھا۔

کس قدر بلند ہمت تھے وہ لوگ اور کتنی صاف و پاکیزہ تھیں اُن کی نیتیں!

کہاں کہاں جایئے اور کس کس محل کو دیکھیئے؟ کون کون سے باغ کی سیر کیجئے اور کس کس آبشار کے پاس بیٹھ کر رو دیجئے؟ اُن کی مسرت کے سامان ہر طرح سے ہمارے لئے غم افزا ہیں!

البتہ مغلیہ یادگاروں میں نشاط باغ ضرور اک ایسی یادگار ہے جو حقیقت میں نشاط انگیز ہے!

یہ باغ کشمیر کے دارالسلطنت سری نگر کے قریب مشہور ڈل جھیل کے مشرقی کنارے پر ساحلی پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔ وہ سڑک جو جھیل اور باغ کے بیچ میں حائل ہے مغلوں کے وقت میں موجود نہ تھی اور باغ کا بابِ داخلہ ٹھیک جھیل کے کنارے پر تھا۔

زمین کے کاریگروں نے اِس رشکِ جنت گُلشن کو آسمان کے بارہ بُرجوں کی رعایت سے بارہ تختوں میں تقسیم کیا ہے۔ جھیل میں اپنی کشتی کو کھیتے ہُوئے باغ کے قریب آئیے تو بارہ دری کے آگے ایک تختہ دُوسرے تختہ سے زیادہ بلند ہوتا ہُوا پہاڑ کی طرف چلا گیا ہے۔ باغ کا احاطہ ۵۹۵ گز لمبا اور ۳۶۰ گز چوڑا ہے اور اُسکے بارہ تختے ہیں۔ نیچے کے گیارہ تختے ایک دوسرے سے تھوڑی بلندی پر واقع ہیں لیکن بالائی تختہ جو صرف بیگمات کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ نیچے کے تختے سے اٹھارہ فٹ اونچا ہے۔

باغ کی سیرابی کے لئے پچھلے پہاڑوں سے ایک نہر آتی ہے جو بالاترین حصے میں داخل ہوکر ایک تختے سے دوسرے تختے میں دلکش آبشاروں کی صورت میں گرتی اور تالابوں کو لبریز کرتی ہُوئی باغ کے عین بیچوں بیچ بہتی ہے۔ مُغلوں نے جہاں کہیں اپنی عشرت گاہیں بنائیں قدرت کے حُسنِ رواں کو ضرور شادابی و شادمانی کا سرمایہ دار بنا لیا۔ اُن کی منظر آرائی ہمیشہ پانی کی پیاسی رہتی تھی۔ سب سے اُوپر کے حصے سے ایک آبشار سانپ کی سی لہراتی لکیروں میں سے ہوتا ہُوا ہلکی آواز کے ساتھ نیچے کے تالاب میں جا گرتا ہے جس کے متموج کناروں پر بیٹھ کر جھیل کا نظارہ کرنا حقیقت میں فردوسِ نگاہ ہے۔ ہر آبشار کے سر پر سنگِ سُرخ یا سنگِ مرمر کی ایک تخت نما نشست گاہ ہے جہاں دیکھنے والے کی نگاہیں گرتے ہُوئے پانی کی آوازمیں غرقِ نظارہ ہو جاتی ہیں! پُرانے زمانے میں نہر کے دونوں طرف سرو کی قطاریں تھیں اور اُن کے عقب میں میوہ دار درخت۔ دیواروں پر گلاب کی پیچ در پیچ بیلیں بوستانی زیب و زینت تھیں اور گلزاروں میں نرگس و یاسمن اور نسرین و نسترن کی بُوقلمونیاں جلوہ آرا!

نشاط باغ شاہی باغ نہ تھا۔ اس کا مالک شاہجہان کا خُسر آصف خاں تھا جو بادشاہ کا وزیرِ اعظم بھی تھا۔ بیان کرتے ہیں کہ ۱۶۳۳ء میں جب شاہجہان کشمیر میں موسمِ گرما بسر کرنے کو آیا تو اُس نے اِس باغ کی سیر کی۔ اُس کے مرتفع تختے اور جھیل اور پہاڑوں کے نظارے اس قدر دلفریب تھے کہ شاہجہان نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ یہ باغ رعایا میں سے کسی ایک شخص کی ملکیت نہ رہنا چاہیئے۔ اُس نے آصف خاں کے سامنے تین مختلف موقعوں پر نشاط باغ کی تعریف کی یہ توقع کرتے ہُوئے کہ آصف خاں بلا تامل "باغ سبز است تحفۂ آصف" کہہ کر اپنا گلشن بادشاہ کی نذر کر دے گا۔ لیکن اگر بادشاہ کو جانفزا نظاروں کی حرص تھی تو وزیر بھی نشاط کو اپنی مسرت کی تنہا بساط سمجھے ہُوئے تھا۔ ہر دفعہ بادشاہ کی بات سُنتا لیکن مطلب سمجھ کر خاموش ہو رہتا۔ اُس زمانے میں بھی شاہی باغِ شالامار اور نشاط باغ کی سیرابی کے لئے

تحقیق الالسنہ

گزشتہ سے پیوستہ

وہ لوگ جو آج کل غیر زبانوں کی علمی کتب کا ترجمہ کرتے ہیں اُردو میں مناسب اصطلاحات کی غیر موجودگی سے بہت تکلیف اُٹھاتے ہیں اگر وہ مندرجہ بالا اصول کے موافق انہیں غیر زبان اصطلاحات کو عربی صورت پر واپس لے آئیں تو وہی اصطلاحات ایک طرف تو اردو فارسی عربی جاننے والوں کے لئے قرینِ فہم ہونگی دوسری طرف محض غیر زبان جاننے والوں کی رسائی ذہن کے لائق ہونگی جیسا کہ ستاروں اور برجوں کے ناموں کی مطابقت سے ظاہر ہے۔

اب ہم اہل تطبیق کے مزید اطمینان کے لئے سنسکرت اسمائے علوم کو عربی صورت میں پیش کرتے ہیں ؛

اسماء علوم	معنی	عربی صورت	شرح معانی عربی
کاویہ	نظم	قافیہ	از قفو نظم مقفّٰی و قصیدہ مدح و ذم گفتن ۔
ناٹک	ڈراما	ناطق	بوزن خاتم سرائیدن و مکالمہ فت و تبادل اہل سنسکرت نٹ بمعنی ناچنا سے ماخوذ بتلاتے ہیں۔ عربی میں نطّ بمعنی بیہودہ گوئی نطق بمعنی سرائیدن ہے مگر ڈراما میں سب سے زیادہ نمایاں چیز ایکٹروں کا مکالمہ ہے ناچنا ضروری نہیں ہے ؛
تتو وچار	فلسفہ	تا تُود بصار	تا تُود اسم فاعل اتو مثل تحضور از خضر بمعنی اصل و تخم و نشو و نمائے تخم۔ بصار بمعنی غور و فکر و علم ۔
ویدانت	توحید	وحدہ انتی ۔ وحدانیت	سنسکرت میں ویدانت بمعنی وید کی انتہا بتلایا گیا ہے۔ مگر عربی میں انتی بمعنی حاصل و ثمرہ وید کا۔ جو زیادہ مناسب ہے کیونکہ تمام علوم کو وید سے ماخوذ سمجھا گیا ہے۔ پھر وید عربی

اسمائے علوم	معنی	عربی صورت	شرح معانی عربی
			میں بمعنی علم توحید الہٰی ہے کیونکہ وہ مبدل وحد کا ہے۔ انت بمعنی انتہا عربی میں عنت ہے اور انتا مشابہ انتہاء۔
تیاسے	منطق	نہاء	از نہی علم درستی کلام و از خطا باز دارندہ۔ و بصواب برندہ
جوتش	ہیئت	جہّۃ اِسّ	جَہّۃ فضائے آسمان و زمین۔ اِسّ نشان دہندہ یا صُورۃ بمعنی ستارہ۔
ریکھا گنت	ہندسہ	رَیقع قنتّ	ریقع از رقع۔ اندازہ نمائے فاصلہ بخطوط بنشتہ۔ قنّت قانون و ضابطہ۔ صرف رَیقع کافی تھا۔
بیج گنت	جبر و مقابلہ	بیج قنت	بیج۔ مساوات بذریعہ آواز ہا یعنی حروف۔ جبر و مقابلہ کے تمام قواعد مساوات کے محتاج ہیں۔
ویدک	طِبّ	وَیدق	از وَدق۔ آرام دہندہٗ امراض جسم۔ وَیدَ کہتے ہیں کہ یہ وید سے ماخوذ ہے اس لئے ویدک نام ہُوا مگر طب کا مفہوم اس سے ظاہر نہیں ہوتا اس لئے عربی شرح فایق ہے۔
انک گنت	حساب	عَنَکْث	یکے از اشیائے بسیار و ہمجنس کہ اصل و بُن ہمہ اشیاء باشد و بطور کلید بکار آید مراد عدد مفرد سے ہے۔
کالنی پورن	تاریخ	کال نُفِی بُرہان	کالّ از کل۔ اقوام گزشتہ و ہلاک شدہ نفی خبر دہندہٗ حالات مرگ بُرہان بیان واضح۔
بھوگول	جغرافیہ	بہو غولّ	بہو زمین فراخ۔ غولّ بمعنی غلولہ یا کرہ مجموعاً کُرۂ زمین۔ غولّ کے معنی کتاب خبر دہندہ بھی ہیں۔
چتر و دیا	مصوری	صِطر	نگاشتن و بنشتن و صنعۂ علم۔
گرہیتر مان	تعمیر	قِرَیح تار مان	قِرَیح۔ خانۂ فراخ۔ تار۔ پختہ از آہک ساختہ مان از منو دریافتن اندازہ و حقیقت۔
رنجن	رنگسازی	رزّ آ یا رنق	رزّأ۔ رنگ کردن۔ رنقاً۔ سیاہ رنگ کردن۔

نام علم	معنی	عربی صورت	شرح عربی
ویپار	تجارت	ویفار	از وفر۔ مال بسیار از ہر قسم مہیا داشتن و داد وستد کردن آں برائے افزونی۔
سنگیت	موسیقی	سَنِّیت	از سَن آراستہ شدن و بصورتِ دیگرے برآمدن آراستہ و نیکو کردن سخن را د پائے کوبی۔
تنتواے	پارچہ بافی	تَنَنت وَعَی	تنت نیک بافتن۔ وعی یاد کردن و قادر شدن۔
سورن کارتو	زرگری	شوران قرعۃ اُو	شورون۔ سنگِ آتش رنگ کہ بآرائش جمال و لباس بکار برند۔ قَرعۃ بآتش تاب دادہ کوفتن او ازادی قایم شدن۔

مترجمین کتب انگریزی کی حوصلہ افزائی کے لئے چند علوم کے یونانی ناموں کو جو انگریزی میں مستعمل ہیں عربی صورت میں لاکر حل کرتے ہیں۔

یونانی نام کے معنی	یونانی نام	عربی صورت	شرح عربی
علم تغیراتِ السنۃ	فیلا لوجی	بلال لوضی	بِلال۔ بوزنِ حساب تغیر السنہ۔ لوضی از لضو معلم ض ح متبادل۔ ب پ ف بترتیب متبادل۔
علم تشریح الابدان	فزیا لوجی	فَجیّہ لوضی	از فجو۔ شگاف دادن اعضاءِ جسم را۔
علم کاسۂ سر	فرینا لوجی	فریع ناہ لوضی	فَریع بمعنی سر۔ ناہ از نہی۔ بمعنی کاسہ و ظرف۔
علم الطیور	بیالوجی	بِیاہ لوضی	بیاہ۔ از بوہ۔ بمعنی پرندگان۔
علم طبقات الارض	جیالوجی	جِنیّہ لوضی	جِنیّہ۔ از جوّ اندرونِ مغاکِ زمین۔ و زمین فراخ۔
علم آثار قدیمہ	آرکیالوجی	آرکیّہ لوضی	ارکیہ۔ بمعنی اشیاء دیرینہ یا قدیم۔
علم نباتات قدیمہ	پلانٹا لوجی	بَلَنطَ لوضی	بلنط۔ اسم فاعل۔ بلط بمعنی نباتِ قدیم و متحجر۔ اس علم میں زمین میں پرانی دبی ہوئیں نباتات کے متعلق بحث ہے جو پتھر بن گئی ہیں۔
علم تشریح الانسان	انتھراپالوجی	اِنطرافہ لوضی	انطرافہ۔ تشریح جسم انسان و قدامتِ اعضاء۔ اس علم میں ایسے اندرونی اعضاءِ جسم انسان سے بحث ہے جو تمام حیوانات میں زمانہ قدیم سے مشترک یا ہم شکل چلے آتے ہیں۔

یونانی نام کے معنی	یونانی نام	عربی صورت	شرح عربی
علم الاقوام	اتھنالوجی	عطنہ لوضی	عطنہ۔ گروہ یا قوم شتربانان۔
تہذیب الاقوام	اتھناگرافی	عطنہ قرافی	عطنہ۔ قوم۔ قرانی۔ لیاقت سزاواری و تمدن۔
علم السنین	کرونالوجی	قرونہ لوضی	قُرُون۔ جمع قرن ہائے نسبتی بمعنی ازمنہ۔
قصص و سوانح	ٹریڈیشن	طِراد اِص	طراد۔ حکایاتِ جنگہائے سابقہ و جلاوطنی اقوام۔ اص مجموعہ۔ جمع کے لئے انگریزی میں مستعمل ہے۔
علم ہیئت	اسٹرانومی	اِقتران نومی	اقتران بہم آمدنِ ستارہا در بروج فلکی و نظام حرکاتِ آنہا۔ اقتران کو یونانی خط میں حرف سی C سے لکھیں تو استران بھی پڑھا جا سکتا ہے نومی۔ ازمی خبردہندہ و بیان کنندہ۔
علم کیمیا	کیمسٹری	قیم اسطری	قیم۔ از قوم مثل حیل۔ از حول یعنی قوام معدنیات۔ اِسطری۔ از سطر بہم آوری و حفاظت۔ کیمیا قیمیہ ہے۔
تاریخ	ہسٹری	اسطری	نوشتنِ قصہ ہائے و حفاظت و بہم آوری آنہا۔
افسانہ	سٹوری	سطوری	سَطوری۔ از سطر افسانہ ہائے بے اصل نوشتن۔

(۱۰)۔ انگریزی الفاظ کو عربی صورت پر لانے میں ایک اور دشواری پیش آتی ہے۔ اور وہ انگریزی الفاظ کے تلفظ اور کتابت کا باہمی اختلاف ہے۔ اس کے لئے زیادہ مفید طریقہ یہ ہے کہ کتابت پر اعتبار کیا جائے۔ تلفظ مرورِ زمانہ کے سبب سے بہت بگڑ گیا ہے مگر کتابت اکثر اصلی حالت پر قائم چلی آتی ہے۔ مثالاً اپنا ایک تجربہ بیان کرتا ہوں۔ میں جن دنوں میں دوائیوں کے انگریزی ناموں کی فہرست کو عربی سے حل کر رہا تھا۔ ایک دوا کا نام برگنڈی پچ لکھا ہوا ملا۔ ماہیت کی کیفیت میں لکھا ہوا تھا کہ ایک درخت کا گوند ہے جو سوئٹزرلینڈ کے جنگلوں میں ہوتا ہے۔

یہ پہلے سے معلوم تھا کہ برگنڈی فرانس کے ایک علاقہ کا نام ہے۔ مگر سوئٹزرلینڈ فرانس سے باہر ہے۔ خیال گزرا کہیں سوئٹزرلینڈ کا پرانا نام برگنڈی نہ ہو۔ اس خلجان کو مٹانے کے لئے بارھویں صدی عیسوی کا نقشۂ یورپ دیکھا جو تاریخ یورپ میں درج تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ برگنڈی فرانس سے باہر مگر مشرقی حد سے ملحق ہے اور اس کا نام ڈچی آف برگنڈی یعنی ریاست برگنڈی لکھا ہوا

تحریکِ خیر

پٹنہ میں ... نام کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں ایک ضعیف، بیکس، خستہ حال، گونڈن رہتی تھی، بھنگی نام تھا۔ اُس کے نہ کوئی اولاد تھی، نہ گھر نہ دوار، نہ جگہ نہ زمین، زندگی کا سہارا صرف ایک بھاڑ تھا گاؤں کے لوگ عموماً ایک وقت چبینہ یا ستو پر بسر کرتے ہی ہیں۔ اس لئے بھنگی کے بھاڑ پر ہمیشہ ایک بھیڑ لگی رہتی تھی۔ جو کچھ بھنائی میں ملتا اُسی کو پیس یا بھون کر کھالیتی اور وہیں بھاڑ کی جھونپڑی کے ایک گوشے میں پڑ رہتی۔ وہ روز سویرے اُٹھتی اور چاروں طرف سے بھاڑ جھونکنے کے لئے سوکھی پتیاں بٹور لاتی۔ بھاڑ کے پاس ہی پتیوں کا ایک انبار لگا رہتا تھا۔ دوپہر کے بعد اس کا بھاڑ گرم کیا جاتا تھا۔ لیکن جب ایکادشی یا پورنماشی کے دن رواج کے مطابق بھاڑ نہ گرم ہوتا، یا گاؤں کے زمیندار ٹھاکر بیر سنگھ کے دانے بھونے پڑتے اُس دن اُسے بھوکے ہی سو رہنا پڑتا تھا۔ کیونکہ ٹھاکر صاحب کا کام بیگار میں کرنا پڑتا تھا۔ اس بیگار کے علاوہ بھنگی کو ان کا پانی بھی بھرنا پڑتا تھا۔ وہ ان کے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس لئے انہیں اس قسم کی خدمت لینے کا پورا حق تھا۔ اسے جبر نہیں کہا جا سکتا۔ جبر صرف اتنا تھا کہ یہ بیگار بالکل سوکھی ہوتی تھی۔ ٹھاکر صاحب کا خیال تھا کہ اگر مزدوری ہی دے کر کام کرایا تو پھر بیگار کیسی۔ کسان کو پورا اختیار ہے کہ وہ دن بھر بیلوں کو ہل میں جوتنے کے بعد شام کو بے آب و دانہ کھونٹے سے باندھ دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ اُس کا رحم نہیں، محض اپنی غرض ہے ٹھاکر صاحب کو مزدوری دینے سے تو اصولاً انکار تھا۔ رہی غرض [illegible] کی کوئی فکر نہ تھی۔ کیونکہ ایک تو دن بھر بھوکے رہنے سے بڑھیا مر نہیں سکتی تھی۔ بوڑھے بلا کے [illegible] ہوتے ہیں، موت کی نگاہ بچا کر نکل بھاگنے میں مشاق، ورنہ بوڑھے ہوتے ہی کیوں، دوسرے اگر خدانخواستہ بڑھیا مر بھی جاتی تو اس کی جگہ گاؤں میں دوسرا گونڈ بہت آسانی سے بسایا جا سکتا تھا۔

۲

چیت کا مہینہ تھا۔ اور سنکرانت کے قبل کا دن۔ آج بہار اور دوسرے مشرقی اضلاع میں ستّے

اناج کا ستو کھایا اور خیرات کیا جاتا ہے۔ گھروں میں چولھے نہیں جلتے۔ بھنگی کے بھاڑ کا ہنگامہ خوب گرم تھا۔ بھاڑ کے سامنے ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ دم مارنے کی فرصت نہ تھی۔ کبھی کبھی وہ گاہکوں کی عجلت پر جھنجھلا پڑتی۔ کیا کروں، دو کے چار ہاتھ بنا لوں۔ کھرا نہ بھُنے گا تو مجھی کو گالیاں دو گے۔ اتنے میں ٹھاکر صاحب کے یہاں سے اناج کے دو بڑے بڑے ٹوکرے آپہنچے اور حکم ہوا کہ ابھی بھون دے۔ بھنگی ٹوکرے دیکھ کر سہم اُٹھی۔ ابھی دوپہر تھا۔ پھر سورج ڈوبنے سے پہلے اتنا اناج بھوننا دشوار تھا۔ گھڑی دو گھڑی اور مل جاتی تو ایک اٹھوارے کے کھانے بھر کو اناج مل جاتا۔ بھگوان سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا۔ اُن "جم دوتوں" کو بھیجدیا۔ اب پہر رات تک مفت بھاڑ میں جلنا پڑیگا۔ اُس پر سینکڑوں چھدّے۔ اناج گھٹ گیا۔ کھرا نہیں بھونا۔ یا بہت کھرا کر دیا۔ دیر لگادی۔ مایوسانہ انداز سے دونوں ٹوکرے رکھوا لئے۔

چپراسی نے تند لہجہ میں کہا۔ دیر نہ لگے۔ نہیں تو تم جانوگی،

بھنگی۔ یہیں بیٹھے رہو۔ جب سب دانہ بھُن جائے تو لے کر جانا۔ اگر کسی دوسرے کا اناج چھوؤں تو ہاتھ کاٹ لینا۔

چپراسی۔ ہمیں بیٹھنے کی مہلت نہیں ہے۔ لیکن تیسرے پہر تک دانہ بھُن جائے۔

چپراسی تو یہ تاکید کر کے رخصت ہوا اور بھنگی دانے بھوننے لگی۔ دوسرے گاہک تکرار کرنے لگے۔ ہم دو گھنٹے سے کھڑے ہیں۔ ہمارا دانہ نہیں بھونا۔ اب کل ستو کیسے بنے گا؟

بھنگی نے چڑھ کر کہا۔ "میں کیا کروں۔ جمدار کا اناج نہ بھونوں تو رہوں کہاں، تمہارے مُنہ نہیں تھا۔ چپراسی سے کیوں نہ کہا اتنا اناج تو تم اکیلے دئے جاتے ہو۔ ہمارا اناج کون بھونے گا؟

لاچار لوگوں نے اپنی اپنی چھبڑیاں اُٹھائیں اور چلتے ہوئے۔ بھنگی فدائیانہ جوش کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی۔ مگر من بھر سے ز[illegible]ج بھوننا کوئی دل لگی تو تھی نہیں۔ اور پھر تھوڑی دیر میں بھوننا چھوڑ کر بھاڑ بھی جھونکنی پڑتی تھی تاکہ تاؤ ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔ تیسرا پہر ہو گیا اور ابھی آدھا اناج بھی نہ ختم ہوا۔ وہ ڈری کہ کہیں زمیندار کے آدمی آتے ہوں۔ آتے ہی گالیاں دینے لگیں۔ بھاڑ پھوڑنے لگیں اور تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کیا۔ ایک نگاہ دروازے کی طرف تھی، دوسری ناند کی طرف یہاں تک کہ بالو ٹھنڈا ہو گیا اور دانہ سیوڑا نکلنے لگا۔ لوہے کا دستی چمچہ چلاتے چلاتے دونوں

ہاتھ شل ہو گئے۔ مصیبت کا سامنا تھا۔ اپنی بیکسی پر رونے لگی۔ نہ جانے نارائن کہاں بھول گئے ساری دُنیا مرتی ہے۔ مجھے موت بھی بھول گئی۔ جس کی یہاں دُرگت ہے اُسے کوئی وہاں بھی نہیں پوچھتا۔ کون میرے آنسو پونچھتا ہے اپنا خون جلاتی ہوں تو کہیں دانہ میسر ہوتا ہے، لیکن جب دیکھو سر پر سوار۔ اسی لئے نہ کہ ان کے گاؤں میں رہتی ہوں۔ ان کی چار انگل دھرتی پر میرا نباہ ہو رہا ہے۔ ایسی کتنی زمین گاؤں میں پڑی ہوئی ہے۔ کتنے ہی بڑے بڑے گھر اُجڑے ہوئے ہیں۔ وہاں تو کیسر نہیں ہوتی۔ پھر مجھی پر آنکھوں پہر یہ دھونس کیوں رہتی ہے۔ کوئی ذرا سی بات ہوتی ہے تو یہی دھمکی ملتی ہے کہ بھاڑ کھود کر پھینک دوں گا۔ اُجاڑ دوں گا۔ میرے سر پر بھی کوئی ہوتا تو کیوں یہ دھکے سہنے پڑتے۔

وہ انہیں خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ زمیندار کے دونوں چپراسیوں نے آکر پوچھا، اناج بھن گیا؟ بھنگی نے بے خوف ہو کر کہا۔ بھن تو رہا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو۔

چپراسی۔ سارا دن گذر گیا اور تجھ سے اتنا اناج نہ بھونا گیا۔ اور تو یہ بھون رہی ہے کہ اناج کا ستیاناس کر رہی ہے۔ یہ تو بالکل سیوڑے ہیں۔ ان کا ستو کیسے بنے گا۔ دیکھ تو آج ٹھاکر تیری کیا دُرگت کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ اُسی رات کو بھاڑ کھود کر پھینک دیا گیا۔ اور حرماں نصیب، آفت زدہ بڑھیا کا کوئی سہارا نہ رہا۔

۳

بھنگی کی روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ گاؤں والوں کو بھی بھاڑ کے بغیر تکلیف ہونے لگی۔ کتنے ہی گھروں میں تو دوپہر کو دانہ ہی نہ میسّر ہوتا۔ لوگوں نے جا کر ٹھاکر صاحب سے سفارش کی کہ بڑھیا کو بھاڑ جلانے کا حکم دید یجئے لیکن ٹھاکر صاحب نے پروا نہ کی۔ بولے یہ شیطان کی خالہ ہے۔ نہ جانے کس گھمنڈ میں بھولی ہوئی ہے۔ بھوکوں مریگی تو سیدھی ہو جائے گی۔ میرا من بھر دانہ چوپٹ کر کے رکھ دیا۔ سمجھتی ہو گی ٹھاکر میرا کیا لیں گے۔ یہ نہیں جانتی کہ ٹھاکر ہی کی بدولت چین کی بنسی بجاتی ہوں۔

ٹھاکر صاحب کی یہ مردانہ باتیں سن کر لوگ لوٹ آئے۔

ایک اسامی نے کہا۔ اس مزے مُرد سے پر کیا تاؤ کھاتے ہیں۔ کسی مرد سے ہاتھ ملاتے تو

معلوم ہوتا۔

دوسرا بولا۔ ان کی ٹھکرائی غریبوں کو پسینے ہی میں رہ گئی ہے۔ سرکاری پیادوں کو دیکھ کر تو کانپنے لگتے ہیں، مردوں کے منہ کیا آئیں گے۔ ہاں ہم لوگ ان کے گاؤں میں بسے ہیں جو چاہیں کریں۔

کئی دن تک تو بھنگی جوں توں کرکے بسر کرتی رہی۔ سنکرانت کے دن اناج زیادہ مل گیا تھا لیکن جب وہ اناج خرچ ہوگیا تو فاقے کرنے لگی۔ کئی آدمیوں نے سمجھایا تیرا اس گاؤں میں کیا رکھا ہے کیوں کسی دوسرے گاؤں میں نہیں چلی جاتی۔ ہم وہاں چل کر تیرا بھاڑ بنوا دیں گے۔ تیرے رہنے کو ایک جھونپڑی بھی اُٹھا دیں گے۔ آرام سے رہنا۔ سب زمیندار ایسے ہی تھوڑے ہیں۔ مگر بڑھیا نے یہ تجویز منظور نہ کی۔ اس گاؤں میں اس نے اپنی مصیبت کے پچاس برس کاٹے تھے۔ یہاں کے ایک ایک پیڑ پتے سے اُسے محبت ہوگئی تھی۔ یہاں وہ بچے بچے کو جانتی تھی۔ بچہ بچہ اُسے جانتا تھا سارا گاؤں اپنا گھر معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کے سُکھ دُکھ سب اسی گاؤں میں جھیلے تھے۔ اب آخری وقت میں اس سے کیونکر ناتا توڑے۔ اس خیال ہی سے اُسے قلق ہوتا تھا۔ دوسرے گاؤں کے سُکھ سے یہاں کا دُکھ بھی پیارا تھا۔

اس طرح ایک پورا مہینہ گذر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ ٹھاکر بیر سنگھ اپنے دو تین چپراسیوں کو لئے لگان وصول کرنے جا رہے تھے۔ کارندوں پر انہیں اعتبار نہ تھا۔ نذر نذرانے میں، حق دستوری میں، وہ کسی غیر کو شریک نہ کرنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی کہا کرتے زمینداری میں کیا رکھا ہے۔ سرکاری مطالبہ اور عدالت کے خرچ نکال کر سینکڑے میں دس روپے بھی نہیں بچتے۔ اب تو جو کچھ ہے وہ یہی اوپری رقم ہے۔ اسی پر یہ سارا ٹھاٹ بنا ہوا ہے۔ غرور کی نگاہوں سے ادھر اُدھر تاکتے۔ اسامیوں کے سلاموں کا تبسم سے جواب دیتے چلے جاتے تھے۔ کتنا رعب تھا، کتنی تعظیم! عورتیں انہیں دیکھتے ہی جھٹ گھونگھٹ بڑھا کر منہ پھیر لیتی تھیں۔ دروازوں پر بیٹھے ہوئے لوگ گھبرا کر کھڑے ہوجاتے تھے کوئی اپنی پگڑی سنبھالنے لگتا۔ کوئی اپنا ناریل آڑ میں رکھ آتا تھا۔ اس شان سے گاؤں کا چکر لگاتے ہوئے وہ بھنگی کی بھاڑ کی طرف سے گذرے۔ اُدھر تاکنا تھا کہ بدن میں آگ لگ گئی۔ بھاڑ کی ازسرِنو تعمیر ہو رہی تھی۔ بڑھیا مٹی کے لوندے اُٹھا اُٹھا کر بڑی تیزی سے رکھ رہی تھی۔ شاید اُس نے کچھ رات رہتے ہی کام میں ہاتھ لگا دیا تھا اور طلوعِ سحر سے پہلے ہی اُسے ختم کر دینا چاہتی

تھی۔ آج دیوی کی پوجا تھی۔ رواج کے مطابق اُنکی چبوترے پر گاؤں کی کنواری لڑکیوں کو ستو کھلایا جانے والا تھا۔ بڑھیا نے اس تقریب کے لئے ہمیشہ اپنے بھاڑ میں دانہ بھونا تھا۔ اس کی مزدوری وہ کچھ نہ لیتی تھی۔ اگر آج بھاڑ نہ تیار ہو گیا تو دانہ کون بھونے گا؟ کسی دوسرے گاؤں سے دانہ بھُن کر لایا گیا تو کہیں دیوی جی ناراض نہ ہو جائیں۔ نہ جانے گاؤں پر کیا آفت آئے۔ ٹھاکر بگڑینگے۔ کوئی پروا نہیں۔ دیوی تو خوش ہونگی۔ ٹھاکر بگڑینگے تو بہت کرینگے میرا بھاڑ پھر کھدوا دیں گے۔ دیوی بگڑیگی تو گاؤں کی خیریت نہیں۔ اور پھر ٹھاکر صاحب بھی تو دیوی کے بھگت ہیں۔ وہ ایسی جرات کیسے کرینگے؟ دیوی سے تو راجہ بھی ڈرتا ہے۔ ٹھاکر کی کون گنتی۔ ان خیالوں نے بڑھیا کو بھاڑ کی مرمت پر آمادہ کیا تھا۔ وہ اپنے کام میں ایسی محو تھی کہ ٹھاکر صاحب کے آنے کی بھی اُسے خبر نہ ہوئی۔ دفعتہً اسکے کان میں آواز آئی۔ کس کے حکم سے؟

بھنگی نے چونک کر سر اُٹھایا تو ٹھاکر صاحب کھڑے تھے۔ کچھ جواب نہ دے سکی۔

ٹھاکر صاحب نے پھر وہی سوال کیا۔ کس کے حکم سے؟

بھنگی نے دلیرانہ انداز سے جواب دیا۔ ’دیوی جی کے حکم سے‘

ٹھاکر۔ اس گاؤں کا مالک میں ہوں۔ دیوی نہیں۔

بھنگی نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا ’ٹھاکر ایسی بات مُنہ سے نہ نکالو۔ دیوی سنسار کی مالک ہیں ہم تم کس گنتی میں ہیں؟

ٹھاکر۔ (چپراسیوں سے) کیسی چگھڑ بڑھیا ہے۔ دیوی کا خوف دلا کر مجھے نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ گرا دو اس کے بھاڑ کو،

چپراسیوں میں کسی کو اس حکم کی تعمیل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ٹھاکر صاحب کا غصہ اور بھی تیز ہوا۔ چپراسیوں کو نمکحرام اور ڈرپوک کہتے ہوئے گھوڑے سے اُتر پڑے اور بھاڑ میں زور سے ایک ٹھوکر ماری۔ مٹی گیلی تھی۔ سب کچھ لئے دیئے بیٹھ گئی۔ دوسری ٹھوکر ناند پر چلائی لیکن بڑھیا سامنے آگئی۔ ٹھوکر اس کی کمر پر پڑی۔ اوندھے منہ گر پڑی۔ آنکھوں کے سامنے تتلیاں اُڑنے لگیں۔ اب اسے غصہ آیا۔ کمر سہلاتی ہوئی بولی۔ ٹھاکر۔ تمہیں آدمی کا ڈر نہیں ہے تو دیوی دیوتا کا ڈر تو ہونا چاہیئے۔ مجھے اس طرح اُجاڑ کر کیا پاؤ گے؟ کیا اس چار انگل دھرتی میں سونا نکل آئیگا۔ میں تمہارے ہی بھلے کو کہتی ہوں۔ گریب کی ہائے بڑی ہوتی ہے۔

میرا دل مت دُکھاؤ۔
ٹھاکر۔ اب تو یہاں پر بھاڑ نہ بنائیگی؟
بھنگی۔ بھاڑ نہ بناؤنگی تو کھاؤنگی کیا؟
ٹھاکر۔ تیرے پیٹ کا ہم نے ٹھیکہ لیا ہے؟ گاؤں چھوڑ کر نکل جا۔
بھنگی۔ کیوں نکل جاؤں؟ بارہ سال کھیت جوتنے سے آسامی کاشتکار ہوجاتی ہے۔ میں تو اسی جھونپڑی میں بوڑھی ہوگئی۔ میرے ساس سسر اور اُن کے باپ دادے اسی جھونپڑی میں رہے۔ اب جم راج کو چھوڑ کر مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا،
ٹھاکر۔ اچھا تو اب تو قانون بھی بگھارنے لگی۔ ہاتھ پیر جوڑتی تو چاہے رہنے بھی دیتا۔ لیکن اب تجھے نکال کر ہی دم لونگا۔ (چپراسیوں سے) ابھی جاکر اس کے پتوں کی ڈھیری میں آگ لگادو دیکھیں اب کیسے بھاڑ جلاتی ہے،
بھنگی نے کہا۔ آج دیوی کی پوجا ہے۔ بھاڑ جلانے دو۔ کل جو جی میں آئے کرنا۔
ٹھاکر۔ تیرا ہی ایک بھاڑ نہیں ہے۔ دوسرے گاؤں میں بھی بھاڑ گرم ہوتے ہیں۔

۴

ایک لمحہ میں شعلے اُٹھنے لگے۔ اُنکی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرنے لگیں لپٹیں کسی دیوانے کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں۔ سارے گاؤں کے لوگ اُس کوہ آتشیں کے چاروں طرف جمع ہوگئے۔ بھنگی اپنے بھاڑ کے پاس غمناک بیٹھی ہوئی یہ دلسوز نظارہ دیکھتی رہی۔ اس کے دل میں نہ جانے کیا کیا خیالات آرہے تھے۔ مجھ پر اتنا غصہ! اسی ابھاگے پیٹ کے لئے اتنی مصیبت۔ دھتکار ہے ایسی جندگانی پر! کون کوئی میرے آگے پیچھے بیٹھا ہوا ہے کہ یہ سب اندھر سہہ کر بھی جیتی رہوں۔ اب سہارا ہی کیا ہے۔ بھاڑ ہی ٹوٹ گیا۔ پتیاں جل ہی گئیں۔ کیا بھیکھ مانگ کر پیٹ پالوں۔ اتنی عمر بیت گئی۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اب کے دن کے لئے یہ دھکے سہوں یہ سوچتے سوچتے بڑھیا رونے لگی۔ ناکامی اور یاس کا غلبہ اور بھی زیادہ ہوا۔ سر پر ایک جنون سا سوار ہوگیا۔ وہ تیزی سے اُٹھی اور دہکتے ہوئے شعلوں میں گھس گئی۔ لوگ چاروں طرف سے دوڑے لیکن کسی کی ہمت نہ پڑی کہ آگ کے

مُنہ میں جائے۔ ٹھاکر صاحب گھوڑے پر سوار یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جوں ہی بڑھیا شعلوں میں گھُسی وہ بجلی کی طرح گھوڑے سے کود ے اور دم زدن میں ہوا کی طرح شعلوں کے اندر داخل ہو گئے۔ ساری خلقت دم بخود، ہراس اور وحشت کے عالم میں کھڑی تھی۔ ایک لمحہ بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ ٹھاکر صاحب بھُنگی کو گود میں لئے آگ سے باہر نکلے۔ اُن کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ بھُنگی کے کپڑے بھی جل رہے تھے۔ وہ بے ہوش تھی۔ لوگوں نے اپنے کمل اُتار اُتار کر اُنہیں اوڑھا دیئے۔ بھنگی کی جان کی کسی کو پروا نہ تھی۔ سب کے سب ٹھاکر صاحب کی جان کی خیر منا رہے تھے۔ خیریت یہ تھی کہ اُنہیں آگ سے کوئی گزند نہ پہنچا تھا۔ صرف کہیں کہیں جلد پر آنچ آ گئی تھی۔ مگر بڑھیا کا سارا جسم جھُلس گیا تھا۔

آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ شعلے ابھی تک دہک رہے تھے اور ٹھاکر صاحب بڑھیا کو گود میں لئے اُس کی جلن کو اپنے آنسوؤں سے ٹھنڈا کر رہے تھے۔ ان کے گھر کی عورتیں بھی آ گئی تھیں۔ کوئی بڑھیا کو پنکھا جھلتی تھی۔ کوئی اس کے جسم پر مسکے کا لیپ کر رہی تھی۔ اور لوگ بھی اپنے اپنے دیہاتی لٹکے کام میں لا رہے تھے۔

دفعتہً ٹھاکر صاحب نے کہا "کسی کو شہر بھیجدو ابھی ڈاکٹر کو بلا لائے"

ٹھکرائن نے کہا۔ انہیں دیہاتی لٹکوں سے اچھی ہو جائیگی۔ ڈاکٹر کو بلا کر کیا ہو گا،

ٹھاکر۔ اگر وہ مر گئی تو میں زہر کھا لوں گا،

ٹھکرائن۔ اب وہ نہ مرے گی۔

ٹھاکر۔ (جوش سے) ہاں اگر میرے امکان میں ہے تو اب وہ اس صدمے سے نہ مریگی اپنی موت سے مریگی۔

۵

ٹھاکر بیر سنگھ اپنے علاقہ میں بہت نیکنام نہ تھے۔ اس واقعہ نے اُنہیں منظور خاص و عام بنا دیا۔ اسامیوں نے بالعموم ان کی جانبازی کی تعریف کی۔ مگر زمینداروں نے اسے فوری جنون سمجھا۔ ایک بڑھیا کے لئے آگ میں کودنا فضول تھا۔ اُس کے مر جانے سے کون سنسار سونا ہُوا جاتا تھا۔ کوئی اس کے نام کو رونے والا بھی تو نہ تھا۔ ہاں آپ مر جاتے

تو البتہ خاندان بے چراغ ہو جاتا۔

ایک مہینہ گذر گیا تھا۔ بھُنگی ٹھاکر صاحب کے مکان میں لیٹی ہُوئی تھی۔ بیر سنگھ اسکے سرہانے بیٹھے ہُوئے تھے۔ دفعتہً بھُنگی نے کہا، بھیّا اب تو میں اچھی ہو گئی۔ مجھے اپنا بھاڑ کیوں نہیں جھونکنے دیتے۔ یہاں کب تک پڑی رہونگی۔ بہت دن تو ہو گئے،

بیر سنگھ نے کہا "بھناجی رو ب گیا۔ کوئی تکلیف ہے ؟

بھُنگی - ہاں بھیّا جی کیوں نہ روبے گا۔ دودھ اور حلوا کھانے اور آٹھوں پہر پان کی طرح پھیرے جلانے سے کس کا جی نہ روبے گا۔ اس سے بڑھ کر اور کون تکلیف ہو گی! کیوں بھیّا۔ جب تم میرے پیچھے آگ میں گھُسے تمہیں ڈر نہ لگا۔ یہ بھی نہ سمجھا کہ ایک بڑھیا کے لئے کیوں اپنی جان جوکھم میں ڈالوں۔ میں بہت سوچا کرتی ہوں کہ اُس گھڑی تمہارے من میں کیا بات آئی،

ٹھاکر - میں نے کچھُ نہ سوچا سمجھا۔ مجھے تو جیسے ایک نشہ سا آگیا۔ میں آپے میں نہ تھا۔ خود بخود میرے پیر آگ کی طرف دوڑے۔ مجھے ذرا بھی خیال نہ تھا کہ کیا کرتا ہوں، کہاں جاتا ہوں، کیوں جاتا ہوں۔ کچھُ بھی ہوش حواس نہ تھا۔ سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا۔ ایشور کو مجھے کلنک سے بچانا منظور تھا۔ اور کیا +

پریم چند

سب سے محبت کرو اور بہت کم پر اعتماد، لیکن کسی کے ساتھ بُرائی نہ کرو۔ شکسپئیر

دُنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں، سب اپنی اپنی جگہ کارآمد ہیں۔ "لونگ فیلو"

ان لوگوں کی حالت کس قدر قابلِ رحم ہے جن میں صبر نہیں "شکسپئیر"

اگر تم اپنی زندگانی کو خوشی اور شادمانی کے ساتھ بسر کرنا چاہتے ہو تو صلح پسند بنو "تھیکرے"

(خالد)

بے صبروں کا دوزخ

میرے دوست یقین نہیں کرتے۔ میرے ذاتی تجربہ کو وہ افسانہ نویسی بیان کرتے ہیں۔ ناچار پبلک کو منصف قرار دیتا ہوں۔ تمہیداً اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ میرے دوست بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں دروغ گو ہوں۔ دشمن تو واقعی مجھے راستباز خیال اور بیان کرتے ہیں کیونکہ محض ازروئے بغض میں انہیں کبھی موقع نہیں دیتا کہ وہ مجھے عملاً یا قولاً جو فروش گندم نما ظاہر کر سکیں۔ یہ واقعی میری کمزوری ہے کہ میں ہمیشہ دشمنوں کی عداوت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہوں اور دانستہ انہیں "مجھے جھوٹا" ثابت کرنے کی خوشی سے محروم رکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہر شریف آدمی کا فرض ہے کہ دشمنوں کی خاطر چند عیوب کو اچھی طرح سے پالے تاکہ ان کو جھوٹی تہمت لگانے کے فضول عیب سے بچائے یسوع مسیح کا قول ہے کہ "دشمن سے محبت کرو" اور محبت اصلی اور سچے معنے میں یہی ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس کی اخلاقی عظمت کا پورا خیال رکھا جائے۔ دشمن سے محبت کرنے کے یہی معنے ہیں کہ اپنے میں وہ برائیاں پیدا کرو جو تمہارا دشمن چاہتا ہے کہ تم میں ہوں تاکہ وہ تم کو بغیر جھوٹ بولنے کے بدنام کر سکے اور اس کی اخلاقی عظمت قائم رہے۔ میں یہ نہیں کرتا اور یہ بخل میرا طبعی ہے اور میں اللہ جل شانہ سے ہزار بار دعا کر چکا ہوں کہ میری طبیعت سے یہ بخل کم ہو مگر نہیں ہوتا۔ ہاں مگر دوستوں سے میں نے کبھی اس قسم کی پردہ بازی نہیں کی۔ پھر وہ مجھے کیوں صادق تصور کرتے ہیں؟ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عادت سے مجبور ہو کر اس قدر ذلیل ہو گیا ہوں کہ دوستوں سے بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ گویا ان سے بھی دشمنی کرتا ہوں۔ مگر یہ غنیمت ہے کہ میرے دوست اس قدر میرے محرم راز ہیں کہ ان کو میرے بیسیوں اور عیوب معلوم ہیں۔ اور اس لئے وہ برسر پرخاش نہیں ہوتے۔ بلکہ کیا تعجب ہے کہ وہ میری راستبازی کو ایک قسم کا مرض تصور کرتے ہوں۔ اور اس لئے چنداں معترض نہ ہوں۔ ایشیا میں جہاں اور امراض کا زور ہے یہ بھی بمنزل فیل پائی کسی کسی شخص میں موجود ہے گو عام نہیں اور ممکن ہے کہ میں بھی اسی مرض میں مبتلا ہوں۔ شاید ایسا ہی ہو کیونکہ آخر میں یورپین تو نہیں۔ ہوں تو وہی کالا آدمی۔ خیر آمدم برسرِ مطلب۔

۱۹۱۸ء کے انفلوانزا کی وبا کی اعداد شماری پر میرا بھی احسان ہے۔ صرف اعداد شماری میں ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر پروری میں بھی میں نے حصہ لیا۔ بہت سے لوگ ضرور ایسے تھے کہ جنہوں نے اس نادر موقع پر بھی خسّت سے کام لیا اور جو ڈاکٹروں کو فیس دئے بغیر چل دئے یا اس سے بدتر کہ فیس دئے بغیر اچھے ہو گئے۔ ڈاکٹر حق بجانب ہونگے اگر انہیں کبھی معاف نہ کریں مگر میں اِس زمرہ میں نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا پورا علاج کیا۔ میں سخت احسان فراموش ہونگا۔ اگر ان کی خدمات کا اعتراف نہ کروں مگر مرض کو دوا سے ضد تھی۔ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" انفلوانزا سے ڈبل نمونیا ہُوا۔ تھوک سفید سے گلابی۔ گلابی سے گلنار۔ سانس ایک کی بجائے چار۔ غذا بند۔ غشوں کا انبار۔ سب کچھ ہُوا۔ ساتھ والے کمرے میں صنفِ نازک کا ایک لاجواب نمونہ اپنے انفلوانزا کے باعث نہیں بلکہ میری بُری حالت کی خبر کی وجہ سے جاں بحق ہُوئی۔ جیسا کہ مشہور ہونا چاہیئے تھا مشہور ہو گیا کہ میں مر گیا ہوں۔ فرشتوں نے بھی غالباً باہر سے ہی سُنا اور وہ میرے ہی کمرے میں داخل ہُوئے فرشتے اس معاملے میں بالکل بے قصور تھے۔ جنگ یورپ کے تھکے ہُوئے۔ لاشیں گھسیٹتے گھسیٹتے چور ہو چکے تھے۔ اگر جلدی میں ایک کمرے کی بجائے دوسرے میں داخل ہو گئے تو کیا تعجب۔

ایک نے میری روح سے کہا چل، روح تھر تھر کانپتی ہُوئی نکلی۔ ایک نے اس طرف ایک نے اُس طرف سنبھالا۔ تھوڑی دُور جا کر روح کو پھر انہوں نے ایک عجیب قسم کا جسم پہنایا اور آناً فاناً اس میرے پُرانی رُوح والے نئے جسم کو ایک عالیشان عمارت کے بیرونی کمرے میں داخل کر دیا۔ روح نکالنے والے فرشتے چلدیئے۔ اس کمرے میں اور بھی میری جیسی بیسیوں ہستیاں تھیں۔ مگر سب خاموش۔ اتنے میں چند محافظ داخل ہُوئے اور ہم سب کو ہانک کر لے گئے۔

ایک محافظ نے دوسرے سے کہا کہ ہاں یہ سب ساتویں طبقے والے ہیں۔ میں اپنی کرتوتوں سے واقف تھا۔ کچھ متعجب نہ ہُوا۔ سمجھ گیا کہ جہنم کا ساتواں طبقہ میری رہائش کے لئے موزوں خیال کیا گیا ہے۔ کسی حد تک خوشی ہوئی کہ غنیمت ہے کہ گیارھواں نہیں یا اکیسواں نہیں۔ گو مجھے کوئی علم نہ تھا کہ کُل کتنے طبق ہیں مگر خود پسندی نے وہاں بھی نہ چھوڑا۔ یہی جی میں آیا کہ تجھ سے ہزاروں اور بدتر ہونگے اسی لئے تو تجھے ساتواں طبقہ ملا ہے۔ آناً فاناً ساتویں طبقہ کے دروازہ

پر پہنچ گئے۔ (جہنم کے کارندے بلا کے پھرتیلے ہیں۔ رستہ بھی نہ دیکھنے دیا اور جھٹ لے کر پہنچ گئے) وہاں ایک ایک کا جائزہ لیا گیا۔ میرا نمبر سب سے اخیر تھا۔ باقی تو سب داخل کئے گئے۔ مگر میرے داخلہ کے وقت کچھ آپس میں ان محافظوں کے اشارے ہُوئے جس سے میں یہ سمجھا کہ کچھ غلطی ہُوئی ہے۔ چنانچہ ایک اخیری اشارے سے جس کے معنے یہی ہو سکتے ہیں "یہاں کا نہیں" مجھے نکالا گیا۔ اب مجھے ایک ایسی جگہ لایا گیا جو میرے خیال ناقص میں جہنم کا Enquiry office تھا یہاں جب تلک کہ وہ رجسٹر دیکھیں مجھے اِدھر اُدھر تاک جھانک کا موقع ملا۔ کوئی ایسی انوکھی بات نظر نہ آئی۔ بھیڑ تھی۔ متوحش بھیڑ تھی۔ مگر اس قسم کی بھیڑ بہت دفعہ ریل کے اسٹیشنوں پر درجہ سوئم کے داخلہ پر میں دیکھ چکا تھا۔ محافظوں کے چابک اپنا کام کر رہے تھے مگر آہ و بکا کچھ نہ تھی۔ سب ہستیاں صرف اس سراسیمگی میں تھیں کہ ہم کہیں رہ نہ جائیں۔ شاید اس حصۂ جہنم کی یہی مقررہ سزا ہو کہ انسان سفر کی سراسیمگی میں ابدی طور پر گرفتار رہے۔ ریل سامنے۔ ٹکٹ پاس مگر داخل ہونا نہیں ملتا۔ چابکوں کی جسمانی تکلیف محسوس نہیں ہوتی کیونکہ روحانی خوف طاری ہے کہ ریل کہیں چل نہ دے۔ عورتیں۔ بچے۔ بوڑھے پاؤں تلے روندے جا رہے ہیں۔ کوئی کسی کا رفیق نہیں۔ مددگار نہیں پرساں حال نہیں۔ پیچھے سے دھکیلے جا رہے ہیں۔ آگے سے پیچھے گھسیٹے جا رہے ہیں۔ گٹھریاں۔ لاٹھیاں ڈاڑھیاں۔ پگڑیاں۔ دوپٹے۔ آنکھیں سب خلط ملط ہو رہی ہیں۔ انسانی اضطراب کی واقعی خوفناک تصویر تھی اور بہت سخت سزا۔ میں ابھی یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ دفتر کے کسی بڑے صاحب نے کسی ماتحت کو کہا "ڈیم۔ ڈیم فول۔ بہشت کا بچہ (یہ شاید وہاں کی گالی ہو)۔ نکالو۔ بے صبر لوگ کے دوزخ میں لے جاؤ"

چنانچہ میں اس دفتر سے نکالا گیا۔ مجھے نکالتے نکالتے بابو صاحب نے کچھ اور بھی نکالا۔ یعنے اپنا غصہ۔ ایک لات۔ دو مکّے۔ اور کئی زبانی تبرکات۔ میرے حصّے میں آئے۔ باقی دفتر کے چپراسیوں میں بٹے۔ مگر اس لکد کوبی میں بلا کی تاثیر تھی۔ میں دھواں دھار خلا میں سے لڑھکتا ہُوا۔ قلابازیاں لگاتا ایک عمارت کے دروازہ پر پُہنچا۔ دروازہ خود بخود کھُل گیا۔ میں سر پہلے پاؤں پیچھے لڑھکتا ہُوا دروازہ میں داخل ہُوا۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ از غیب ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دیا گیا۔ انفلوانزا سے پہلی زندگی میں میں ترقی کے لئے

ہمیشہ بے صبر رہتا تھا۔ چنانچہ اس کاغذ پر صرف یہ لفظ لکھے ہوئے تھے۔

تمہاری ترقی ہوگی

مگر سکنڈ سکنڈ میں یہی فقرہ بدل کر یوں ہو جاتا تھا۔

ابھی نہیں

میری وہ روحانی ایذا قابل بیان نہیں جب کہ ترقی ہوگی، والا فقرہ پل پل میں بدل کر "ابھی نہیں" ہو جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میری دائمی سزا ہے۔ کوئی الفاظ بیان نہیں کر سکتے کہ یہ سزا میرے لئے کتنی بڑی تھی۔ یا یہ کہ انصاف الہی نے کس قدر موزوں سزا میرے لئے تجویز کی۔ "ہوگی"، "ابھی نہیں"۔ "نہیں"۔ "ہوگی" "نہیں" "ابھی نہیں" کوئی دوزخ ان سیدھے سادھے دو تین لفظوں کے بار بار بامر مجبوری پڑھنے اور محسوس کرنے سے بدتر نہیں ہو سکتا۔ اگر میرا بس چلتا تو اپنی اس بے صبر شخصیت کو سو سو طرح سے قتل کرتا جس نے مجھے یہ روز بد دکھایا کہ ہمیشہ کے لئے "ہوگی" "نہیں ہوگی" کے چکر میں گرفتار رہوا۔ رنج۔ غصہ۔ پشیمانی گھٹا باندھ باندھ کر میرے قلب پر حملہ کرتے تھے۔ "ہوگی" "نہیں ہوگی" کے تازیانے میری روح کی کھال ادھیڑے ڈالتے تھے۔ مجھے تو یہ معلوم ہوا کہ ہزاروں سال مجھے یہ سزا ملی ہے مگر ایکبارگی آسمان سے شعلہ سان ایک پنجہ گرا اور مجھے اٹھا کر چلتا بنا۔ تھوڑی دیر کا مجھے پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔ مگر آخر مجھے ہوش آیا اور میں ایک نئی قسم کی عمارت میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم مجھے مل گیا ہے۔ ابھی اور کچھ دیکھنے نہ پایا تھا کہ ایک نہایت شاندار بزرگ اس کمرے میں وارد ہوئے۔ فرمانے لگے۔

"مسٹر — مجھے آپ سے ایک غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ میں ملک الموت ہوں۔ میرے کارندوں نے آپ کو اٹھا لانے میں غلطی کی۔ آپ کو قبل از وقت جو تکلیف ہوئی وہ آپ معاف کریں۔ چلئے اپنے گھر"

میں۔ جناب۔ کیا۔ یہ آپ کا دولت خانہ ہے؟

ملک الموت۔ نہیں۔

میں۔ بہت بہتر۔ پھر آپ تشریف لیجائیے۔ میں آپ کو غلطی معاف کرتا ہوں۔ مگر میں واپس

جانا نہیں چاہتا۔ مجھ سے پھر کوئی بے صبری کی بات ہو جائے گی اور میں بے صبروں کے دوزخ میں اب دوبارہ جانا نہیں چاہتا۔ میں اسی جگہ رہوں گا۔ یہ مجھے پسند ہے۔ صاحب خانہ اگر نکالینگے تو میں نکل جاؤں گا۔

ملک الموت۔ یہ ضد اچھی نہیں۔

میں۔ ضد جناب کی طرف سے ہے کہ جاؤ اپنے گھر۔ میری طرف سے کوئی ضد نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کن صاحب کا مہمان ہوں۔ جب آپ کا یہ گھر نہیں تو آپ بھی مہمان ہیں۔ ایک مہمان کو دوسرے مہمان کے نکالنے کا حق تو کبھی نہیں سُنا۔

ملک الموت۔ اچھا میں صاحب خانہ کو بُلاتا ہوں۔

اتنے میں ایک شاندار مگر نہایت ہی پیاری صورت والے بزرگ وارد ہوئے۔ اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"مسٹر۔ آپ نے ایک ایسا لفظ استعمال کیا ہے جس سے میں قریباً مجبور ہو جاتا ہوں بالخصوص اس لئے کہ آپ حتی الامکان مہمان نواز ضرور ہیں مگر میرے اختیارات بہت محدود ہیں۔ میں فرشتوں کے کام کا نگران ہوں۔ اگر کوئی سہو ہو جائے تو اسے درست کرنا میرے سپرد ہے۔ آپ کے متعلق محض سہواً کچھ کارروائی عمل میں آئی جسے درست کرنا میرا فرض تھا چنانچہ میں آپ کو دوزخ سے نکال لایا۔ مگر یہاں میں آپ کو رکھ نہیں سکتا۔

میں۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ آپ کا گھر ہے۔ آپ خود مجھے یہاں لائے۔ لازمی طور پر میں آپکا مہمان ہُوا۔ آخر مہمان کا آپ کے ہاں کم سے کم حق کیا ہے؟ میں ناکارہ سہی مگر اس کم سے کم حق سے تو محروم نہیں ہو سکتا۔ آپ کی شفقت سے بعید نہ ہوگا اگر مجھے اس حق سے فیضیاب ہونے دیں۔

نگران فرشتہ۔ میں آپ کو صرف اتنے وقت تک رکھ سکتا ہوں جو آپ کی زبان میں تین دن سمجھا جاتا ہے۔

میں۔ مگر اس عرصے میں مجھے آپ بہشت و دوزخ کی سیر تو کرا سکتے ہیں۔

نگران فرشتہ۔ بہشت کی ہر گز نہیں۔ کیونکہ وہاں کے کام میں سہو کو دخل نہیں میرا منصب

صرف سہوی امور کی درستی ہے۔
میں - بہت بہتر۔ جس امر میں آپ کا اختیار نہیں اس کے لئے میں آپ کو کیسے کہوں۔ مگر میری بیوی کہاں ہیں؟
ملک الموت - یہی تو غلطی ہوئی۔ ان کو لانا تھا آپ کو لے آئے۔ ان کو بہشت میں لیجانا تھا وہ اب وہاں جارہی ہیں۔
میں - کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟
ملک الموت - جی نہیں۔
میں - کیوں۔
ملک الموت - ان کا یہ رتبہ نہیں۔
میں - تو آپ مجھے وہاں لیجائیں۔ میرے معزز میزبان خدا کے لئے میرے حال پر رحم کرو۔ مجھے اس اپنی ملکہ سے مل لینے دو۔
نگران فرشتہ - پھر آپ نے وہی بے صبری کی بات کی۔
میں - (روکر) معاف کیجئے۔ للہ معاف کیجئے مگر یہ کہاں کا دستور ہے کہ میاں مہمان اور بیوی الگ تھلگ۔ ختم المرسلین کی خاطر انہیں اپنا مہمان بنائیے۔
نگران فرشتہ - اے ضدی ذی روح۔ کاش کہ یہ تمہاری ضد نیک کاموں میں صرف ہوتی۔
میں - اس سے زیادہ کیا نیک کام ہو سکتا ہے کہ میں اپنی رفیق زندگی کو دلی پیار سے دیکھنا چاہوں؟
نگران فرشتہ - سچ کہتے ہو اور یہی جذبہ اُس ازلی نور کا جزو تمہیں ملا ہے جو تمہارے میں سے نیک اور صابر لوگوں کو فرشتوں سے بھی بالاتر رتبہ دیتا ہے۔
میں - جزاک اللہ۔
زہرہ۔ میری زہرہ۔ میرے دل۔ خان کی مالک زہرہ۔ میری ہر نیکی کی محرک زہرہ۔ ہر پاک خواہش کی موید زہرہ آئی۔ مسکرائی۔ اس کے پاؤں میں نے چومے۔ نئے انداز سے کہنے لگی۔ "پیارے صبر کروگے تو جلد ملیں گے"

پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں زہرہ چلی گئی۔

نگران فرشتہ۔ آیئے آپ کو دوزخ کی سیر کرا دوں۔

میں۔ جی حاضر۔

نگران فرشتہ۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کیوں ایسی ہولناک جگہ کی سیر کرنا چاہتے ہیں؟

میں۔ جی صرف اس لئے چونکہ مجھے دنیا میں واپس جانا ہے میں دوست دشمن سب کو آگاہ کروں ان کے دلوں میں نور ایمان کے شعلے بھڑکاؤں۔ سچے دل سے ان کی خدمت کروں۔ منت سے محبت سے۔ آنسوؤں سے انہیں یقین دلاؤں کہ خدا کی رحمت بے پایاں ہے مگر اس کے رحم کو۔ انصاف کو۔ بخشش کو بہت نہ آزماؤ۔ بچو بچو۔

الھٰکم التکاثر حتی زرتم المقابر

نگران فرشتہ۔ شوقِ خدمت بھی اسی نور کا ایک جزو ہے جو انسان کو باقی ذی الارواح سے ممتاز کرتا ہے۔ مگر تم چاہے کچھ کرو دنیا میں کوئی بھی تمہاری بات کا اعتبار نہیں کریگا۔ سب تم پر ہنسیں گے۔ اس بات پر یقین رکھو۔

میں۔ کوشش کرنا میرا فرض ہے اور میں ضرور کوشش کرونگا۔

نگران فرشتہ۔ شاباش۔ تمہارے ملک میں صبر کے معنے غلط مشہور ہیں۔ صبر کے صحیح معنے استقلال کے ہیں اور اسی معنے میں وہ آیۂ رحمت ہے۔

"ان اللہ مع الصابرین"

تکلیف کا برداشت کرنا صبر نہیں۔ باوجود ظاہری تکلیف کے نیک کام میں مستعدی سے لگے رہنا اور نہ ٹلنا اصل صبر ہے۔ خدا تمہیں اصلی صبر کی توفیق دے۔

ہم ابھی دوزخ کے صرف چند قطعات میں پھرے تھے کہ پھر بجلی کی چمک ہوئی۔ کڑکڑاہٹ سے ایک پنجہ ہماری جانب لپکا اور ہم دونوں کو اُٹھا کر پھر اس نگران فرشتہ کے گھر میں چھوڑ گیا اور جاتے جاتے ایک فرمان نگران فرشتہ کو دے گیا۔ انہوں نے مجھے اس کا مطلب یوں بیان کیا۔

نگران فرشتہ۔ اے میرے عزیز مہمان۔ حکم ربی ہے کہ میں تجھے زیادہ مہمان نہ رکھوں۔ تو نے ایک بہشتن کے پاؤں چومے ہیں اس لئے دوزخ کی آگ تجھ پر حرام کی گئی ہے مگر گذشتہ گناہوں کی

ہوں مرنے والے کے دم واپسیں کی نگاہیں کلیجہ چھلنی کئے ڈالتی ہیں۔ مگر میں کمبخت قسائی انسانی گلو پر نہیں اپنے گلو پر آرہ کشی کرتا جاتا ہوں۔

شام کو ہر روز میرے بہ گلو بُریدہ مقتول مجھے اکٹھے ملتے ہیں۔ ایک کچہری سی ہوتی ہے۔ سب کے سب عجب دردناک طریقے سے میری طرف اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

یہ ہے ہمارا قاتل

ہائے وہ میری مجرمیت۔ اس پر عدالت کا سوال "کیوں؟" ستم۔ اے دوستو! اے پبلک! اے آنے والی بنی نوع انسان کی نسلو! بتاؤ اُس 'کیوں' کا کیا جواب دوں۔ تمہارے لئے یہ قصہ سہی۔ مگر میں تو روز صبح کو یہ ڈراما اور شام کو یہ مقدمہ دیکھتا ہوں میرے لئے تو قصہ نہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

زندہ دوزخی

شاعر کا فرض۔ وہ شاعر جو دنیا کو رفیع بنانے کی کوشش نہیں کرتا شاعر نہیں۔

"شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا" درست لیکن خام پیدا ہوتا ہے۔

قوم اور ادب۔ دنیا کی کوئی قوم ادب کے بغیر ترقی نہیں کرسکتی۔

زبانیں اور جنگ۔ دنیا کی تمام زبانیں مصروفِ پیکار ہیں اور رہیں گی۔

اڈیٹر کو بہت وعدے نہیں کرنے چاہئیں۔

اڈیٹر سے بہت توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔

خالد۔

ٹیلیفون اور ہمزاد

ہمزاد کی نسبت سُنا کرتے تھے کہ جب وہ کسی کا تابعدار ہو جاتا ہے تو رات کو سونے نہیں دیتا ہر وقت باتیں کرتا رہتا ہے اس کا علاج یہ ہوتا تھا کہ اس کو درخت کے پتے شمار کرنے کا حکم دیدیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اس مشکل کام میں مشغول رہے اور عامل ہمزاد کچھ دیر آرام کر سکے۔ مگر نئے زمانہ کے ہمزاد یعنے ٹیلیفون میں یہ بات نہیں ہے وہ کسی وقت بھی چین نہیں دیتا۔ اور اس کے چپ کرنے کی کوئی ترکیب ایجاد نہیں ہُوئی۔

ہمزاد کالی صورت کا ایک چھوٹا سا بھُتنا ہوتا ہے اور عامل کی پیٹھ کی طرف کھڑا ہو کر کان میں باتیں کرتا ہے۔ ٹیلیفون میں بھی وہی اوصاف ہیں۔ چھوٹا قد۔ کالی صورت کان میں گنگنانا۔ اور ہمزاد کی طرح کبھی صاف بولنا کبھی باتوں کو چبا جانا۔

ہمزاد ہندوستانی بھُوت ہے۔ ٹیلیفون ولایتی بھوت ہے۔ ہمزاد تابع کرنے میں صرف وقت خرچ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں وقت بہت ارزاں چیز ہے۔ ٹیلیفون روپے کے زور سے تابع ہوتا ہے کہ ولایت میں روپیہ بہت ضروری چیز ہے۔ ہمزاد اپنے عامل کو لوگوں کی نظروں میں مرغوب بنا دیتا ہے کیونکہ صدہا آدمی عامل ہمزاد کے پاس آتے ہیں اور اس سے خبریں دریافت کرتے ہیں پوشیدہ چیزیں منگاتے ہیں۔ وہ عامل سے ڈرتے ہیں۔ اور اس کی عزت بھی کرتے ہیں اور بعض لوگ نذر نیاز بھی دیتے ہیں۔ ٹیلیفون بھی اپنے مالک کی ضرورت کو لوگوں کی نظروں میں بڑھا دیتا ہے۔ جن کے ہاں ٹیلیفون نہ ہو وہ مالک ٹیلیفون کے پاس عاجزانہ خوشامدیں کرتے ہُوئے آتے ہیں اور ٹیلیفون میں دو باتیں کر لینے کی اجازت مانگتے ہیں اور مالک صاحب انداز غرور و تمکنت سے اجازت کی گردن ہلاتے ہیں۔

ہمزاد و ٹیلیفون میں ہندوستان و یورپ کی مکمل تہذیب موجود ہے ہمزاد صرف اپنے عامل کو نظر آتا ہے۔ اپنے عامل سے بات کرتا ہے اور اس کے سوا کسی غیر سے مخاطب نہیں ہوتا اور ٹیلیفون یورپین عورتوں کی طرح ہر شخص سے بات کرنے میں آزاد ہے اور پوشیدہ رہنے کی عادت ان میں نہیں ہے۔ ہمزاد کبھی نقدی نہیں مانگتا۔ ٹیلیفون سال کے سال اپنا ٹیکس لینے آن کھڑا ہوتا ہے۔

ہمزاد میں ایسا کوئی پرزہ نہیں ہوتا جسکے خراب ہونے سے سارا ہمزاد بیکار ہوجائے ٹیلیفون میں یورپ کی یہ خصوصیت پوری طرح موجود ہے۔ یورپ کی ہر چیز کا قاعدہ ہے کہ اسکے وجود میں دو چار۔ دس پانچ۔ سو پچاس۔ ایسے ٹکڑے جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اگران میں کا ایک بھی بگڑ جائے تو باقی کے سب اچھے بچھے پرزے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیکار بیٹھ جاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ جناب جب تک ہمارے بھائی کو منانے کے لئے کچھ خرچ نہ کرو گے ہم سب کام نہ کرینگے۔ کہو بھائی تمہیں پرائی بات سے کیا سروکار تم اپنا کام کئے جاؤ تو جواب ملتا ہے کہ ہم میں کا ہر پرزہ ایک خاص کارخانہ میں تیار ہوتا ہے اور ہمارے ملک والوں نے جان بوجھ کر یہ حکمت رکھی ہے کہ خریدار ہر کارخانہ کا محتاج رہے۔ یہ نہ ہو تو سب لوگوں کا کام مساوی حیثیت میں نہ چل سکے۔

ہمزاد کی تکلیف شخصی ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنے عامل کو ستاتا ہے اور جگاتا ہے۔ ٹیلیفون جمہوری ملک کا ہے اس کی تکلیف بھی جمہوری ہے۔ تمام گھر والوں کو اسکی ذات سے اذیت ہے۔ گھڑی گھڑی گھنٹیاں بجاتا ہے جاکر پوچھو کیا کہتے ہو۔ جواب دیتا ہے آپ کہاں سے بولتے ہیں غصہ آتا ہے کہ کیا بے تمیزی کا سوال ہے سب لوگ مُنہ سے بولا کرتے ہیں۔ پھر یہ پوچھنے کی کیا بات ہے۔ یوں کہنا چاہیئے تھا کہ آپ کون صاحب ہیں اور کس مقام پر ہیں؟

یہی ایک تکلیف نہیں ہے ٹیلیفون میں ہزار قسم کی تکلیفیں ہیں۔ اول تو نمبر ملانے والے ستاتے ہیں کبھی جلدی نمبر ملا دیتے ہیں کبھی اتنی دیر لگاتے ہیں کہ کن بات (رسیور) کو کان سے لگائے جمائیاں لیتے رہو اور ہو ہو پکارے جاؤ وہاں سے نمبر پلیز کا جواب نہیں آتا۔ اور آتا ہے تو ایسا جیسا کوئی لحاف اوڑھے لیٹا ہے اور غنودگی میں بولتا ہے۔ کبھی فوراً کہدیا جاتا ہے انگیج (مشغول) ہے۔ دوسری جگہ (رکا ہُوا) ہے۔ حالانکہ اس میں صحت نہیں ہوتی۔ اور نمبر ملانے کی محنت سے بچنے کے لئے کہدیا جاتا ہے۔ کبھی ایسے لوگ ٹیلیفون میں بات کرنی چاہتے ہیں جنکو کبھی اس ولایتی بھوت کے ذریعہ بات کرنیکا اتفاق نہیں ہُوا۔ انکی ادھوری باتیں اور گھبراہٹ انسان کو تکلیف دیتی ہے۔ کبھی شریر لوگ اپنے دل کے بخار ٹیلیفون کے ذریعہ نکالتے ہیں اور جو جی چاہتا ہے بکتے ہیں اور کوئی گرفت انکی نہیں ہوسکتی کیونکہ ولایتی بھوت کے عجائبات میں ایک یہ بات بھی ہے کہ اسکو ناجائز استعمال کرنے کی آزادی بھی ہوتی ہے۔

الغرض ہمزاد اور ٹیلیفون میں وہی فرق ہے جو آسمان اور زمین میں ہے۔ جو کالے اور گورے میں ہے جو جاہل اور عالم میں ہے۔ اور ان دونوں کے حاصل کرنے میں تکلیف اور راحت برابر کی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ مگر ٹیلیفون میں راحت کم ہے اور تکلیف زیادہ ہے۔ جنکو یہ نعمت میسر نہیں ہے

وہ شاید عمل ہمزاد کے مشتاقوں کی طرح اس بات کو نہ مانیں مگر میں نے تو اس نعمت یورپ کو اچھی طرح آزما کر لکھا ہے کہ میرا ہمزاد اس ٹیلیفون کی بلا سے لاکھ درجہ اچھا تھا۔ اگرچہ تھا تو وہ بھی بلائے بے درماں مگر نہ ایسا کہ نہ رات چین ہے نہ دن چین ہے۔ جب ذرا خیال جما کر کوئی کام شروع کیا اور ٹیلیفون نے گھنٹی بجا کر اس میں رخنہ ڈالا۔

ہندوستان میں آکر ولایت کی ہر چیز ایک فیشن اور آزاد بندہ بن جاتی ہے ٹیلیفون بہت کام کی چیز تھی۔ گھر بیٹھے میلوں اور کوسوں کی بات کان میں آجاتی تھی۔ مگر ہندوستان میں کاروبار کی آسانی کے لئے اسکو استعمال نہیں کیا جاتا یہاں تو یہ کام رہ گیا ہے۔ ٹن ٹن ٹن۔ کون صاحب ہیں؟ میں ہوں صاحب داد خاں۔ کیا ارشاد ہے؟ جی کچھ نہیں بس یہ معلوم کرنا تھا کہ آپ کے ہاں میری آواز جاتی ہے یا نہیں۔ آداب عرض ہے۔ جاتا ہوں۔

حسن نظامی

متوالے

او آہن پوش طعن نیوش متوالو! تم جہاں جا رہے ہو وہاں رکھا کیا ہے؟ تمہیں خبر نہیں تم معذور ہو!

با خبر اُستاد کے ضدی سبق خوانو! جب معنے تمہیں نہیں آتے تو دو سطر سبق نوک زبان ہونے سے کیا وجد ہوگا۔ کاش کاش کہ مطلب بھی سمجھو اور سمجھاؤ!

زندان وہ ہے جہاں سے تم جاتے ہو! جہاں رسم کہتی ہے کہ بھائی کو بھائی نہ چھوئے! جہاں تن آسانی سکھلاتی ہے کہ یہ سہل ہے کہ غیر کا بار خویشوں میں حصہ رسدی تقسیم ہو مگر یہ مشکل کہ غیر کو لیاقت کے جادو سے ایسا تسخیر کرو کہ تم سے بارکشی کرانیکا خیال تک بھلاوے۔

جسے تم ہندی خانہ سمجھے ہو وہ مکتب ہے اور درس صرف یہ کہ پرائے کو اپنا بناؤ یہانتک کہ نہ کوئی زور مست رہے نہ زر مست۔ اتنا سمجھ جاؤ تو کہیں جانیکی ضرورت نہیں۔ اتنا سمجھا نہ سکو تو بھولے وفا شعار دلوں کی آبادیوں میں جفا کے ہل چل جائینگے۔ رُکو سنبھلو او متوالو! یہ مستانہ شیوہ کب تک؟ بس یہی نا کہ چند قدم لڑکھڑاؤ گے اور پھر ہانکے جاؤ گے!!

اس صنم خانہ کے پرستار اب شیوہ مردانگی کے طلبگار ہیں۔ وہ مردانگی جس پر حریف عش عش کرے۔ جو آنے والی نسلوں کے لئے نمونہ اور ہمارے لئے آئین ہو۔ جو سیکھے سکھائے سنے سُنائے نہیں بلکہ دل سے پیدا ہو اور نگاہ سے یوں ٹپکے کہ زبان و بازو کے استعمال کی ضرورت نہ ہو۔

او متوالو! جہاں چلن کی ضرورت ہو وہاں چال کو کوئی کیا کرے۔

عبدالعزیز

لغات الجاہلین

ڈاکٹر۔ ہمدرد ہو تو مسیحائے زمان مردہ کو زندہ کرنے والا۔ ورنہ عام طور پر بے درد انسان زندہ کو مردہ کرنے والا۔ قبرستان کی آبادی میں ہر سال معتد بہ اضافہ کرنے پر مصر۔ اپنی فیس پوری وصول کرنے پر بضد گو اس کو یقین ہو کہ اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی مریض کا دم بھی ساتھ ہی نکل جاویگا۔ عمل جراحی سے کسی کو لنگڑا کسی کو لولا کسی کو لنجا کر دینے والا۔ جس کے قلم کے ایک کش سے ضرب خفیف شدید میں تبدیل ہو جاتی ہے قتل عمد اتفاقیہ موت یا تلی پھٹ جانے یا دل کی حرکت بند ہو جانے کے باعث موت میں بدل جاتا ہے جو کسی مرض کا نام سنتے ہی نسخہ تجویز کر دیتا ہے۔ خواہ مریض کا مزاج سوداوی ہو یا بلغمی یا صفراوی یا کیا۔ جو معقول فیس ملنے پر ملازموں کو سالہا سال کی بیماری کی رخصت دلا دیتا ہے۔ مگر کم فیس ملنے پر حقیقی بیمار کو ادائیگی فرایض کے قابل فرما دیتا ہے۔ وہ مستند شخص جو کسی ہسپتال میں چھ ماہ تک بیمار رہا ہو۔ یا تین ماہ تک کمپوڈری کا کام سیکھتا رہا ہو۔ وہ شخص جو انگریزی ادویات کے اردو میں لکھے ہوئے ناموں کو خاص لب و لہجہ کے ساتھ جھند کرتا ہو۔

دیسی حکیم وہ شخص جو نیلوفر بنفشہ صندل بزوری دینار وغیرہ کے شربت ایک ہی بوتل سے بیچتا ہے گو وہ جانتا ہے کہ اس میں سوائے خالص چینی کے اور کوئی چیز نہیں۔ ص۔ د۔ ق

شاعر۔ کسی کام کے بغیر مصروف رہنے کے فن میں مشاق۔ بیکار مباش کچھ کیا کر، کا مصداق۔ شہر کے اندیشے میں دبلا ہونیوالا قاضی۔ حال فراموش، سوگوار ماضی۔ بغیر فیس لئے لیلیٰ و مجنوں کا وکیل۔ دل اور دماغ کی بے تعلقی کی دلیل۔ خیال کے جال میں جذبات کو پکڑنے والا شکاری۔ اظہار سے معمور، احساس سے عاری۔ کل کائنات کا خواہ مخواہ راز دار۔ کسی بیماری کے بغیر بیمار الغرض ایک خدائی فوجدار۔

آوارہ و مجنوں نے برسوا سر بازارے (ا۔ ش)

محفلِ ادب

عثمانیہ یونیورسٹی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق فرماتے ہیں:۔

دُنیائے علم و تعلیم کے ہر فرد نے شاید عثمانیہ یونیورسٹی کا نام سُنا ہوگا۔ لیکن اکثر اشخاص کے لئے یہ صرف ایک لفظ ہی ہے۔ حالانکہ وہ ہندوستان کی یونیورسٹی تعلیم میں ایک انقلاب پیدا کر رہی ہے اس کا نام ہمارے سامنے بغداد۔ قرطبہ۔ یا قاہرہ کے خوابہائے پریشاں کا نقشہ پیش کرتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ ہندوستان کی ایک ریاست کا علمی مرکز ہے یہ نوزائیدہ یونیورسٹی ہز اگز لیٹڈ ہائینس نظام کی مربیانہ توجہ سے عالم وجود میں آئی ہے اور اس روشن خیال والی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ شاید نہایت ہی انسب ہُوا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست نے اس کام کی طرف سب سے پہلے قدم بڑھایا ہے جو ہندوستان میں یونیورسٹی تعلیم کے انقلاب عظیم کی خبر دیتا ہے۔ اکثر ہم یہ دیکھ کر محو حیرت ہو جاتے ہیں۔ کہ ہندوستانی ریاستیں جو عموماً برطانوی ہند کے مقابل میں بہت ہی پسماندہ اور جامد سمجھی جاتی ہیں۔ اور علانیہ "زیر حمایت" کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ تعلیم و معاشرت کے میدان اصلاح میں سب سے پہلے بہادرانہ قدم رکھتی ہیں۔

تعلیم یافتہ اور سیاست ریاست حیدر آباد نے جو وفاداری، شان و شوکت اور عزت و عظمت کی قدیم روایات پر اب تک قایم ہے۔ ایک نہایت ہی عظیم و اہم تجربہ کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ ٹھیک اس وقت جبکہ تمام ہندوستان اس موضوع پر کہ تعلیم کے مختلف مدارج میں کونسی زبان رکھی جائے سرگرم مباحثہ ہے۔ اس حوصلہ مند ریاست نے بُرا یا بھلا جیسا بھی ہو۔ ایک فیصلہ کن قدم آگے بڑھا دیا ہے۔ اور اس بات پر فخر کر سکتی ہے۔ کہ یہ عزت اسی کے حصہ میں آئی ہے۔ کہ دیسی زبانوں کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم دینے کی وہ اولین رہنما ہے۔ یہ اس جامعہ کی خصوصیت ہے۔ صرف زمانہ اس کے نتیجہ کا فیصلہ کریگا۔ (معارف)

کیا مانی مصوّر تھا؟ ابوریحان بیرونی، تحقیق الہند میں خود مانی کی تصنیف شاہ برقان کے حوالہ

سے لکھتا ہے۔ کہ "وہ ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں بمقام ہمدان پیدا ہوا۔ اس کا باپ، جس کا نام پاتک تھا (عرب مورخین جسے فتق کہتے ہیں) ہمدان کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ مانی کی ماں کا نام مار مریم یا اُتا جنم تھا، جو ایران کے قدیم شاہی خاندان اشغانی سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مشرق میں زردشتی مذہب اور مغرب میں مسیحی مذہب اپنے عروج پر تھے۔ اس کا باپ چونکہ خود بھی بعد کو مسیح معتکہ (Baptizants) طبقہ میں شامل ہو گیا تھا، اس لئے ظاہر ہے۔ کہ مانی کی ابتدائی تعلیم، جو اس کے باپ ہی کے پاس ہوئی مسیحی معتقدات کے زیر اثر ہوئی ہو گی۔ لیکن خود مانی کا بیان یہ ہے۔ کہ میں ابھی جنین ہی میں تھا کہ توم فرشتہ میری ماں کو حالت حمل میں نظر آتا اور ظاہر کرتا۔ کہ تیرے بطن سے ایک پیغمبر پیدا ہونے والا ہے۔ جب میری عمر بارہ سال کی ہوئی تو مجھ پر الہامی کیفیت طاری ہونے لگی اور چوبیس سال کی عمر تھی کہ میں نے تبلیغ حق و صداقت شروع کر دی"

اس وقت شاپور ایران کا حکمران تھا۔ اس لئے مانی نے سب سے پہلے اسی کو مخاطب بنانا مناسب سمجھا۔ شاپور کا بھائی پیروز اس سے قبل اس کا معتقد ہو گیا تھا، اس لئے مانی اسی کے ذریعہ سے شاپور کے دربار تک پہنچا اور وہاں اپنے تئیں پیغمبر ظاہر کر کے اپنی تعلیمات پیش کیں۔

یعقوبی کا بیان ہے۔ کہ جب مانی ابن حمار شاہ پور کے دربار میں آیا۔ تو اس نے زردشتی مذہب کی برائیاں بیان کر کے کہا " کہ نظام کائنات دو قوتوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایک کا قبضہ تاریکی پر ہے۔ جس سے تمام معاصی پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسری قوت روشنی کی مالک ہے جس سے تمام نیکیاں رونما ہوئی ہیں" شاپور نے اس کے اصول تسلیم کر لئے اور اپنی رعایا کو مجبور کیا کہ وہ مانوی مذہب اختیار کر لیں اب چونکہ فرمانروائے وقت نے اس کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے اس نے نہایت اہتمام سے اپنے معتقدات کی تبلیغ شروع کی اور اسی سلسلہ میں اس نے سات (۷) کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں سے چھ شامی زبان میں تھیں اور ایک شاہترمان، قدیم پہلوی زبان میں۔ (نگار)

قصہ نویسی۔ شاید یہ انسانی فطرت میں داخل ہے۔ کہ اپنی پسند اور نفس کی رہنمائی کا ہمیشہ اتباع کیا جاتا ہے اس لئے بعض افعال کی کثرت ضرب المثل اور داخل عادت سمجھی جاتی ہے میری نظر سے جہاں تک تذکرے گزرے اُن سب کا خلاصہ نقائص بھی طوالت کا سبب ہو گا۔ گرمشتے نمونہ از خروارے

کچھ امور قابل ذکر ضرور ہیں۔ بالعموم تذکرہ نویسوں میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ کہ جس شخص پر زیادہ توجہ ہوئی اس کی تعریف کے انبار لگا دیئے۔ یہ کوئی ضروری بات نہیں۔ کہ اس سے اُنکو فی نفسہ کوئی وابستگی ہو۔ بلکہ فطرتاً ان کا دقار اُن کے دل پر مرتکز ہے۔ یا کلام زیادہ پسندیدہ ہے۔ حالانکہ اہل تذکرہ کو لازم ہے کہ شاعر کا اصل حال بغیر کسی رو رعایت کے تحریر کریں۔ عداوت کا اظہار تذکرہ نویسی میں کسی طرح زیبا نہیں اول سے آخر تک نیک نیتی ثابت ہونا چاہیئے۔ انصاف کا ہر جگہ لحاظ ازبس ضروری ہے۔ سب سے بڑا سقم انتخاب کلام کی وجہ سے نمایاں ہوجاتا ہے۔ اس میں یا تو یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر انتخاب اچھا ہُوا تو اُمیدوں کا خون ہوگیا۔ اس لئے زیادہ مناسب صورت یہ ہے۔ کہ بقدر گنجایش پوری پوری غزلیں نقل کردی جائیں۔ تاکہ ناظرین شاعر کی استعداد کا خود اندازہ کرلیں۔ اور فن شعر کی دستگاہ اور رتبہ سے کماحقہ ماہر ہوجائیں۔ مگر افسوس ہے۔ کہ تذکرہ نویس ایسا نہیں کرتے۔ یا تو شاعر کو فلک الافلاک پر پہنچا دیتے ہیں۔ یا قعر مذلت میں گرا دیتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ بے رحمی وہ فرو گذاشت ہے۔ جبکہ بعض قابل ذکر شعرا سے چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے۔

(اعجاز)

آوازِ قبر۔

گویا ہے زبانِ بے زبانی　　　عبرت یہ دکھا رہی ہے اعجاز
سُن لے اے راہ گیر سُن لے　　　اک قبر سے آرہی ہے آواز
اس گوشۂ تنگ کی رہے فکر　　　آراستہ جب ہو محفلِ ناز
یہ عالمِ بیکسی نہ بھولے　　　جب جمع ہوں دوستانِ ہمراز
یہ کنجِ خموشی بھی رہے یاد　　　جب آئے صدائے نغمۂ ساز
یہ نقشِ فنا مٹے نہ دل سے　　　آغوش میں جب ہو یارِ دمساز
یہ خوابِ عدم نہ ہو فراموش　　　جب دورِ شراب کا ہو آغاز

(تاجور)　　　(دین و دنیا)

مختصر قصوں سے یہ مقصود نہیں کہ پڑھنے والوں کو سبق حاصل ہو اور کوئی نصیحت ملے۔ بلکہ اُن کا مدعا محض دلچسپی اور دل بہلاوا ہے۔ کامیاب قصہ صرف وہ ہے۔ جسکو پڑھ کر ایسا معلوم ہو۔

گویا حقیقت کی تصویر الفاظ میں کھینچ دی گئی ہے۔ قصہ نویس کو اُپدیشک نہیں بلکہ مصور ہونا چاہیئے۔ جو جیسا نظارہ لیتا ہے۔ اُسے ایمانداری سے ادا کر دیتا ہے۔ بابو رابندر ناتھ ٹیگور سے دریافت کیا گیا۔ آپ مختصر قصے کیوں لکھتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا۔ کیونکہ میرے دل میں خیالات اُٹھتے ہیں۔ اور میں انہیں دُنیا کے سامنے پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جنہیں نصیحتوں اور اُپدیشوں کی ضرورت ہو۔ اُن کے لئے قصّوں کی کتابیں پڑھنا پانی بلونے کے مترادف ہے ـــــ قصہ نویسی آرٹ ہے اسے آرٹ کی نگاہ سے ہی دیکھنا چاہیئے *

(دُروپم - بنگالی)

لٹریچر میں ناٹک کو درجہ امتیاز حاصل ہے۔ اس سے کسی قوم و ملک کی تہذیب کا سراغ مل سکتا ہے ناٹک قوم کی زندگی کی تصویر ہے۔ ناٹک قوم کے اندرونی جذبات کا کھلا ہُوا بیان ہے، اُس کے ماضی کی پُر شکوہ داستان ہے۔ مگر ناٹک تاریخ نہیں ہے۔ تاریخ اور ناٹک کے مابین ایک امتیازی دیوار حایل ہے۔ تاریخ کسی قوم کی مردہ تصویر ہے۔ ناٹک اُس کی زندہ کہانی ہے۔ تاریخ میں پُرانے واقعات کو عہد ماضی کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ ناٹک میں اُنہی واقعات کو زندہ کر کے دورِ حاضرہ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخ "تھا، تھی اور تھے" کا مجموعہ ہے۔ ناٹک "ہے اور ہیں" کا فسانہ ہے۔ تاریخ پڑھ کر طبیعت فسردہ ہو جاتی ہے، ناٹک دیکھ کر رگوں میں خون اُبلنے لگ جاتا ہے۔ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی، تا وقتیکہ وہ ناٹک کی ماہیت اور اہمیت کو کامل طور پر محسوس نہ کرے *

(سدرشن)

(سُودیھ - ہندی)

حاجب ابن زرارہ (ایک عرب نژاد) کسریٰ سے ملنے کی آرزو لے کر اس کے شاہی محل تک پہنچا اور دربان کے دریافت کرنے پر کہا کہ میں ملک عرب کا ایک باشندہ ہوں۔ کسریٰ نے اندر بلا لیا اور دریافت کیا کہ "تم کون ہو؟" اس نے جواب دیا کہ "سید العرب"، کسریٰ نے کہا تم نے دربان سے تو کہا ہے کہ میں اہل عرب میں سے ایک عام آدمی ہوں حاجب ابن زرارہ نے جواب دیا کہ ہاں، میں کسریٰ سے ملنے سے پہلے عرب کا ایک عام باشندہ تھا لیکن کسریٰ کے شرف حضوری حاصل کرنے کے بعد اب میں "سید العرب" ہوں۔ کسریٰ نے اس جواب پر اظہار تحسین کیا اور حکم دیا کہ اس شخص کا مُنہ موتیوں سے بھرا جائے۔

(رتا جوہر)

الہلال (مصر)

کچھ عرصہ گذرا، سربلند پہاڑ کے ایک تاریک غار میں ایک آدمی رہتا تھا وہ جوگی تھا
دُنیا اُس کے لئے موجب کشش نہ تھی۔ اُس کی راتیں حُسن وعشق کے خیالوں اور اُس کے خواب زندگی کی مسرتوں سے محروم تھے۔
اُس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ عبادت کے لئے وقف ہو چکا تھا وہ جوگی تھا

ایک دن اُس پہاڑ پر ایک عورت چڑھی۔
اُس کی آنکھیں مستِ شباب نہ تھیں، اُسکے بال حسین نہ تھے۔ اُس کے ہونٹوں پر خوبصورتی نہیں کھیلتی تھی۔ مگر عورت تھی وہ پہاڑ پر چڑھی

اب وہاں ایک مرد رہتا ہے۔
اُس کے ساتھ ایک عورت رہتی ہے۔
وہاں جوگی نہیں رہا۔ (سمارٹ سٹ)

عورت کا دل بچےّ کی جیب ہے۔ جس میں وہ جو کچھ ملتا ہے پرشوق ہاتھوں سے ڈال لیتا ہے — ٹوٹا ہوا تاگا، مُرجھایا ہوا پھول کھوٹا سکاّ، پتھر کا ٹکڑا۔ چاقو کا دستہ۔ یہ سب اشیا ناکارہ ہیں۔ انکو سمجھدار دُنیا نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور حقارت کی ٹھوکر لگاکر راستے سے پرے ہٹا دیتی ہے مگر چھوٹے بچےّ کے لئے یہ عجائبات دُنیا سے بھی قیمتی ہیں۔ وہ اُن پر اپنی جان عزیز چھڑکتا ہے۔
عورت کا دل بھی بچےّ کی جیب ہے جس میں اُسے جو کچھ ملتا ہے۔ پُرشوق ہاتھوں سے ڈال لیتی ہے۔ نفرت کے دو لفظ، محبت کا ایک کلمہ، لاپروائی کا قہقہہ، شوق بھری آوارہ نگاہیں، جعلی سرد آہیں، یہ سب اشیاء ناکارہ ہیں۔ سمجھدار (مردوں کی) دنیا ان کو دیکھ کر چونک اُٹھتی ہے۔ مگر عورت کے لئے یہ بیش قیمت خزانہ ہے۔ وہ اُسے مردوں سے چھپاکر رکھتی ہے۔ (سدرشن) نیو میگزین

بربریت کیا ہے؟ بربریت انفرادیت ہے! تہذیب محض ضمیر کی اشتراکیت ہے۔

سلطنت فقط اُس عام عارضہ کی اک دوسری شکل ہے جو انانیت کہلاتا ہے۔ اور سیاسیات میں اس کا عمل ویسے ہی نتائج پیدا کرتا ہے جیسا کہ فردِ واحد میں + غاروں میں رہنے والا وحشی آدمی بھی اک ضمیر رکھتا تھا بعینہ جیسے ہم رکھتے ہیں۔ زیادہ فرق یہ تھا کہ اُس کا ضمیر اُسی سے واسطہ رکھتا تھا + حفاظتِ نفس قدرت کا پہلا قانون ہے اور انسان اُس زمانے میں اسی قانون کے احاطہ کے اندر محصور تھا۔ اُسکے اپنے حقوق و جذبات اُس کی اپنی خواہشات و خیالات یہی چیزیں اُسے بھلی معلوم ہوتی تھیں اور انہیں کی وہ نگہداشت کرتا تھا +

جب اُس نے ایک رفیق زندگی بنایا اور اُسکے بال بچے بڑھے تو اُسکا ضمیر زیادہ وسیع ہوا اور اُسکے نئے تعلقات اُسکی شخصیت کا جزو بنگئے۔ اُس نے اپنی زوجہ اور بال بچوں کی محافظت ایسی ہی وفاداری سے کی جیسی کہ اپنی +

بعد کو رفتہ رفتہ اُسکے بچوں نے آپس میں شادیاں کیں اور وہ ایک قبیلہ کا جزو بن گیا۔ وہ اور زیادہ وسیع ہوگیا اُس کا ضمیر قبیلہ کا ضمیر ہوگیا +

وسعت کا عمل جاری رہا۔ قبیلہ ایک ریاست یا اک چھوٹی سی دولت بن گیا +

پھر یہ چھوٹے چھوٹے گروہ متحد ہو کر ایک بڑا گروہ بن گئے جس کا نام قوم رکھا گیا +

اُس کا انفرادی ضمیر اب بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا جسے حبِ قومی کہتے ہیں +

لیکن قوم و ملک کی محبت تہذیب کی انتہا نہیں یہ تو ترقی کی شاہراہ پر فقط اک عارضی قیامگاہ ہے اور صحیح منتہائے کمال انسانیت ہے +

انسان کا ضمیر مہذب نہیں کہلا سکتا جب تک وہ قومیت سے اک زیادہ وسیع جذبے سے متاثر نہ ہو۔ کیونکہ ضمیر کی حقیقی اور دائمی بنیاد نوعِ انسان پر ہے +

جس قدر ہم ملک ملک کے تمام لوگوں کے لئے احساس خدمت محسوس کریں ہم مہذب ہیں اور جس قدر ہم میں یہ قوتِ بصیرت کم ہو ہم ناشائستہ و غیر متمدن ہیں +

سینڈرن اپنی تصنیف "سخنِ جبش" میں لکھتا ہے کہ ربِ خالق نے انسانوں کو تعلیم دی کہ قبیلے کے دائرے میں چوری کرنا گناہ ہے +

اسی بنا پر اُس نوع کی قومیت جو یہ سکھاتی ہے کہ ہمیں صرف اپنے ہم ملکوں سے وفاداری اور انصاف برتنا چاہیئے۔ نیم وحشی ہے!

وہ عظیم الشان منتہائے کمال جسکی طرف دُنیا سرگرم سفر ہے جسکی طرف واقعات ہمیں کشاں کشاں لئے جارہے ہیں اور جسکی طرف دُنیا کے بہترین خیالات یکسوئی کے ساتھ جھکتے جاتے ہیں نوعِ انسان کا اتحاد ہے اور اُن تمام انسانی عدل و حق رسانی کے اوصاف کا دوسری قوموں کے ساتھ روا رکھنا جن کا ہم اپنے ہم قوموں کے ساتھ برتنا لازم جانتے ہیں!

(ڈکرنٹ اوپی نین) (د ل)

حصۂ نظم

کلامِ اکبر

آپ سُن لیجئے معنی ہیں کچھ اس بات کے بھی — گردشِ چرخ میں موسم ہیں خیالات کے بھی
فلسفا بھی کبھی موسم میں بدل جاتا ہے — اور ہی سانچے میں دلِ خلق کا ڈھل جاتا ہے
لاکھ سمجھاتا ہوں اسکو میز پر آ چائے پی — یہ عروسِ ہند اب تک کہہ رہی ہے ہائے پی

رباعیاتِ گرامی

اے روح بجسمِ زار نالی تا چند — دربندِ قفس شکستہ بالی تا چند
پر برزن و بر فرازِ سدرہ بنشیں — در مرکزِ فتنہ خاکمالی تا چند

برخیز کہ عارفان بخود سیر کنند — در پردہ نظر بکعبہ و دیر کنند
خود را دیدند غیر از خود رفتند — خود غیرِ خود ند قطع از غیر کنند

گو یائے رباعیم بخود غیرم من — دانائے رموزِ آسمان سیرم من
از بندۂ خیر شر نیاید بوجود — از حلقہ بگوشانِ ابوالخیرم من

آصف الدولہ کا امام باڑہ

(لکھنؤ)

آصف الدولۂ مرحوم کی تعمیرِ کہن — خاک پر عرش کو دیتی ہے بلندی کا جواب
دیکھ سیّاح! اسے رات کے سنّاٹے میں، — مُنہ سے اپنے مہ کامل نے جب الٹی ہو نقاب

در و دیوار نظر آتے ہیں کیا صاف و سبک — سحر کرتی ہے نگاہوں پہ ضیائے مہتاب
یہی ہوتا ہے گماں خاک سے مَس اس کو نہیں — ہے سنبھالے ہُوئے دامن میں ہوائے شاداب
یک بہ یک دیدۂ حیران کو یہ شک ہوتا ہے — ڈھل کے سانچے میں زمین پر اُتر آیا ہے سحاب
بے خودی کہتی ہے آیا یہ زمین پر کیونکر — کسی اُستاد مصوّر کا ہے یہ جلوۂ خواب

اک عجب منظرِ دلگیر نظر آتا ہے
دور سے عالمِ تصویر نظر آتا ہے

شوکت و شانِ عمارت کی خبر دیتا ہے — پردۂ شب کے سرکنے پہ سحر کا آغاز
وہ سپیدیٔ سحرِ نور کی ہلکی ہلکی — آشیاں چھوڑ کے جب کرتے ہیں طائر پرواز
ایسے عالم میں وہ کہرے سے اُبھرنا اس کا — جیسے موجوں کے تلاطم سے نمایاں ہو جہاز
ہوتے ہیں گنبد و مینار فضا میں ظاہر — بڑھ کے ہوتی ہیں زیارت سے نگاہیں ممتاز
جگمگاتا ہے شعاعوں میں یہ ایوانِ بلند — جس کی صنعت کا ہے دنیا سے نرالا انداز
پارۂ چوب کے احسان کی ضرورت نہ رہی — خاک اور خشت نے مل کر یہ دکھایا اعجاز
اس کی تعمیر کو آئے نہیں معمارِ فرنگ — ہے یہ تہذیبِ اودھ کے لئے سرمایۂ ناز
بچ گیا خاک کے پردہ پہ یہ مٹی کا طلسم — ورنہ دُنیا کی ہوا اس کے لئے تھی ناساز
اس کے سائے میں گرا تاجِ حکومت سر سے — اس نے دیکھا یہ زمانہ کا نشیب اور فراز
مل گئے خاک میں سب اس کے بنانے والے — کچھ شجر ہائے کہن اب ہیں پُرانے دمساز
کیا سرِ شام اُداسی کا سماں رہتا ہے — در و دیوار سے کر جاتی ہے رونق پرواز
دھوپ اُترتی ہُوئی آنکھوں کو یہ دکھلاتی ہے — دلِ مجروح کا ہر خشت میں ہے سوز و گداز
جس کے فیضانِ حکومت کا کرشمہ ہے یہ — اس کے دامن میں ہے سویا ہُوا وہ خلق نواز
اُس کی ہمت کی بلندی ہے بلندی اِس کی — اُ[illegible]خلاق کی وسعت کا ہے اِس میں انداز
جب زیارت کو محرم میں بشر آتے ہیں — چ[illegible]ی رات میں آتی ہے فلک سے آواز

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ است
سجدہ گاہِ ملک روضۂ شاہنشاہ است

چکبست لکھنوی

قطعہ

کسی نے آکے جنابِ جنید سے یہ کہا — کہ آج کل ہے زمانے کا کچھ عجیب حساب
جو میل جول کی پوچھو تو ملنے والے لاکھ — جو دل ٹٹول کے دیکھو تو دوستی نایاب
کل آکے کی تھیں محبت کی سینکڑوں باتیں — کچھ آج یاد نہیں جیسے پچھلی رات کا خواب
کہا جنید نے مطلب کے ساتھ ملنا کیا — بناؤ اور بگاڑ اُس کا ہو بہ شکلِ حباب
وفا جو اور سے چاہی تو خود غرض ٹھیرے — وفا شعار ہوئے خود تو خود غرض احباب

احمد علی۔ شوق۔ قدوائی۔

سفرِ عدم کی اطلاع

یہ نظم جناب زاہدہ خاتون صاحبہ شروانیہ (ز خ ش) عرف "سخن گو خاتون" نے خواجہ بانو کے پاس بھیجی تھی اور غالباً ابھی کہیں چھپی نہیں ہے۔ اس وقت جبکہ ملک میں خاتون محترمہ کی وفات سے جگہ جگہ ماتم ہو رہا ہے اور تعلیمیافتہ گھرانوں میں اس موت کو قومی حادثہ خیال کیا جاتا ہے اس نظم کا شایع ہونا کئی اعتبار سے اچھا ہے۔ ایک تو مرحومہ کی شاعرانہ قابلیت مکرر روشنی میں نظر آئیگی۔ دوسرے انکی وہ فلسفیانہ و صوفیانہ ذہانت معلوم ہوگی جو خدا نے انکو عطا فرمائی تھی۔ تیسری بات جو سب سے زیادہ ہے وہ مرحومہ کی قوتِ کشف ہے۔ اس نظم میں انہوں نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ ملنا ہے تو مل لو ورنہ اب میں عدم کے سفر کو جانے والی ہوں۔

حسن نظامی

لذتِ دید کا چسکا ہے تو آ دیکھ مجھے — صاحبِ دیدۂ بینا ہے تو آ دیکھ مجھے
جو نہ دیکھا تھا کبھی تجھ کو دکھائی دیگا — ساری دُنیا کو بھی دیکھا ہے تو آ دیکھ مجھے
ترجمانِ دلِ پُر شوق ہے صورت کہ نہیں؟ — تو قیافہ کی شناسا ہے تو آ دیکھ مجھے
مٹ گیا فرقِ من و تو جو نشہ ... پر — آئینہ گر نہیں دیکھا ہے تو آ دیکھ مجھے
میری صورت ہے تماشہ کہ یاس ... ید — تجھ کو گر شوقِ تماشا ہے تو آ دیکھ مجھے
دیدنی ہے مرے پہلو کا پری خانہ بھی — سیرِ باطن کی تمنا ہے تو آ دیکھ مجھے
اُس کی قدرت کا ایک ادنےٰ سا کرشمہ ہوں میں۔ — الفتِ ہستئ اعلےٰ ہے تو آ دیکھ مجھے

سب مری بات پہ کہتے ہیں کہ مختل ہے دماغ
تجھکو دیوانوں کا سودا ہے تو آ دیکھ مجھے

درد کا بیت جہاں میں ہوں مجسم مضمون
ذوق گر شعر و سخن کا ہے تو آ دیکھ مجھے

شکل نیرنگِ جہاں آنکھ میں پھر جائیگی
شوقِ نظارۂ دنیا ہے تو آ دیکھ مجھے

غم مرا دیکھ کے بھولیگی سب اپنی کلفت
تیرے دل کو کوئی صدمہ ہے تو آ دیکھ مجھے

ہیں صعوباتِ سفر دید کے آگے لاشے
گر تجھے چاہ کا دعوےٰ ہے تو آ دیکھ مجھے

وہم ہے۔ خواب ہے۔ دھوکا ہے حیاتِ انسان
تو اگر عاقل و دانا ہے تو آ دیکھ مجھے

لوگ پوچھینگے مری صورت و سیرت تجھ سے
مُنہ کسی کو جو دکھانا ہے تو آ دیکھ مجھے

دیکھ اب سیرِ عدم مدِّ نظر ہے۔ مجھ کو
جیتے جی دید مری چاہے تو آ دیکھ مجھے

دیدنی ہے مری کیفیتِ ناگفتہ بہ
گر تجھے شبۂ بے جا ہے تو آ دیکھ مجھے

میری بیوی بیلے خواجہ بانو آخر کے پانچ اشعار کو آجکل بار بار پڑھتی ہیں اور زار و قطار روتی ہیں۔ انکو مرحومہ کے ساتھ غیر معمولی تعلق تھا۔ جب یہ نظم انکے پاس آئی تو انہوں نے اسکو معمولی شاعرانہ بات سمجھ کر رکھ دیا۔ اب وہ کہتی ہیں کہ سیرِ عدم کی اطلاع پاکر بھی میں دوبارہ ملنے نہ جاسکی اور حیاتِ انسانی کا دھوکہ سامنے آگیا میں نے سفر کی مشکلات کا بہانہ کیا یا مشکلات بہانہ بنکر میرے سامنے آئیں مگر افسوس محبت نے میری کچھ مدد نہ کی۔ ورنہ دیدِ مزید کی حسرت دل میں نہ رہتی۔ میں مرحومہ سے صرف ایک بار ٹھیکم پور جا کر ملی تھی پھر کبھی وہاں جانا ممکن نہ ہُوا۔

خواجہ بانو کہتی ہیں مرحومہ کے بہت سے خط میرے پاس ہیں اگر مرحومہ کے عزیزوں نے نامناسب نہ جانا تو میں ان کی نظرثانی کر کے شائع کرا دونگی کیونکہ ہر خط درسِ حکمت اور تغیراتِ عالم کے سبق کا خزانہ ہے۔

حسن نظامی

جذباتِ عالیہ

گرامی

شبہائے وصل و گوشۂ چشمِ عنایتے
مائیم و زلفِ یار و مسلسل حکایتے

ہاں وارسی بہ نکتۂ مضمونِ باغِ خلد
خوانی اگر ز مصحفِ رخسار آیتے

عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما
ایں را نہایتے ست نہ آنرا نہایتے

از صبر و شکر نے سخنے نے ترانۂ
الا چکد ز حضرتِ انسان شکایتے
عنوانِ یک نگاہ تو آشوبِ عالمے
تمہیدِ نیم خندِ تو مرگِ ولایتے
عقلِ بہانہ جو سپر انگند و رم گرفت
در عرصۂ کہ عشق علم کرد رایتے
تا چند امتحانِ تغافل تنبیہے
دیرینہ بندہ ایست گرامی رعایتے

مرزا محمد ہادی

صورتیں اُمید کی خوابِ پریشاں ہو گئیں
سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہو گئیں
راحتیں طولِ مرض کی صرفِ درماں ہو گئیں
زندگی جن مشکلوں سے تھی وہ آساں ہو گئیں
بے مرمت سی جو قبریں کوچۂ وحشت میں تھیں
وہ بھی آخر صرفِ استحکامِ زنداں ہو گئیں
پنجۂ وحشت نے سینہ پر جو کیں گلکاریاں
فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہو گئیں
کچھ دلوں واعظ نے جن کا خود کیا تھا التزام
اب وہ تکلیفیں سراسر جزوِ ایماں ہو گئیں
کامیابی لذتِ موہوم جب ثابت ہوئی
حسرتیں دل سے نکلتے ہی پشیماں ہو گئیں
اُن سے کیا لطفِ تعلق اُن سے کیا دل بستگی
غیر کے ماتم میں جو زلفیں پریشاں ہو گئیں
ہم سے پوچھے بھی کوئی تو کیا کہیں کیا چاہیئے
خواہشیں بیتابیٔ دل سے پریشاں ہو گئیں
چند باتیں وہ جو ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل
اب سُنا مرزا کہ وردِ اہلِ عرفاں ہو گئیں

عبد الحی صدیقی

محو ہوں لُطفِ نازہیں تیرے
گُم ہوں رازو نیازہیں تیرے
میری ہستی مِٹا چُکا ہے عشق
حُسنِ ہستی نوازہیں تیرے
یہ فریبِ نظر ۔ معاذ اللہ
جلوۂ پردہ سازہیں تیرے
چشمِ نظارہ محوِ حیرت ہے
حُسنِ نیرنگ سازہیں تیرے
شانِ تسخیرِ عالمِ جاں ہے
لُطفِ بندہ نوازہیں تیرے
اُف ۔ یہ عالم فریبیاں ظالم!
حُسنِ عالم طرازہیں تیرے
کُشتۂ مشقِ نازہیں لاکھوں
غزۂ ترکتازہیں تیرے

ناظر

حضرت ہمایوں مرحوم کی سیر کشمیر کے موقعہ پر پنجاب کے مشہور شیوا بیان خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر نے اشعار ذیل فی البدیہہ ارشاد کئے تھے اس مجلس میں آنریبل مسٹر محمد شفیع بھی شریک تھے مقطع میں اسکی طرف اشارہ ہے

(دلی)

رازِ نہاں کسی سے اپنا عیاں نہ کرتے
اے کاش دل کو اہلِ زباں نہ کرتے
گر بوالہوس نہ کرتے دعوئے عشقبازی
وہ اپنے عاشقوں کا یوں امتحاں نہ کرتے
گر جانتے جوانی ہے ایک نقشِ فانی
یہ فخرِ لن ترانی یوں نوجواں نہ کرتے
گر جانتے کہ غم سے ممکن نہیں رہائی
راحت کی ہاں تمنا ہم رائگاں نہ کرتے
اُس دلربا کو لایا پھر طالعِ ہمایوں
ہم نقدِ جان و دل کو کیوں ارمغاں نہ کرتے
رندوں کی انجمن میں گر محتسب نہ آتے
اس طرح میکشی کی رمزیں بیاں نہ کرتے
تھا آفتابِ محشر نظارہ سوز ناظر
سر پر شفیعِ عالم گر سائباں نہ کرتے

بیخود

اسکو بھی ڈھونڈھتے ہیں اپنی بھی جستجو ہے
اک وہ بھی ہے تمنا اک یہ بھی آرزو ہے
جس سے مہک رہا ہے باغِ جناں وہ تو ہے
پھولوں کو کون سونگھے ان میں خودی کی بو ہے
جو سب کو چھوڑ بیٹھا عاشق ترا وہی تھا
کہتے ہیں لوگ جسکو جانِ جہاں وہ تو ہے
کیا کر دیا یہ جادو آنکھوں میں بس گیا تو
ہم جسکو دیکھتے ہیں تجھ سا ہی ہو بہو ہے
موسیٰ کے ہوش کھو کر ٹھہرا وہاں نہ دم بھر
پاس آ کے دور رہنا مدت سے تیری خو ہے
ہر سمت روشنی سی پھیلی ہوئی ہے کیسی
پردہ سے جلوہ افگن کس کا رخِ نکو ہے
جس دل میں درد پایا اپنا اسے بنایا
معشوق کی نظر میں عاشق کی آبرو ہے
ظاہر میں ہے خدا تو باطن میں دلربا تو
یہ بھی ہے شان تیری اُس شان میں بھی تو ہے
جامِ مراد بھر دے یکسو مجھے بھی کر دے
شہرہ ترے کرم کا دنیا میں چار سو ہے
آئینہ میں ہویدا ہے عکس آئینہ کا
میں اُسکے روبرو ہوں وہ میرے روبرو ہے
غنچہ جو کوئی چٹکا بلبل نے دل میں سمجھا
پردے کا ہے وہ عادی پردے میں گفتگو ہے
عصیاں پسند مجھ سا آمرزگار تجھ سا
دنیا میں میں ہی میں ہوں عقبیٰ میں تو ہی تو ہے
بیخود شراب پینی عادت نہیں ہے تیری
ہم تجھ کو جانتے ہیں مستِ الست تو ہے

تاجور

وجہ بربادیٔ دل عشقِ فسوں ساز نہ ہو
صاحبِ خانہ کہیں خانہ برانداز نہ ہو
ضبطِ فریاد سے ہو جائیں نہ آنکھیں پرنم
پردہ داری ہی کہیں پردہ درِ راز نہ ہو
روح پرواز کریگی قفسِ عنصر سے
نہیں بلبل میں اگر طاقتِ پرواز- نہ ہو
صدرِ محفل نہ ہو تو ہی کہیں اُس محفل میں
بزمِ محشر بھی تری انجمنِ ناز نہ ہو
دل میں رکھیئے اُس دل کو جو سوزِ غم سے
صفتِ شمع پگھل جائے اور آواز نہ ہو
ہوک سی اُٹھنے لگی دل میں خدا خیر کرے
جس کا انجام نہیں یہ وہی آغاز نہ ہو
تاجور! ترکِ محبت کی قسم ٹوٹ نہ جائے
وہ فسوں سازِ کج اندازِ در انداز نہ ہو

تقریظات

جانورستان۔ اُردو کے محسن اعظم مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے آخری بائیس سال دماغی صدمات کی وجہ سے مدہوش و خود رفتگی کے ایام تھے۔ اس زمانہ میں بھی وہ بقدرِ ہوش و حواس کچھ نہ کچھ تصنیف فرماتے ہی رہے تھے ان ایام جذب و جنون کی ایک یادگار اُنکے گرانقدر نبیرہ آغا محمد طاہر صاحب نے "جانورستان" کے نام سے شائع کی ہے۔ جس میں مولانانے چرندوں درندوں اور پرندوں کے حالات مجذوبانہ پیرایہ میں اپنی کوثر سے دُھلی ہُوئی زبان میں بیان فرمائے ہیں۔ ہمارے خیال میں کتاب کی تعریف کرنیکی بجائے صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ "جانورستان" مولانا آزاد کے خامۂ بیخودی ریز کی تراوش ہے۔ حجم اسّی صفحات۔ قیمت آٹھ آنہ۔ جناب آغا محمد طاہر صاحب مینیجر آزاد بک ڈپو اکبری منڈی لاہور سے مل سکتی ہے۔

تہذیب کے تازیانے۔ بنگال کے مائیہ ناز ناولسٹ بنکم چندر چیٹرجی سی آئی ای کے چند دلچسپ۔ شوخ اور تعریضی مضامین کا مجموعہ جسے بنگالی سے مہاشہ سدرشن جرنلسٹ نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ مضامین مختصر مگر بہت دلچسپ ہیں۔ ہر مضمون سیاسی ہے اور ہندوستان کے کسی نہ کسی تاریک پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ اندازِ بیان بہت شوخ اور تعریضی ہے۔ کتاب قابل دید ہے۔ کاغذ ولایتی۔ لکھائی چھپائی مناسب ١٤٢ صفحات قیمت ١٢ر مینیجر رام کٹیا بک ڈپو گوالمنڈی لاہور سے طلب کیا جائے۔

اعجاز۔ جالندھر سے مولانا گرامی کی سرپرستی میں ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری نے اس نام کا ایک ماہوار ادبی رسالہ شائع کیا ہے۔ اس کے مضامین مفید و دلچسپ ہیں۔ حضرت حفیظ "اعجاز" کو گرانقدر بنانے میں بہت ساعی ہیں۔ امید ہے کہ انکی محنت بیکار نہ جائیگی۔ حضرت گرامی بالقابہ کا جانِ بلاغت کلام اعجاز کی دلکش خصوصیت ہے۔ کاغذ ولایتی ہے لکھائی چھپائی آئندہ نمبر سے بہت بہتر ہوگی سالانہ چندہ پانچ روپے ہے پتہ دفتر رسالہ اعجاز جالندھر

ہُمایوں کے متعلق اہلِ قلم کی رائیں

جناب خواجہ حسن نظامی دہلوی۔ رسالہ ہمایوں کے دو پرچے دیکھے۔ آنکھیں انکی نظرفریبی کا اقرار کرتی ہیں اس زمانہ میں جبکہ ہندو مسلمانوں کے حالات وخیالات متحد ہورہے ہیں مگر یورپ و ایشیا کے دلوں میں جدائی ترقی کررہی ہے ایک ایسے ادبی رسالہ کا جاری ہونا مفید ہوگا جو شرق وغرب کے علم ادب کو ایک گھر میں دسترخوان و میز پر کھانا کھلائے۔

واقعی رسالہ ہمایوں کی یہ خصوصیت قابل توجہ ہے کہ اس میں مشرقی ومغربی زبانوں کے لطیف خیالات سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ یورپ کا طرز تخیل ہم لوگوں سے بہت اجنبی ہے لیکن تعریف کرنی چاہیئے کہ ترتیب کے وقت اس اجنبیت کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہر چیز درجہ بدرجہ ترقی کرتی ہے رسالہ ہمایوں میں یہ اصول پیش نظر معلوم ہوتا ہے میاں بشیر احمد صاحب رسالہ کو بامِ عروج تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتے۔ امید ہے کہ چند روز میں ہمایوں اردو زبان کا فخر بن جائیگا۔

حسن نظامی ۲۵ فروری ۱۹۲۲ء

جناب نواب نصیر حسین خانصاحب خیال عظیم آبادی۔ مکرمی۔ سلام علیک وقلبی لدیک۔ رسالہ ہمایوں کا دوسرا نمبر پہنچا۔ آپکی محبت وعنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک ایسے رسالہ کی جیساکہ یہ ہے ہمارے ملک و قوم کو بڑی ضرورت تھی اور شکر کہ وہ آپ کے قابل ہاتھوں سے پوری ہورہی ہے۔

میں نے 'انقلاب فرانس' اور 'عورت اور مختلف مذاہب' یہ دو مضامین بہت شوق سے پڑھے۔ دعا ہے کہ یہ رسالہ ترقی پائے اور ملک و قوم کے لئے مفید ثابت ہو۔ والسلام۔

خیال۔ (سید نصیر حسین خاں)

جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب بارایٹ لا (علیگڈھ)۔ مکرمی۔ تسلیم! اس مہینہ کا "ہمایوں" تو اس وقت تک نہیں ملا لیکن گذشتہ ماہ کا پرچہ پہنچا تھا۔ میں شرمندہ ہوں کہ بوجہ مصروفیت اس وقت تک رسید اور شکریہ نہ لکھ سکا۔ مسٹر بشیر احمد صاحب ہر طرح پر قابل مبارکباد ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے نامور والد مرحوم کی یادگار کو ایسی عمدہ شکل میں زندہ رکھنے کی فکر کی ہے۔ دلی دعا ہے کہ خالقِ اکبر ان کو کامیاب فرمائے۔ آمین۔

خاکسار۔ آفتاب احمد

فہرستِ مضامین رسالہ ہمایوں بابت ماہِ مئی سنہ ۱۹۲۲ء

جلد ۱ — نمبر ۵

حصۂ نثر

حصۂ نظم

محمد انور کاتب چوک متی لاہور

بزمِ ہمایوں

بزمِ ہمایوں میں آج آزاد کی آمد آمد کا چرچا ہے،

آزاد! ـــــ وہی! اُردو کے صحرائے لق ودق کا لالۂ خودرو جو اپنے رنگ و بُو میں یکتا اور اپنی دلکشی میں بیمثال شہرۂ آفاق ہے۔

وہی! بوستانِ ادب کا سدا بہار پھول جس کی بھینی بھینی نکہت چمن چمن میں گل آفرینی کے کرشمے دکھاتی پھرتی ہے۔

آزاد! تکلف و تصنع سے یکسر آزاد! ـــــ بزمِ طفلی میں جاتا ہے تو نصیحت کا کرن پھول لئے ہُوئے۔ خیالات کی فضا میں اُڑتا ہے تو اس طرح سے پر ہلائے کہ نیرنگِ خیال کا عالم آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ تشنگانِ ادب کے جمگھٹے میں اپنا سبو لئے گذرتا ہے تو آبِ حیات کی شفاف و شیریں بُوندیں پہلو سے ٹپکتی ہیں۔ یہ فانی ہستیوں کو ذوقِ بقا سے آشنا کرنے والا جب شاہوں کے دربار میں جا نکلتا ہے تو وہیں بے تکلف اپنا رنگ جما دیتا ہے۔ اُس کی متانت بناوٹ سے عاری ہوتی ہے اور ہلکی ہلکی ظرافت ابتذال سے پاک وصاف۔ وہ شہرت کے شیدائیوں کو اپنے مناسب مقام پر جگہ دیتا ہے اور انہیں اس انداز سے دیکھتا ہے کہ صدیوں کی خاموش مورتیں بولتی چالتی ہستیاں معلوم ہونے لگتی ہیں!

ادبی محفل میں جب دُنیا کے مُصنفین کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہم لوگ اکثر چیں بجبیں ہوتے ہیں کہ ہماری اُردو کا کوئی نام لیوا نہیں۔ البتہ آزاد اک ایسا لکھنے والا ہے جس کا ذکرِ خیر مستشرقین سے گذر کر اور لوگوں کی زبان پر بھی ہے۔ خاکسار کو ایک دفعہ برلن جانے کا اتفاق ہُوا تو رستے میں ایک متوسط طبقے کے جرمن نے جو شریکِ سفر تھا اثنائے گفتگو میں پُوچھا کہ صاحب آپ کے ہاں آزاد کی طرح کے نثر لکھنے والے اَور بھی ہیں؟ مجھے حیرت ہوئی اور خوشی بھی کہ خدا کا شکر ہے اک اجنبی مُلک میں کوئی اُردو کو یاد کرنے والا بھی ہے۔ اس کے سوا میں کیا جواب دے سکتا تھا کہ اگر ہوتا تو آپ اُس سے ناواقف نہ ہوتے۔

میں آغا محمد طاہر صاحب کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے جد امجد کی بعض تحریروں کو جو ابھی تک دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہیں وقتاً فوقتاً ہمایوں کی محفل میں پیش کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

بشیر احمد

جہاں نما

چین کی ترقی۔ انجمنِ طلبائے چین (اضلاعِ متحدہ) کے ماہوار رسالہ میں مسٹر سل لکھتے ہیں کہ تعمیرِ ملکی کے لئے سب سے اہم عنصر قومی آزادی کا استحکام ہے۔ "بدقسمتی سے روحانی ذکر و فکر کا ایک لازم نتیجہ عملی باتوں میں سہل انگاری ہے۔ اسکا چنداں مضائقہ نہ ہوا اگر چین دنیا بھر سے الگ تھلگ رہ سکے لیکن چونکہ یہ ناممکنات سے ہے اسلئے اسکے ہوتے ہوئے زیادہ چست قوموں کو چین پر غلبہ پانیکا موقع ملجاتا ہے۔ یہ اجنبی حکومت خواہ فوجی ہو یا اقتصادی یا محض روحانی بلا شبہ ایک زحمت ہے جسکا تنہا علاج اصلاح پسند چینیوں کی توانائی ہے۔ موجودہ چین کی تمام خواہشات کا پورا ہونا صرف اُس کی قومی آزادی کے تحفظ پر منحصر ہے۔

اگر قومی آزادی کا تحفظ منظور ہے تو چینیوں کے لئے اِن چار امور کا سرانجام دینا لازم ہے (۱)۔ اخلاق و قوتِ عامہ کا نشو و نما (۲)۔ ایک عمدہ اور پائدار حکومت کا قیام (۳) صنعتی اور ابتدائی تعلیم (۴) چین حرفی ذرائع کو چینی دولت و محنت کے ذریعے سے ترقی دینا۔

چین میں اصلاحِ عام کی شدید ضرورت کا اعتراف کرتے ہوئے صاحب موصوف لکھتے ہیں:۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ اصلاحات چینی طریقے سے عمل میں لائی جائیں وہ چین ہی کے ماضی کا نشو و نما ہوں اور اُن میں مغربی خیالات اور مغربی طرزِ عمل کی اندھا دھند پیروی نہ ہو۔ مغربی علوم کی مناسب ترویج مفید ہو سکتی ہے اور اس طرح چین ترقی کے اک نئے دور میں قدم رکھ کر بعض اُن دشواریوں کو حل کر سکتا ہے جو ہم مغربی لوگوں کے لئے سدِ راہ ہو رہی ہیں مثلاً ہمارا سب سے دشوار مسئلہ یہ ہے کہ صنعت کس طرح انسان کی خادم بنائی جا سکتی اور انسان کس طرح اُس کے ظلم و تشدد سے رہائی پا کر انسانیت کو مادیت کی زبردست گرفت سے چھڑا سکتا ہے؟

اخبار فگارو۔ اِس تجویز پر کہ فرانسادی فوج میں حبشیوں کی تعداد دو لاکھ سے بڑھا کر تین لاکھ کر دی جائے رقمطراز ہے کہ کالے لوگوں پر زیادہ اعتماد کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم انہیں صرف اس غرض سے بھرتی کریں کہ ہماری فوج میں اضافہ ہو نہ اس غرض سے کہ وہ ہماری بجائے فوجی خدمت سرانجام دیں۔ کیونکہ ایسا ہوا تو وہ دن دُور نہیں جب فرانس بھی سلطنتِ روما کی طرح اپنے محافظین کے ہاتھوں تباہ

ہو جائے گا۔

جبریہ جمہوریت۔ کرنل آرچرشی نے دارالعوام (انگلستان) میں حقِ رائے کو جبری طور پر استعمال کرانے کی غرض سے ایک مسودۂ قانون پیش کیا ہے جس کی رُو سے حق رائے (ووٹ) نہ دینے والے شخص کو دس شلنگ جرمانہ کیا جائے گا۔

اس قسم کے قانونی تشدد کو دیکھ کر لوگ کس طرح شک وشبہ میں نہ پڑ جائیں کہ جمہوریت ناکام ثابت ہو رہی ہے۔ رائے دہندگان خاص قسم کے خیالات کو مدِ نظر رکھ کر اک نمائندہ منتخب کرتے ہیں۔ لیکن وہ دارالعوام میں جب اپنی نشست گاہ پر ڈٹ کر بیٹھ جاتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ وہ منتخب ہُوا تھا۔ پھر وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ نظامِ فرقہ بندی میں اُس کی جگہ کہاں ہے۔ جمہوریت کی وہی شکل سب سے دلکش نہیں جو مغرب نے پیش کی ہے۔ اس سے صدیوں پہلے مشرقی ممالک اور بالخصوص عرب نے بھائی بندی کی وہ قابلِ تقلید مثال قائم کی تھی۔ جس میں مادیت پرستی کو بہت کم دخل تھا۔

تعاون۔ کرّ و فرّ اور زور شور کے عناصر عدم تعاون کی تحریک سے جدا ہو گئے۔ "بیکنی" کا طرزِ عمل ختم ہو چکا۔ اب وقت ہے کہ "تعاونی" میدانِ سیاست میں اُتر آئیں اور مسمار شدہ عمارت کے اینٹ روڑوں سے اک جدید تمدنِ ہندی کی بنیاد ڈالیں۔ تعاون کے معنے تساہل کے نہیں ہیں!

(ب ل)

علمی شعاعیں

گھر بیٹھے جلسہ میں۔ گھر بیٹھے انسان کیا کچھ نہیں کرلیتا۔ دوست کا خط تو پُرانے زمانے سے گھر بیٹھے ہی مل جاتا تھا۔ تہذیبِ زمانہ سے صرف اتنی ترقی ہُوئی کہ جہاں ہفتوں میں چند باتیں لکھی جاتی تھیں اب دنوں میں جواب اور جواب الجواب پہنچ جاتے ہیں۔ پھر تار کا اضافہ ہُوا کہ اُکھڑی اُکھڑی سی باتیں صُبح کو اُنہوں نے کیں اور دوپہر ہونے سے پہلے ہم نے سُن لیں۔

تھوڑی مُدت سے ٹیلیفون گھر میں لگ گیا تو ہر وقت گھنٹی بجنے لگی کہ چلئے وہ یاد فرماتے ہیں صورت نہ دیکھی لیکن آواز تو سُن لی۔ مگر اس میں غیروں کی آواز نہ سُنی جاتی تھی۔ تھیٹر دیکھنے لکچر سُننے عبادت کرنے کے لئے لازم تھا کہ گھر سے باہر قدم رکھا جائے۔

اب سُنتے ہیں کہ امریکہ والوں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کا سوال حل کردیا ہے۔ ایک لاسلکی ٹیلیفون آپ کے گھر میں لگادی جاتی ہے جب چاہو آواز رساں کو اُٹھاکر کان سے لگا لو۔ آپ کیا چاہتے ہیں "وزیرِ اعظم کی تقریر" سنئے۔ پھر متانت سے طبیعت اُکتا گئی تو فلاں گانے والی کا تازہ ترین راگ۔ نظارہ باز تماشا گاہوں میں بیٹھے ہیں آپ یہیں بے تکلف سُن رہے ہیں۔

آپ غالباً نہیں جانتے کہ جب سے آپ نے انیسویں سال میں قدم رکھا ہے۔ آپ امپیریل لائبریری کلکتہ کے رُکن ہوچکے ہیں۔ آپ جب چاہیں وہاں جاسکتے ہیں۔ جب چاہیں وہاں سے کتابیں گھر پر مطالعہ کے لئے لاسکتے ہیں۔ اور اگر آپ لاہور یا لکھنو۔ دہلی یا حیدرآباد میں مقیم ہوں تو بھی حسبِ دلخواہ وہاں سے کتابیں منگوا سکتے ہیں۔

ہندوستان وہ ملک ہے جسے خدا نے گوناں گوں نعمتوں سے مالا مال کیا ہے لیکن جس کے اکثر رہنے والوں کی قسمت میں ان برکتوں سے حظ اُٹھانا نہیں لکھا۔ یہاں کی شرحِ پیدائش میں کسی طرح کمی نہیں لیکن شرحِ اموات بھی سب ملکوں سے بڑھ کر ہے۔ بمبئی میں ... [illegible] بچوں

میں سے ۷۰۰۰ پانچ سال کی عمر سے پہلے پہلے مر جاتے ہیں + انگلستان میں بچوں کی شرح اموات ۶۰ فی ہزار سے زائد نہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان میں کم از کم ۳۵۰ ہے +

زمین کی دُم۔ غروبِ آفتاب کے بعد مشرقی اُفق پر روشنی کا ایک پھیلا ہُوا قطعہ نظر آتا ہے ہیئت دانوں کا خیال ہے کہ یہ ٹکڑا فی الحقیقت ہماری زمین کی دُم ہے۔ بالعموم اس کا قطر چاند کی نسبت دس یا بارہ گنا زیادہ ہوتا ہے لیکن صاف فضا میں اس کا طول وعرض اس سے بھی چھ گنا ہوجاتا ہے +

اس ظاہرا دُم کی اصلیت کی بابت متعدد نظرئے پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ دو سب سے ہلکی گیسیں ہائڈروجن اور ہیلیئم سورج کی قوتِ دافعہ کے باعث زمین سے پرے ہٹ جاتی ہیں + بعضوں کا خیال ہے کہ چونکہ فضا کے بالاترین حصے کسی نامعلوم آفتابی عمل کی وجہ سے خود بخود روشن رہتے ہیں اس لئے زمین یُوں روشنی میں ملفوف نظر آتی ہے + گلڈن اور مولٹن کے خیال میں یہ مظہر لاتعداد چاندوں کے انعکاسِ ضیاء کا نتیجہ ہے جو جسامت میں ایک مرمری ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہوتے + پروفیسر برنارڈ (جو رصدگاہِ یرکس میں کام کرتے ہیں) کہتے ہیں کہ یہ نظارہ دراصل نتیجہ ہے۔ ضیاءِ شمسی کے اُس اجتماع کا جو انعطافِ ضیاء سے پیدا ہوتا ہے اور اس عمل میں ہماری فضا اک مُدوّر زُجاجہ (لینز) کی طرح کام دیتی ہے + زمین کا سایہ چاند کو منور کرتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ روشنی کا ایک مخروطی قطعہ فضا میں قائم ہوجاتا ہے۔ حالاتِ موافق میں فضا کے بالاترین حصے روشنی کی اِن کرنوں کو زمین کی طرف منعکس کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح زمین دُمدار نظر آنے لگتی ہے +

حال کی ایک نمایش میں لوئی سیڈ نگر ایک فرانسادی پہلوان نے لیٹے ہُوئے اپنی ٹانگوں پر تیس من بوجھ اُٹھایا۔ اس پر سات آدمی بھی سوار ہوگئے۔ اِس وقت وہ پُکارا کہ "بس" اس کے پٹھوں کی مضبوطی میں ذرا سا فرق آنا موت کا مسادی ہو +

مچھروں اور پسوؤں نے ہزاروں کی نیند حرام کی ہوگی اور سینکڑوں کی زندگی دُو بھر۔

چنبیلی کا تیل فینائل اور خدا جانے کتنی اور مصنوعات ایجاد ہوئیں۔ رات کو مسہری لگائی لیکن دن کو تو اس پنجرے میں بیٹھ کر کام کرنا دشوار تھا۔ ناچار اسے ایک بلائے آسمانی سمجھ کر خاموش ہو رہے۔ سنتے ہیں کہ اب فرانس میں تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ پالتو جانوروں کو وہاں کے مچھر انسان کی نسبت زیادہ پسند کرتے ہیں اور ان میں بھی خرگوش کے خون کے لئے وہ زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ فرانس کے اکثر حصوں میں لوگ اب مرغیوں کے ساتھ خرگوش بھی پالتے ہیں تاکہ بیماری پیدا کرنے والے جراثیم سے محفوظ رہیں۔ ہمارے ملک میں کاٹنے والے "جانور" کثرت سے ہیں تاہم یہاں کے رہنے والے ہنوز خوابِ خرگوش میں پڑے ہیں۔

انگلستان میں انسانی زندگی کی اوسط ۵۱،۵ سال ہے۔

لندن میں تینتیس ۳۳ اور نیویارک میں اُنچاس بڑے تھیٹر ہیں

برطانیہ میں فی کس ۲۲ پونڈ ۶ پنس ٹیکس کی اوسط نکلتی ہے۔

نیویارک سے سولہ سو ۱۶۰۰ میل کے فاصلے تک ۵۰،۰۰۰ شخص ہر رات لاسلکی کے ذریعے سے وہ گیت سنتے ہیں جو نیویارک کی تماشا گاہوں میں گائے جاتے ہیں۔

مسکرانا آسان ہے تیوری چڑھانا مشکل۔ مسکراتے وقت انسان صرف ۱۳ اعصاب کو کام میں لاتا ہے تیوری چڑھاتے وقت ۶۴ کو۔

(ب۔ا)

نسوانی دُنیا

لبرٹی (امریکہ) کے ولیم جوئیل کالج میں امسال ایک خاتون مسز چرچ اپنے دو پوتوں کے ساتھ جماعتِ اول میں داخل ہوئی ہے۔ عمر بھر اُسے یہ خواہش رہی کہ وہ کالج میں اعلیٰ تعلیم پائے۔ ۱۸۸۵ء اُس نے اسکول کا آخری امتحان دیا لیکن اس کے بعد خانگی افکار اور پھر شادی کے باعث وہ اپنا مطالعہ میں جاری نہ رکھ سکی۔ اس مدت میں اُس نے پانچ بچوں کی تربیت کی۔ اب فرائضِ نسوانی سے فارغ ہو کر وہ کم سن مردوں کے ساتھ شریکِ تعلیم ہے۔ اُس کے شوق و ہمت کی داد نہ دینا مردانہ برتری کے خمار کا روشن ثبوت ہوگا +

گذشتہ سال آرگین (امریکہ) کی مجلس نے ایک قانون منظور کیا تھا کہ تمام اشخاص کے لئے جو شادی کے لائسنس کی درخواست پیش کریں لازم ہوگا کہ وہ اس سے قبل ایک جسمانی و دماغی امتحان پاس کر چکیں + اسی سال مسیچیگن کی ریاست میں یہ قانون پیش ہوا ہے کہ درخواست گزاروں کے لئے لازم ہوگا کہ وہ ایک ڈاکٹر کی سند پیش کریں۔ جذام دق وغیرہ امراض والے اشخاص شادی نہیں کر سکتے + معلوم ہوتا ہے کہ ناروے جرمنی ڈینمارک میں بھی اس قسم کے قانون نافذ کئے جا رہے ہیں +

اوہائیو (امریکہ) میں ایک عورتوں کا بنک کھولا گیا ہے جو خاص طور پر عورتوں کے لئے قائم ہوا ہے۔ صرف عورتیں وہاں سے قرضہ لے سکتی ہیں۔ اس کا انتظام بھی عورتوں کے ہاتھ میں ہے +

دارالعوام (انگلستان) کی تیسری نسوانی رُکن ڈائی کونٹس ونڈزر ہے جو حال میں منتخب ہوئی ہے۔ اُس کی عمر اس وقت ۲۵ سال ہے +

کینیڈا کے دارالعوام میں پہلی بار ایک خاتون بطور رُکن منتخب ہوئی ہے + (د ب)

ہے کہ رخصت لے کر جگہ سے حرکت اور خدا سے برکت لینی چاہیئے۔ اس میں بڑی مصلحت یہ تھی کہ بعض کتابیں زبان فارسی کی (مسودہ) پڑی تھیں کہ ان کی تکمیل اس کے سوا ممکن نہیں۔

انہیں دنوں تقدیر سے مجھے چند دلشکن صدمے پہنچے۔ جس میں سے سخت صدمہ ایک جوان بیٹی کی موت تھی۔ جو حقیقت میں سات بیٹوں سے گراں بہا تھی۔ وہ میری تصنیفات میں میرا داہنا ہاتھ تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ اور **تصنیفات کا قلمدان** اُلٹ گیا۔ یہاں تک کہ اکثر ہوشمندوں کو جنون کا شُبہ ہوگیا۔ پٹیالہ اور لاہور میں اس کا چرچہ بھی ہُوا۔ لیکن چونکہ اس سفر میں کئی مقاصدِ اہم بھی آ گئے۔ اور خاکِ وطن کو سفر کا پیوند دکھانا فرض بھی معلوم ہُوا۔ اس لئے رخصت لی۔

رخصت کا مقدمہ سب سے زیادہ سنگین ہے۔ ایک صاحب ویسے دیسی لوگوں کی خیرخواہی کا دام بچھائے رہتے ہیں اور حقیقت میں ماہیانِ شگون کے شکاری۔ دوست بن کر دشمنی کرنے والے ہیں۔ وہ بموجب اپنی عادت کے ہارج[1] ہُوئے چنانچہ کئی مہینہ کی تنخواہ کا نقصان مجھے پہنچایا یا خدا انہیں غیب سے نقصان پہنچا۔ اور دل کا شیشہ چور کر۔ بہر حال آخر شہر میں مجھے خاص گورنمنٹ کی تحریر نے حصولِ رخصت سے اطمینان دیا۔ کہ خدا اسے ملکِ اطمینان کی سلطنت روزی کرے۔

جب سفر کی خبر مشہور ہُوئی تو اکثر خویش و احباب نے لکھا۔ کہ صدمہ اور ضعف نے آپ کی جان کو دبا لیا ہے۔ بعض بیماریاں اور بھی ہیں۔ اور سفر دُور کا ہے۔ خالی گھر ہے۔ لڑکا نوکری پر ہے ہمیشہ کون دوست خبر گیری کرتا ہے۔ بعض اشخاص نے روکا بھی!

میں نے جو ضرورتیں تھیں بیان کیں۔ انہوں نے کہا کہ درست۔ درست لیکن تنہائی کسی طرح اجازت نہیں دیتی۔ میں نے کہا کہ لڑکے کو سرو سے کی نوکری چھڑوا کر پہاڑ سے بُلایا۔ اُس نے ڈیڑھ مہینہ انتظار کیا۔ مگر اس شیطان پر ہزار لعنت کہ میری رخصت میں خلل انداز ہُوا۔ اس کی اور نوکری ہوگئی۔ وہ گھبرایا۔ میں نے ناچار جانے کی اجازت دی۔ مگر کچھ بات نہیں۔ پہلے بھی تو کئی سفر تنہائی ہی میں کئے ہیں۔ ان میں بے سامانی تھی۔ ڈیڑھ برس مفقود الخبر رہ کر تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ خدا آسان کرنے والا ہے۔ انتہا یہ کہ زیارت کو جاتا ہوں۔ اس سفر میں ہر رستے سے زیارت ہوگی۔ انہوں نے کہا وہ عالمِ جوانی تھا۔ دل میں ارمان تھے۔ اب صدمہ ہائے عظیم سے

---

[1] مولانا آزاد مرحوم کے اصل مسودہ میں حرج ہائے ہوز سے لکھا ہے۔ تاجور

دل ٹوٹ رہا ہے۔ اور پھر آخیر عمر۔ خدا نے ہر طرح آسائش کے سامان دیئے ہیں۔ آرام کرنا چاہیئے۔

میں نے کہا سب درست۔ مگر جن ضرورتوں کے لئے میں جاتا ہوں۔ ملک اس کا محتاج ہے اور قوم کو خیال نہیں۔ لیکن ہوگا ایک عرصہ کے بعد۔ اس سے بہتر ہے۔ کہ میں ہی اس کام کو کر جاؤں۔ خصوصاً فارسی کی جامع اللغات کہ بغیر فارس میں جانے کے اس کی تکمیل اور اعتبار ممکن نہیں۔

آخر ایک دن ایک شخص نے خدا جانے۔ دل آزادی یا پاسداری سے یہ بھی کہا۔ کہ لوگ کہتے ہیں۔ کہ آپ کو جنون ہے۔ مبادا جنگل میں یا جہاز پر اس کا ظہور ہو۔ اس وقت کیا ہوگا؟

ہمت نے کہا۔ کار خیر میں ہمیشہ موانع پیش آیا کرتے ہیں۔ ترکستان و تاتار کے سفر میں لوگوں نے کیا کیا ہوائیاں اُڑائیں۔ نظمِ اردو کے مشاعروں پر کتنی گالیاں کھائیں توکلت علی اللہ کہہ کر اُٹھنا چاہیئے۔ بنک میں دس ہزار روپیہ الگ کیا۔ کہ یکم جنوری ۱۸۸۶ء کو جب میعاد پوری ہو تو نواب نوازش علیخاں قزلباش دام اقبالہم کے حوالہ کردے۔ وہ مجھے سوداگرانِ ایران کے نام خط تحریر فرما چکے ہیں ٭

باقی آئندہ

پھُول رات کی آغوش میں کھلتے ہیں اور دن کی نمائش گاہ میں چمکتے ہیں۔ اور شام کے دھندلکے میں نیند سو جاتے ہیں ا

آبجو کس ناز سے کہتی ہے کہ دریاؤں کا بہتا ہُوا پانی میری دریا دلی کا مظہر ہے۔

تُو اپنے آئینۂ دل کو ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے دے تاکہ تجھے دُنیا کی ہر بات کے ہزاروں پہلو نظر آئیں۔

اس تاروں بھری رات میں کیا ایک تارا بھی نہیں جو کائنات کی نامعلوم تاریکیوں میں میری زندگی کا رہبر ہو سکے؟ مراد (ترجمہ)

گلچیں

علم الجراثیم

اور

اُس کی ترقی وارتقا کے مختلف مرحلے

علم الجراثیم کی موجودہ ترقی و ترویج نے دنیائے طب اور علم العلاج میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ نہ صرف علاجِ مرض کے لئے نئے حربے اور تشخیص و تاویلِ عوارضات کے لئے انوکھے سامان اور محیر العقول و متیقّن وسائل پیدا ہو گئے۔ بلکہ تمدنِ جدید کے بیسیوں فنون، صنعت و حرفت کے کتنے ہی صیغے، ماہیت و خواصِ جراثیم کے انکشافاتِ جدید سے متاثر ہو کر منضبط و مدّون ہو گئے اور اُن کے منافعِ بے شمار سے دُنیا والے مستفید و کامیاب ہو رہے ہیں۔

علم الجراثیم کی تاریخِ ارتقا، اور اُس کے مختلف مدارج و مرحلے، انسانی جدوجہد کی ایک زرّیں اور حوصلہ افزا داستان ہے۔ اُس کی حقیر ابتداء میں اُس کی آئندہ رفعت و بلندی کی شان پنہاں تھی۔ اُس کی ضعیف ترین مخلوق نے پیاپے نسلوں کی مجتمعہ اور متحدہ دماغ سوزی اور جانکاہی کے بعد، آخر اپنی عظمت کا ثبوت دے ہی دیا۔ بالآخر ذرّہ بے مقدار نے آفتابِ عالمتاب کی چمک حاصل کر لی اور مہذب دُنیا کی نظر کو خیرہ کر دیا۔

مگر اس ضعیف و بے حقیقت ہستی کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے؟ اس کا مولد و ملجا، کہاں ہے؟ اس کے خواص و صفات کیا ہیں؟ ان سوالات کا جواب اگرچہ گذشتہ نسلوں کی لگاتار کوششوں میں مترشح و مضمر ہے، مگر عقلِ انسانی اب بھی ہمہ دانی اور کسبِ کمال کی انتہائی معراج کا دعوےٰ نہیں کر سکتی۔ اس میں شک نہیں جو تحقیقات و انکشافات سینکڑوں سال کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہیں وہ نہایت اہم اور قابلِ فخر ہیں، مگر اب بھی صحیفۂ قدرت کے بیشمار رازِ سربستہ ہیں جو سرِ دست وہم و قیاس و گمان سے بالاتر ہیں، اور قدرت کی ضعیف ترین ہستی (جراثیم) کی ذات اب بھی مزید تشریح کی مستحق و محتاج ہے۔ بہرحال اب تک جو کچھ بھی معلوم ہوا ہے اُس کی سرگذشت کا اعادہ خالی از دلچسپی

نہ ہوگا، اور کیا عجب کہ ہمارے شوقِ تحقیق و تفتیش کو تیز تر کردے:۔

موالیدِ ثلاثہ کے دو خاص شعبے، حیوانات[1] اور نباتات[2] سے مختص ہیں۔ ان ہر دو کے افراد، حیات و ممات کی خاصیت سے متصف ہیں، اور علم الحیات (بیالوجی) کی رُو سے، بہ لحاظ مدارج ارتقاء، مختلف زینوں اور درجوں میں منقسم ہیں۔ ہر ایک کا ارتقاء، اسفل ترین زینۂ حیات سے شروع ہوکر، بہ مدارجِ مختلفہ منازلِ ترقی طے کرکے، اعلےٰ ترین درجے تک جا پہنچتا ہے۔ ایک صیغہ کا نام "طبقۂ حیوانات" ہے، تو دوسرے کا "طبقۂ نباتات"

مگر "قلمروئے حیوانات" کی ابتدائی سرحد، "قلمروئے نباتات" کی ابتدائی سرحد کے ساتھ اس قدر مخلوط پیوستہ، مبہم و محو ہے کہ اِن دونوں طبقوں کے درمیان کسی امتیازی خطِ تفریق کا قائم کرنا مشکل اور قریب ناممکن کے ہے۔ ایک کا اسفل ترین زینۂ حیات دوسرے کے ابتدائی زینۂ ہستی سے کچھ ایسا غیر ممیّز اور خلط ملط ہے کہ دونوں میں کسی حدِّ فاصل کا قرار دینا محال ہے۔ محققین حیران و ششدر ہیں کہ اِس ابتدائی زینۂ ہستی کو، اس اسفل ترین اور ضعیف ترین شکلِ حیات کو، حیوانات کے طبقہ میں شمار کریں یا نباتات کے صیغہ سے مختص سمجھیں۔ الغرض ابتدائی مرحلہ میں حیوانات اور نباتات کی شکلیں کچھ ایسی مشابہ اور متحد الصفت ہیں کہ ان میں تمیز و امتیاز کی گنجائش ہی نہیں۔

اِس ابتدائی ہستی، اس اسفل ترین نوعِ حیات، کی وضع قطع، شکل و شباہت کیسی ہے اور کیا ہے؟ یہ شکلِ بسیط، یہ ہستیٔ منفرد، صرف ایک کیسۂ[1] تنہا، ایک "خلیۂ[2] واحد" ہے۔ (عربی اور مصری اصطلاح میں اسے "غریفہ" کہتے ہیں جو لفظِ "غرفہ" کا صیغۂ تصغیر ہے) جسے انگریزی اصطلاح میں "یونی سیلیولر آرگانزم" Unicellur organism یعنی "ایسی ہستی جس کا دائرۂ حیات ایک چھوٹے سے خانے، ایک ننّھے سے ذرّے، ایک تنگ و تاریک حجرے میں محدود و منحصر ہو" کہتے ہیں۔

اس کے جسم کی ساخت کیسی ہے؟ یہ سادہ ترین معمۂ ہستی محض ایک لعاب دار نقطے، نشاستہ نما لیسدار قطرے، سپیدیٔ بیضۂ مرغ کی طرح نیم منجمد نیم سیّال مادّے سے بنی ہے، جسے "پروٹوپلازم[3]" یا "مادۂ حیات" کہتے ہیں۔ اکثر اس شفاف مادۂ حیات کے وسط میں ایک ننّھا سا ذرّہ، ایک مخصوص نقطہ، زردیٔ بیضہ مرغ

---

[1] کیسہ۔ [2] خلیہ ترجمہ ہے "سیل" (Cell) کا۔ "غریفہ" اس کا عربی مترادف ہے۔ [3] Protoplasm

کی طرح جسمِ خلیہ میں حصۂ یکتا، دکھائی دیتا ہے جو بمنزلہ اُس کے دل یا جان کے ہے اور جسے نیوکلیئس[1] یا "جوہرِ حیات" کہتے ہیں۔ مزید غور سے دیکھیں تو مادۂ حیات کے گرد ایک کرخت ساخت کا غلاف دکھائی دیگا جو اِس ننھی سی ہستی کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ "غلافِ کیسہ" یا "غشائے خلیہ" ہے جسے انگریزی محقق "سیل وال"[2] کہتے ہیں۔

یہ ہے اس ننھی سی جان کی ہستی اور تمام کائنات!! اسی سادہ اور مختصر سامان کے ساتھ یہ تمام افعالِ حیات (کھانا، پینا، سانس لینا، فضلات کا خارج کرنا، چلنا پھرنا، بڑھنا گھٹنا، افزائشِ نسل وغیرہ وغیرہ) اپنے مختصر بل بوتے پر نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتی ہے اور جب تک زمانہ اور حالات اس کے موافق ہوتے ہیں، زندہ رہتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ ان پیچیدہ افعال کے لئے اس کے حباب آسا جسم میں مخصوص اعضاء (اعشاء) نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی صانع قدرت کی حکمت کاملہ کو دیکھو یہ ذرہ بمقدار کیا ہے اور کیا سے کیا کر گذرتی ہے!!!

اس ضعیف اور "مبہم الذات" ہستی کی تحقیقِ ذات و ماہیت میں بڑے بڑے محقق حیران ہیں کہ اسے کس قلمرو، کس سرزمین، کس طبقہ، کا باشندہ خیال کریں۔ آیا یہ "حیوانات" میں سے ہے یا "نباتات" میں سے؟ اس کے خواص وصفات، بایں ہمہ ضعیف البنیانی، دیکھو اور غور کرو تو محیّر العقول پاؤ گے!! سینکڑوں سال تک تو ہماری کوتاہ نظری اسے دیکھ ہی نہیں سکی، مگر آلاتِ خُردبین اور شیشۂ کلاں نما کی ایجاد نے بالآخر ہمیں اس کی ذات کا ایمان اور اس کے خواص کا ایقان نصیب کیا۔ ہم دیکھتے ہیں اور دیکھکر حیران اور قاصر الفہم ہیں، ہماری عقل چکرّ میں ہے۔ اس خلیۂ واحد میں غذا اخذ کرنے کی قابلیت ہے، اس کا عملِ تنفس برابر جاری ہے، عرق و رطوبات کی تراوش اور ریزش اس کے نظامِ جسم میں موجود ہے، فضلات اور سیّات کے اخراج کی اس میں طاقت ہے، یہ نقل وحرکت سے معرا نہیں، افزائشِ نسل اور تولید و تنسیخ اس کے بقائے نسل میں عامل ہے، یہ مخصوص ومتفرق حالات واسباب سے متاثر ہونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اسفل ترین زینۂ حیات سے مدارج ومراحلِ ارتقاطے کر کے ایسے ممتاز اور قابلِ تمیز زینۂ حیات کی طرف رُخ کرتی ہے جس کی شناخت وشبیہ میں غلطی یا ابہام کا شائبہ نہیں!!!

---

[1] Nucleus

[2] Cell-wall

مبتدئی طب وعلم الجراثیم کے لئے اِن خلیات واحد میں سے دو مخصوص خاندان قابلِ غور و توجہ ہیں اور وہ یہ ہیں:-

(۱) "ٹبیک ٹی ریا" (یہ صیغۂ جمع ہے جس کا واحد ٹبیکٹیریئم ہے)۔ "جراثیم" ماہرین کے نزدیک خلیۂ واحد کی یہ قسم "طبقۂ نباتی" سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ اس میں وہ خواصِ مخصوصہ موجود ہیں جو نباتی دُنیا کا مابۂ امتیاز ہیں۔ مثلاً ان کا "مادۂ حیات" (پروٹوپلازم) یکساں اور غیر متفرق ساخت کا ہے۔ اکثر ان کے گرد ایک کرخت غلافِ کیسہ یا غشائے خلیہ محیط ہوتی ہے جو سے لیُولوز" (......؟) سے بنی ہُوئی ہوتی ہے، ان میں حیوانی مرکبات کی تفرید و تجزیہ، اور تقسیم و تحلیل کا (مفرد اجزا میں توڑنے کا) خاصہ ہوتا ہے، اور یہ بھی خاصہ ہے کہ حیوانی مفرد و بسیط اجزا کو اشتقاق و ترکیب کے عمل سے مرکب بنادیں

(۲)۔ پروٹوزوا۔ یعنی ابتدائی حیوانات اِن خلیّاتِ منفرد کو حیوانی دنیا میں بدیں وجہ شامل کیا گیا ہے کہ ان میں ارکانِ قلمروئے حیوانی کے بعض مخصوص خواص موجود ہیں، خاصکر وہ ممتاز اور مابۂ امتیاز خاصہ جسے انگریزی اصطلاح میں "مے ٹابولزم" ( ) کہتے ہیں۔

(نوٹ)۔ "مے ٹابولزم" جسمِ حیوانی کی تبدلات کیمیاوی کے اُس اصلِ اصول عمل کا نام ہے۔ جو نظام بدن میں ایک طرف تو انجذاب و اخذِ تغذیہ کے لئے، اور دوسری طرف اخراجِ فضلات و دفعیۂ سمیاتِ فاسدہ کے لئے، لگاتار اور مسلسل جاری اور عامل ہے۔ یہ بحث "منافع الاعضا" کا مخصوص موضوع ہے اور نہایت دلچسپ مگر طول طلب ہے، لہذا یہاں صرف ضمناً تذکرہ کیا گیا ہے)

"عالمِ حیوانی" اور "عالمِ نباتی" کی اس ابتدائی مگر قدرے قابلِ تفریق و امتیاز تقسیم زرینۂ ابتدائی کے بعد، اب آگے چل کر دیکھئے کہ ان دونوں کے مخصوص خواص وصفات خود حضرت انسان کی زندگی میں، اور انسان کی رچی ہوئی دُنیائے اسباب میں کیا کیا محیّر العقول اعجاز کاریاں اور سحر سازیاں کر گذرتے ہیں اور یہ ننھی سی ضعیف الجثہ ہستیاں جن کو نگاہ انسانی بغیر نہایت تیز اور طاقت دار شیشۂ کلاں نما کی وساطت کے دیکھنے تک سے عاجز و قاصر ہے! کن کن حیرت انگیز اور اہم کارناموں کو انجام دیتی ہیں!!

جراثیم کی حیرت انگیز زندگی کی تفصیل تو بہت طویل اور دقت طلب ہے۔ اس کا بیان آگے

موقعۂ مناسب پر آئیگا، مگر آئیے! دیکھیں خود ان کی دریافت، شناخت و تحقیق میں انسان اور بنی نوع انسان نے سینکڑوں سال تک کیا کیا صحرا نوردی کی، اور کس طرح اور کیونکر اس علم کے بحرِ ذخار میں مختلف محققانِ حق پسند نے غوطہ زنی کی ہے۔ طلبِ علم کی یہ تاریخ درحقیقت انسان کے دماغی ارتقاء اور ذہنی رفعت کی سرگذشت ہے اور یہ سرگذشت نہایت معنی خیز اور حوصلہ افزا ہے:۔

یوں تو زمانۂ قدیم سے امراض اور جراثیم کا تعلق اور رشتہ اہلِ دُنیا نے ایک ذہنی عقیدہ کے طور پر مان لیا تھا۔ یوروپ کے محققینِ قدیم جراثیم کی ہستی کے معتقد تھے۔ خود ہمارے برادرانِ وطن کے ہنود کے آبا و اجداد بیدوں جیسی متبرک و مقدس کتب میں جراثیم کا اعتراف اس وقت کر چکے تھے جب ساری دُنیا ظلمت کدۂ جہالت تھی۔ حضرت بودھ کے حواری، جینی مذہب کے اصولِ تطہیر کے ساتھ ساتھ، اَن دیکھی ننھی ہستیوں کی حفاظتِ جان کے لئے، مُنہ اور ناک پر باریک کپڑے ہزار ہا سال پیشتر سے باندھتے چلے آئے ہیں، کھانے اور پانی کو چھاننے کے مذہبی عمل عملاً کرتے رہے اور کرتے ہیں۔ یہ سب احتیاط اسی عقیدہ پر مبنی تھی کہ ہوا اور پانی میں دراصل جراثیم جیسی ننھی ہستیاں ہیں جن کی جان بچانا ہر رحمدل انسان کا فرض ہے اور جن کی غلاظت سے بچنا تطہیرِ جسم اور تصفیۂ نفس کے لئے ضروری ہے۔

یہ سب کچھ عقیدہ کی بنا پر تھا۔ مگر چونکہ یہ ننھی ہستیاں ہماری انتہائی نظر اور آخری حدِ نگاہ سے ہزار ہا گونہ چھوٹی اور باریک تھیں، ان کی شکل و شباہت کا دیکھنا، ان کے قد و قامت کو ناپنا اور جانچنا ہزار ہا سال تک انسانی قدرت سے باہر رہا۔ بایں ہمہ حضرتِ انسان جیسی منچلی مخلوق کو کب چین تھا۔ انکی عقل و دانش اور ذہنِ رسا نے بالآخر شیشۂ کلاں نما اور آلاتِ خرد بین کی ایجاد و اختراع سے کمیٔ نظر کا مشکل مرحلہ طے کر ہی لیا۔ اُن ذہنی عقاید اور عقلیہ نتائج کی، جو جراثیم کی ہستی کے متعلق رائج تھے، اب مشاہدۂ عینی سے تصدیق و تطبیق ہونے لگی۔ سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک مسیحی المذہب پیشوا، کرچر (Kircher) نامی نے ۱۶۵۹ء میں اور ایک ڈچ حلّہ فروش لیُووَن ہوک (Leeuwenhoek) نے ۱۶۷۵ء میں جراثیم کا چشم دید مشاہدہ کیا!! مشاہدہ کے بعد ان کا تفصیلی بیان، ان کا حلیہ اور شکل و شباہت، اہلِ دُنیا کے سامنے پیش کی۔ اس مشاہدہ نے اُن قدیمی قیاساتِ عقل اور عقاید ذہنی و مذہبی کی پوری تصدیق کر دی جو زمانۂ قدیم سے نسلاً بعد نسلٍ رائج تھے۔ اِن دونوں نے جو کچھ مشاہدہ کیا وہ

اُن جراثیمی اشکال سے مشابہ تھا جو آج ہم یقین کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں اور جن کی ہستی پر اہلِ علم ایمان کامل رکھتے ہیں۔

"کرچر" اور "لیُووِن ہوک" کے بعد آنے والی نسلوں نے جراثیم کی تحقیق و تقسیم، اور اُن کی ماہیت اور خوارق عادات و خواص کے متعلق نئی نئی تفتیش و حقایق کا اضافہ کئی صدیوں تک کیا، جس کی تشریح و تفصیل کے لئے دفترِ ضخیم کی ضرورت ہے۔ ہم مجملاً یہاں پیش کرسکتے ہیں۔

لیُووِن ہوک کے بعد "نلر" اور "اھرن برگ" نے قیمتی تحقیقات کیں جس میں سے بعض مصدقات تو آج تک مانے جاتے ہیں۔ سترھویں صدی عیسوی میں، جیساکہ ہم اوپر بتاچکے ہیں، چھُوت اور متعدی امراض کے ایک مریض سے دوسرے تک پہنچنے کا یقین تو بہت عام ہوچکا تھا۔ خود ارسطو جیسا حکیم دانا اور موجدِ فلسفۂ طب و حکمت، چھُوت اور "چھُوت دار" امراض کا قائل ہوچکا تھا۔ ارسطو کی فلسفیات اور تعلیمات کا گہرا اثر زمانۂ وسطیٰ کے حکما و اطباء پر ہوچکا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۵۴۶ء میں "فراکاسٹر" نے امراضِ متعدیہ کی دو قسمیں بھی بیان کردی تھیں۔ یعنے (۱) ایسے امراض جو ایک مریض کی چھُوت اور قربت و اتصال کے ذریعہ (شخصے بہ شخصے) دوسرے تندرست شخص کو مریض بنا دیتے ہیں، اور (۲) وہ امراض جو بغیر قربت شخصی کے یعنے بالواسطہ اپنا زہریلا اثر (جراثیم) مریض کے جسم سے بہ وسائل دیگر (جنکی ماہیت و تشریحِ عمل اُس وقت تک آئینہ نہ تھی) دوسرے شخص تک پہنچا کر اُسے نشانۂ مرض کرسکتے ہیں۔

اِس قسم کے مروجہ اور مسلمہ نظریات و معقولات کی بنا پر اٹھارھویں صدی عیسوی میں امراضِ متعدی کی اشاعت و توسیع کا باعث عام طور پر جراثیم کو تسلیم کرلیا گیا تھا، اور سب کو یقین ہو گیا۔ کہ لیُووِن ہوک اور اُس کے حواریوں کی تحقیقات صحیح و درست تھیں۔ ۱۸۳۷ء میں "شوان" نامی ایک ماہرِ علم الاشجار و باغبانی نے ثابت کر دکھایا کہ خمیر اُٹھنے والی اشیاء میں مادۂ تخمیر دراصل چند ننھی ہستیاں ہیں جو حقیقتاً اِبتدائی طبقۂ نباتات سے متعلق ہیں اور جنہیں "امیسٹ" جراثیمِ اختمار" کہتے ہیں۔ ان جراثیم اختمار کے اثر سے شکر، شراب، اور دیگر نشاستہ آمیز اشیاء میں خمیر اُٹھتا ہے اور خمیر کے عمل میں چند تبدلاتِ کیمیادی واقع ہوتے ہیں جو صرف جراثیم کے اثر سے نمایاں ہوسکتے ہیں۔

"عملِ اختمار" کے متعلق شوان کے بعد مشہورِ زمانہ محقق فرانسیسی، علامۂ پاسچور (Pasteur) نے نہایت مفید اور عالمانہ تحقیق کی بنیاد ڈالی۔ اِس کے بعد فوراً ہی انگریزی محققِ جراحی، لارڈ لسٹر

(Listerلسٹر) نے زخموں کی تطہیر اور اعمالِ جراحیات میں ترکیبِ تصفیہ و تطہیر اور جرم کش دوائیوں سے تخفیفِ سمیتِ جراثیمی کے متعلق اصول کی تدوین و تحقیق کرکے جدید علمِ جراحی کی بنیاد ڈالی۔

اب تو تحقیق و تفتیش کے جوش میں سینکڑوں محقق میدانِ عمل و تجربہ میں کود پڑے اور اپنے اپنے خیالات و نظریات کی رو پر علم الامراض اور علم الجراثیم کے سیلاب روز افزوں کو کھینچتے رہے۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کی تحقیق بلا استثناء و نقد و جرح قابلِ وثوق نہیں ہو سکتی تھی، مگر پھر بھی ان سب کی مجتمعہ جد وجہد نے دائرہ علوم کو وسیع تر اور روشن کردیا اور قطرہ قطرہ مل کر دریا بہنے لگا۔ سنہ ۱۸۵۵ء میں "پولینڈر" نے مرض "انتھراکس"[1] (Anthrax - - - - - -) کے مخصوص جراثیم دریافت کرلئے۔ سنہ ۱۸۶۸ء میں "اوبر مائیر" نے "رِی لاپ سنگ فیور" (بخار مکررہ "قحطی بخار" یا "ہفت روزہ بخار" جو ایک ایک ہفتہ کا ناغہ کرکے دوسرے ہفتہ میں جاری رہتا ہے، پھر ایک ہفتہ کے وقفہ کے بعد دوسرے ہفتہ میں موجود رہتا ہے) کے "جراثیمِ پیچان" دریافت کئے۔ رنڈ فلیش (Rindfleisch)، ریک لنگ ہاؤسن (Recklinghausen)، اور وال ڈیئر (waldeyer) نے پھوڑے اور خراج میں جراثیمی اجسام ڈھونڈھ نکالے۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں کلیب (Klebs) نے پیپ اور ریم کے اندر جراثیم دیکھ لئے۔

ابتک جراثیم کو مصنوعی طور سے مختلف "اعمال کشاورزی" (Cultural methods) کے ذریعہ "کشت" (culture) لگا کر اوگانے اور پیدا کرنے کے صحیح اور متیقن طریقے نامعلوم تھے، اور جراثیم کو مخصوص رنگوں اور کیمیاوی مرکبات سے رنگنے (staining) کا پورا پورا علم بھی نہ تھا، اسی وجہ سے رنگوں سے جراثیم کو نمایاں و متفرق کرنیکا آلہ بھی دستیاب نہ تھا۔ محقق "بِل راتھ" Billroth) پیپ میں جراثیم کی موجودگی کا تو قائل تھا مگر اُسے اسکے ماننے میں تامل تھا کہ کسی مخصوص قسم و صورت کے جراثیم ہی پیپ پیدا کرسکتے ہیں بِل راتھ کے اس تامل و اختلاف نے علم الجراثیم کو نہایت گرانبہا فائدہ پہنچایا اور جلد ہی جراثیم کو مصنوعی کشاورزی کے ذریعہ کشت لگا کر اوگانے کے لئے مخصوص متفرق "سیال و عروق کے وسائل" (media) اور اُن کو رنگوں کے ذریعہ رنگنے کا اور نمایاں کرنے" staining کے خاص خاص طریقے دریافت کرنیکی کامیاب کوششیں ہونے لگیں۔ چنانچہ مشہور آفاق محقق علم الجراثیم کاخ (Koch) نے اپنے وہ مخصوص مصدقات

---

[1] انتھراکس حیوانات میں ایک مرض ہوتا ہے۔

تجربات و اصول شائع کئے جن کی بنا پر علم الجراثیم ایک مستقل اور منضبط فن کی صورت میں قائم ہوگیا۔ جراثیم کو تغذیہ پہنچانے والے خشک "وسائل پرورش" (media) دریافت ہوئے، جن کی مدد سے مختلف اقسام کے جراثیم کو علیحدہ کرنے، چھانٹنے اور شناخت کرنیکا گُر ہاتھ آگیا اور جراثیمی زندگی کی ماہیت اور اصلیت روشن ہونے لگی۔ اسی زمانہ میں "وی گرٹ" (Weigert) کاخ (Koch) اور اہرلک" (Ehrlich) جیسے محققینِ فن نے "اینی لین[1]" (Aniline) کے رنگوں کی تحقیق و دریافت سے جراثیم کو رنگنے اور پہچاننے کے اصول مرتب کئے۔ ان رنگوں کے ذریعہ جراثیم کی شکل و صورت، ماہیت و ساخت، باریک بناوٹ اور ریشوں وغیرہ وغیرہ کی کیفیت معلوم ہونے لگی۔

اب تو یہ صورتِ حال ہوگئی کہ نئے نئے معلومات کے دریا رواں ہوگئے، اور کاخ وغیرہ کی تحقیقات کی وجہ سے خزائنِ علوم کے راستے روشن و منور ہوگئے۔ ۱۸۸۰ء میں "جراثیم تپ محرقہ" (Typhoid Bacillus) "جراثیم ذات الریہ" (Pneumococci) اور "جراثیم ہیضہ مرغ" (Fowl cholera Bacillus) دریافت ہوگئے، اور ۱۸۸۲ء میں "جراثیم تپ دق و خنازیر" (Tubercle Bacilli) دریافت کئے گئے۔ یہ اکتشافات ایسے بلند پایۂ ہوئے کہ پندرہ سال سے کم کے عرصے میں یکے بعد دیگرے بہت سے دوسرے متعدی امراض کے جراثیم مسبب دریافت ہوگئے۔

اسبابِ مرض (جراثیم مسبب) کی تحقیقات کے ساتھ ساتھ اب ایک اور ایسے نئے اور نہایت مفید موضوع کی طرف تجسس و تحقیق کی نگاہیں منتقل ہوگئیں، جو آگے چل کر ایک مستقل صیغۂ فن ثابت ہوگیا اور جسے آجکل ہم "علم مناعت[2]"، یا "اعفاء" کے نام سے نامزد کرتے ہیں۔ اکثر حیوانات اور بنی نوعِ انسان میں بعض حالات میں امراضِ متعدیہ کے حملوں سے بچنے کی ایک قسم کی مخالف و مقابل، قوتِ مدافعتِ مرض (مناعت) پیدا ہو جاتی ہے، جس کے اثر سے حفظِ ماتقدم حاصل ہوجاتا ہے، اس عملِ مناعت و امنیت کے متعلق ابتداءً علامۂ پاسچیور نے غور و تحقیقات کی بنا ڈالی تھی۔ اب جب کہ مختلف امراض کے جراثیم کی تخصیص و تحقیق ایک

---

[1] "اینی لین" کے رنگ اُس خاص گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو نیل، نوبانی مرکبات (بینزال) اور ڈامر (کول ٹار) وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں بذریعۂ اعمال تجزیۂ و تفرید و ترکیب کے۔

[2] "مناعت" "امیونٹی" (Immunity) کا ترجمہ ہے۔

حد تک متیقن ہو چکی، تو اس طرف توجہ ہونے لگی کہ مخصوص جراثیم کے مقابلہ اور تحفظ ماتقدم کے لئے مخصوص مناعت و امنیتِ مخصوصہ کس طرح اور کیونکر حاصل کیجائے اور اس کو کس طرح جانچا جائے ؟

الغرض مسئلہ جراثیم کے متعلق تحقیقات کا معیارِ نظر، ابتداءً تو جراثیم کی ذاتیات، ظاہری شکل و صفات کی طرف رہا، جس کا موضوع صرف "علم الجراثیم" تک محدود رہا، مگر جب یہ عقدہ ایک حد تک حل ہو گیا تو تحقیقات کے رُخ میں وسعت ہوئی اور یہ کوششیں ہونے لگیں کہ علم الجراثیم کا اثر اور تعلق "علم الحیات" اور "علم الحیوانات" (بیالوجی) کے موضوعِ عام کے ساتھ کس حد تک اور کس نوع پر ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایجاداتِ متعلقہ علاج مائیت الدم اور مصل" (Serum therapy) کی تدوین و تطبیق نے علم الجراثیم کو نہ صرف "علم تشخیص[1]" اور "علم العلاج[2]" سے پیوستہ کر دیا، بلکہ اُس کا رشتہ "علمِ منافع الاعضا[3]" اور "علم الامراض[4]" سے بھی مضبوط و منسلک کر دیا۔

"چھوت" جو ابتک ایک دشمنِ نقاب پوش کے لباس میں روپوش تھی، اب اپنے صحیح اور درست خد و خال میں نظر آنے لگی۔ اسبابِ امراض اور مسبّبِ امراضِ جراثیم کے متعلق انکشافات ایسے ہو گئے جن کی مدد سے چھوت جیسے رازِ سربستہ کی حقیقت فاش ہو گئی۔ حفظانِ صحت، صحتِ عامہ۔ اور صحتِ شخصی کے مسائل و اصول منفعت بخش کی باقاعدہ ترتیب و تکمیل کے وسائل صحیح معیار پر قائم ہو گئے۔ علمِ جراحی جو زمانۂ وسطیٰ میں بغیر جرم کُش مطہرات و مصفیاتِ سمیت کے ایک ناقص اور قلیل المنفعت فن تھا، اب جراثیم کی جدید تحقیقات کی روشنی میں ازسرِ نو آراستہ و پیراستہ ہو گیا اور اُس کی مسلّمہ منفعتِ عام اور یقینی نتائج نے چار دانگِ عالم میں "جدید جراحیات" کا لوہا منوا دیا۔

"علم الجراثیم" کے فیض رسان منافع صرف علاج الامراض اور طبّیات تک ہی محدود و منحصر نہیں رہے بلکہ اس کی منفعت بخش تجلّی نے اپنی نورانی شعاعیں دُور دُور تک پھیلا کر انسانی جد و جہد کے دوسرے بہت سے صیغوں کو تاریکی سے نکال کر روشن و درخشندہ کیا۔ علم زراعت و فلاحت میں اب جراثیم کی اہمیت و وقعت مستقل طور پر ثابت ہو چکی ہے، کیونکہ جراثیم کا تعلق، زمین کے مختلف

---

[1] علم تشخیص Diagnostic medicine. [2] علم العلاج therapeutic medicine

[3] منافع الاعضاء Physiology [4] علم الامراض Pathology

اقسام و حالات سے، اعمالِ تفرید و تجزیہ، اور تحلیلِ عفونت سے، نباتاتی امراض سے، اور کھاد کے خمیر و اختمار سے، اب بخوبی متیقن طور پر مان لیا گیا ہے۔ جراثیم اور "ایسٹ" ([illegible]) کے اعمالِ تخمیر و اختمار کے اصول پر اب تجارت و صنعت و حرفت کے بیسیوں صیغے رائج ہوگئے ہیں، شراب "بی یئر" وغیرہ بنانے کے کارخانے اور دودھ، دہی، مکھن، پنیر وغیرہ کی ڈیریاں بھی جراثیم کے دم پر قائم و جاری ہیں۔

"علم الجراثیم" کے منافعِ کثیر میں سے متذکرۂ بالا صرف "چند" مشتے "بطور نمونہ" ہیں۔ اس دلچسپ اور اہم علم کے بے شمار صیغے اور شاخیں ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق ابھی تفتیش و تحقیق کا ایک وسیع اور پُر بہار میدان کھلا ہوا ہے۔ بہت کم معلوم ہوا ہے اور بہت زیادہ معلوم کرنا باقی ہے۔ غرضکہ اس علم کا مستقبل ایک شاندار عظمت اور اُمید افزا کیفیت و دلچسپی سے لبریز ہے، جس کی کشش بنی نوعِ انسان کو سچی کوشش، حقیقی جد و جہد، اور خدمتِ خلق اللہ، کی دعوتِ عام دے رہی ہے!

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

فرزندانِ ہند! جاگو! اُٹھو! اور لبیک کہو!!

"برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار۔

ہر ورق دفتریست، معرفتِ کردگار"۔!!!

محمد عثمان خان۔ ایل۔ ایم۔ ایس



نوٹ:۔ مندرجہ بالا صفحات میں، پروفیسر ہس ([illegible]) اور پروفیسر فلنر۔ ([illegible]) مشہور جرمن امریکی استادانِ فن کی کتاب کے ابتدائی مقالہ سے جا بجا اخذِ مواد کیا گیا ہے، جس کے متعلق اظہارِ شکریہ و سپاس ہمارا فرض ہے۔

اسرارِ خودی

اُدبا و حکماءِ مغرب کی نظر میں

زمانۂ حال کے فلسفہ مذہب۔ شاعری اور عام علم ادب میں علامۂ اقبال کا کیا پایہ ہے۔ یا علامۂ اقبال کے فلسفہ مذہب اور شاعری کا زمانۂ حال پر کیا اثر ہو رہا ہے اور یہ اثر اس "حال" کو کس "مستقبل" میں بدلنا چاہتا ہے؟ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات سے بصورتِ موجودہ مشرقی اقوام کے عام افراد قاصر ہیں۔ کیوں قاصر ہیں؟ اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے زمانہ کو زمانہ کے محقق کی نگاہ سے دیکھا ہو۔ مشرق و مغرب دونوں کی سیر کی ہو دونوں کے علوم و فنون۔ تمدن و معاشرت مذہب و سیاست۔ اخلاق و رجحانِ طبائع کا وسیع مطالعہ کیا ہو۔ اور پھر یہ اہلیت رکھتا ہو کہ صحیح مطالعہ کے بعد صحیح نتائج مترتب کر سکے۔ ایسے شخص کو بےچون و چرا کہنا پڑیگا۔ کہ جس طرح زوال و انحطاط کی زندگی کو صحیح "زندگی" سے کوئی نسبت نہیں۔ کوئی علاقہ نہیں۔ اسی طرح انحطاط میں بسر کرنے والے افراد کے خیالات کو صحیح یعنی "زندہ خیالات" سے کوئی نسبت اور علاقہ نہیں۔ چہ جائیکہ وہ اُن کا موازنہ کریں اور اُن کی قدر و قیمت کا پتہ لگائیں۔ اور اگر کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ "زندہ خیالات" ایک نئی اور الگ دُنیا کے خیالات تصور کئے جائیں اور اُن کی انتہائی داد جو دی جا سکے وہ حیرت و استعجاب ہو اور بس +

اقبال بھی مشرق میں پیدا ہُوا! یہ سچ ہے۔ مگر کون ہے جو ارتقاء کے کرشموں سے واقف ہو۔ علل و اسباب کی عجائب آفرینی کا مبصّر ہو اور پھر اس بات سے انکار کرے کہ قدرت کو جب کسی قوم کو نئی روح بخشنی ہوتی ہے۔ اُسے نئے "قالب میں ڈھالنا مقصود ہوتا ہے تو اُس قوم ہی سے پہلے نئی رُوح۔ نئی عقل اور نئے احساس کے افراد پیدا کئے جاتے ہیں۔ وہ افراد جن کی ہستیاں ایک عظیم الشان انقلابِ زندگی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ وہ افراد جن کے اقوال اگرچہ ابتدا میں عالم بالا کی باتیں متصور ہوتی ہیں مگر جونہی لوگ ان کی صداؤں سے مانوس ہوتے ہیں۔ اُن کی دعوت پر کان دھرتے ہیں

اُن کے خیالات وارشادات کو جذب کرتے ہیں اور اُن کے کہنے پر عمل کے لئے کمربستہ ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ وہ خود ویسا ہی سوچنا اور ویسا ہی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر نہ وہ ہستیاں رہتی ہیں۔ اور اُن کے خیالات معمولی خیالات متصور ہوتے ہیں۔ غرض فطرت کو جن اقوام میں انقلاب منظور ہوتا ہے غیر معمولی افراد بھی انہیں سے پیدا ہوتے ہیں۔

اقبال کس مضبوط فلسفہ کی بنیاد ڈال رہا ہے! ابنائے جنس کو کن مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک انسان کیا ہستی ہے۔ فرد کیا ہے؟ وہ کامل کس طرح ہو سکتا ہے۔ قوم کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ تمام دنیا ایک ہی قوم کیسے بن سکتی ہے؟ پھر اقبال کے پاک جذبات کس عالمگیر اخوت کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ اس کی باریک نگاہ تمام عالم کو کس ایک معاشرت اور ایک تمدن میں دیکھنے کی آرزومند ہے۔ اُس کا محبت بھرا دل کس مساوات کا متمنی ہے۔ وہ کس وحشت کے ساتھ دوئی سے گریزاں ہے۔ کس درد سے یکرنگی کا وارفتہ ہے؟ یہ سب ایسے حقایق ہیں کہ افراد کو افراد بننے کے لئے۔ قوموں کو ایک قوم میں ظاہر ہونے کے لئے اور دُنیا کو ایک دُنیا کہلانے کے لئے بغیر ان کی طرف رجوع کئے چارہ نہیں۔

سال گذر رہے ہیں۔ علامہ موصوف نے خدا جانے کتنے عرصہ کے فکر و تدبر اور دماغ سوزی کے بعد اپنی صحیح و اعلےٰ قوتِ فکریہ کی بدولت بنی نوع کے لئے مکمل حیاتِ فردیہ کے حصول کا نسخہ تجویز کیا۔ مثنوی اسرارِ خودی کی شکل میں یہ نسخہ چھپا اور لوگوں نے دیکھا۔ بنی نوع پر تو یہ ایک عام احسان تھا۔ مخصوص مورد اس انعام کے ہم مشرقی لوگ تھے اور پھر ان میں مختص ہم ہندوستانی جنکی زندگی اصلی انسانی زندگی سے کہیں دُور ہے۔ جن کے نفس مُردہ ہوچکے ہیں۔ جن کے قوےٰ ضعف کا شکار ہیں۔ جن کی ہمتیں سوچکی ہیں۔ جن کے دماغ پست خیالات کا گھر ہیں اور جن کی زندگی ایک طویل شیریں حالتِ نزع ہے۔ مگر افسوس نہ صرف ہم مریضوں کو بلحاظ افراد ابھی تک پوری واقفیت نہ ہُوئی کہ یہ نسخہ ہمارے ہی مرض کا علاج ہے بلکہ ہمارے مدعی نباضوں کی تشخیص اب تک یہ دریافت کرنے سے قاصر ہے کہ یہی وہ دوا ہے جو کافی وشافی ہو سکتی ہے اور ہم جو اور علاج آجتک عمل میں لا رہے ہیں وہ مریض کو اَور مریض بنانے میں ممد ہیں نہ کہ اُسے صحت و تندرستی عطا کرنے میں۔ اور نہ صرف یہ کہ قومی پیشواؤں اور مبلغوں نے اس کتاب میں نگاہ نہیں کی اور افرادِ ملت

کو مکمل افراد بنانے کے درپے نہیں ہوئے بلکہ اُدبا و شعرا جن کی نظر عام نظروں سے گہری ہونا چاہیئے اور جن کا مذاقِ سخن عام مذاقوں سے زیادہ لطیف اور زیادہ پاکیزہ ہونا ضروری ہے۔ وہ بھی بلحاظ شعر و ادب کے ابھی تک اس کی خوبیوں سے ناآشنا ہیں۔ مگر ناآشنا ہوں بھی کیوں نہ۔ ہم خود کہہ چکے ہیں کہ زوال و انحطاط کے زمانہ کے خیالات اور مذاق اس قابل نہیں ہوتے کہ اُن کی حقائق و دقائق تک رسائی ہو۔ جب ہم حقیقی زندگی ہی سے روشناس نہیں تو حقیقی ادب اور حقیقی شعر کو کیا سمجھیں گے اور ہمارے اس کتاب کی طرف ابھی تک بہت تھوڑا تامل ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔ ہم علم ادب کی انتہائی وسعتوں سے آشنا نہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ شعر سے دُنیا میں کیا کیا کام لئے جا سکتے ہیں زندہ اقوام کے اشعار میں مضامین کیسے ہوتے ہیں اور کیوں ہوتے ہیں۔ اُن کے اسلوبِ بیان میں کیا سحر ہوتا ہے۔ پھر شعریت کیا ہے اور شعریت کے کونسے اثرات زندگی بخش ہیں اور کونسے مرگ آور؟

ہمارے نقّاد مثنوی اسرار خودی کی کسی ایک خوبی کو آجتک پورے طور پر واضح نہ کر سکے۔ اس کے مطالب و معانی کو کما حقہٗ ادراک نہ کر سکے۔ یہ نہ جان سکے کہ سلسلۂ خیالات کس مرکز سے کس ربط و ضبط کے ساتھ زمین سے اُٹھا ہے اور کس قوت و اعجاز سے آسمان تک پہنچ کر تمام فضا میں بسیط ہو رہا ہے۔ بلکہ علمِ ادب کی حقیقت سے اپنے بے بہرہ ہونیکا ثبوت اس طرح دیا کہ اسرارِ خودی میں خواجہ حافظ علیہ الرحمتہ کے ادب پر جو تنقید تھی اُسے اپنی کم فہمی سے خواجہ کی بزرگی پر حملہ سمجھا۔ گویا نہ صرف ادب کو سمجھنے سے قاصر رہے بلکہ نقّاد کہلا کر تنقید کے سمجھنے سے درماندگی کا ثبوت دیا۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کس قدر علم ادب کی حقیقت سے ناآشنائی کا اظہار ہے۔ کہ اسرارِ خودی کے ادب کو جو آج مغرب کے اُدبا کو محوِ حیرت کر رہا ہے نہ سمجھنا تو درکنار ہمارے نقّاد اس میں ایک معمولی ادبی تنقید کو نہ سمجھ سکے۔ اور پھر اس پر جو ہمہ دانی کے دعوے ہیں وہ خدا ہی جانتا ہے۔

ہم پھر بھول رہے ہیں۔ ہمارا افسوس ناحق ہے اور ہمارے کلیوں کی بنا پر ناحق ہے۔ ہم اس وقت تک اسرارِ خودی کو نہ سمجھ سکتے جبتک کہ زندہ قومیں اُسے پہلے نہ سمجھ لیتیں۔ اور ہمارے سمجھانے کے لئے اس کی تشریح میں کچھ نہ کچھ لکھ نہ چکتیں۔ مثنوی مذکور کے انگلستان میں انگریزی زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد کئی مغربی ادیب اور فلسفی اور نقاد اس پر رائے زنی کر چکے ہیں۔ انہیں تنقیدوں میں ایک تنقید کا ترجمہ ہم ناظرین اور بالخصوص نقاد حضرات کے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ جان لیں

ہم اسرارِ خودی کو کیا سمجھے تھے اور "خودی" کے مالکوں نے اسرارِ خودی کو کیا سمجھا ہے۔ اس مضمون سے یہ بھی واضح ہوگا۔ کہ علم ادب کی کیا حقیقت و وسعت ہے اور اگر دنیا "آج" کی دنیا بنی ہے تو ادب ہی کے اثرات سے بنی ہے اور اگر "کل" کی دنیا بنے گی تو اسی کے کرشموں سے۔ اس تنقید میں یہ حقیقت پڑھ کر ہمارے نقادانِ ادب کی اَور بھی آنکھیں کھلیں گی کہ زندہ اقوام کے اُدبا کے نزدیک اگر کوئی مفید اور زندہ ادب کا لکھنے والا۔ مفید اور زندہ شعر کا کہنے والا۔ مفید اور زندہ فلسفہ کا سبق دینے والا اس وقت تمام دُنیا میں زندہ ادیب۔ زندہ شاعر۔ زندہ فلسفی ہے تو وہ صرف ایک اقبال ہے اور بس اور حیاتِ انسانی کا اصل راز اگر کسی نے آج تک سمجھا ہے تو اسی نے۔

فاضل نقاد نے جس خوبی اور قابلیت سے اسرارِ خودی کے اصلی جوہر کو ہمیں دکھایا ہے ہم فی الحقیقت اس کی داد نہیں دے سکتے۔ دنیا کے دو مشہور ترین فلسفی اُدبا (نٹشا اور وٹمین) سے جن کا سکّہ موجودہ وقت میں تمام اہلِ مغرب پر ہے اقبال کا مقابلہ کرکے دکھا دیا ہے کہ وہ دونوں حضرات مدت العمر میں انسان کے متعلق جس نکتہ کو نہ سمجھ سکے۔ اُسے اقبال کی حقائق شناسی نے کس خوبی اور سادگی سے دُنیا کا صحیح مطلحِ نظر بنا کر دُنیا کے سامنے رکھدیا ہے۔

اس تنقید کا لکھنے والا امریکہ کا مشہور فاضل۔ فلسفی۔ ادیب اور نقاد مسٹر ہربرٹ ریڈ ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے اور سمجھنے کا لُطف تو اصل زبان انگریزی ہی میں ہے۔ ترجمہ اُس مفہوم کو کیا ادا کریگا۔ جو مضمون نگار کے انگریزی الفاظ میں مضمر ہے۔ یہ مضمون امریکہ کے اخبار نیوایج (New age) مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء میں چھپا تھا۔

وٹمین امریکہ کا سب سے بڑا فلسفی شاعر ہے۔ اُس کے کلام پر امریکہ کے ایک نقاد مسٹر لارنس نے اپنی تنقید شائع کی تھی۔ مسٹر ہربرٹ ریڈ یہ شکایت کرتا ہُوا کہ صحیح تنقید اب ادبی دنیا میں مفقود ہے۔ اس تنقید پہ نظرِ ثانی کرتا ہے اس کی داد دینے کے بعد خود بتاتا ہے کہ وٹمین کے کلام میں کیا کیا خصوصی کمالات تھے۔ پھر اس کے کلام کے بعض نقائص پر جو مسٹر لارنس نے لکھے ہیں۔ بحث کا آغاز کرتے اس طرح قلم کو جولانی دیتا ہے:۔

"مسٹر لارنس نے جس خوبی کے ساتھ "وٹمین" کی متذکرہ بالا حقیقت آفرینی کو بے نقاب کیا ہے بعینہ ویسی تدقیق و تنقید سے اُس "شاعرانہ کذب" کے عنصر کو بھی جو اُس کے کلام میں پایا جاتا ہے

بالتشریح واضح کر دیا ہے۔ کیونکہ "وٹمین" باوجود اپنی تمام عظمت و علوِ مرتبت کے "کامل شاعر" نہ تھا۔ مگر اُس کے کلام کی تصویر کے اُس رُخ پر چنداں اصرار کی ضرورت نہیں۔ جہانتک اس "شاعرانہ کذب" تخیئل کی محدود جولانی اور تعینّاتِ عالم سے چشم پوشی کے مسئلہ سے تعلق ہے اُس کے کلام سے عیاں ہے اور بالکل اظہرمن الشمس۔ اُس کی شاعری کے اَور بھی پہلو ہیں۔ ضبطِ تخیل اثباتِ تعینات اور یہ وہ پہلو ہیں جن کے سامنے لطیف اندرونی احساس کی بوقلمونی ہیچ نظر آتی ہے۔ اور یہی پہلو ہیں جو زیادہ مستحقِ توجہ ہیں۔ ان معنوں میں "وٹمین" کی استعدادِ نادرہ کی بہترین توضیح اور اُس کے فن کی مکمل ترین تعریف خود "وٹمین" کے قلم سے حسنِ نگارش پا چکی ہے۔ یہ "وٹمین" کی کتاب "ڈیموکریٹک وسٹا" (مناظرِ جمہوریہ) کے صفحات میں پوشیدہ ایک "فٹ نوٹ" ہے جو اس قدر جلی نہیں کہ قاری کی توجہ کو خود بخود اپنی طرف مبذول کرلے۔ اِس لئے مجھے حق ہے کہ میں اُسے اس مقام پر نقل کردوں:۔

ادبی صناعت و بداعت کی معنی آفرینی کا منتہائے عروج۔ اُس کا حاصل۔ اُس کی حظ وانبساط کی انتہائی وسعتیں جو روح انسانی کی بلند پروازی کے لئے ممکن ہو سکتی ہیں سب "مابعدالطبعیات" کے حقائق و لطائف ہیں۔ عالمِ روحانی کے غوامض واسرار۔ خود رُوح۔ اور ہمارے تشخیص ذاتی کی بقا و دوام کا مسئلہ بھی اسی میں شامل ہے۔ تمام قرون میں نفسِ انسانی کی رسائی اس منزل تک ہوتی رہی ہے اور آئندہ ہوتی رہیگی۔ کم سے کم اس نکتہ میں تو بلا امتیازِ نسل و زمانہ تمام بنی نوع ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں بلکہ اس کی تحسین و توصیف میں بھی متقدمین و متاخرین تمام کے تمام ہم آہنگ ہیں انسانی نگاہ میں وہی مصنفین محبوب ترین ہیں جو اس میدان کے شہسوار ہیں اور اگرچہ اُن کا صلہ چاندی سونے کے چند سکوں کے سوا اور کچھ نہ ہو اور اگر بالآخر کچھ ہو تو صرف یہ کہ شہرت اُن کے قدم سے اور عظمت و فضیلت کا تاج ان کے سر پر رکھا جائے۔ مگر بایں ہمہ ابتذال اُن کے رشحاتِ قلم (جن میں اگرچہ ازروئے حسنِ بیان سُقم بھی ہوں) وہ انمول موتی ہیں جن کو دُنیا جان سے بڑھ کر عزیز و محفوظ رکھیگی۔

ادب و شاعری کا منتہٰے ہمیشہ سے مذہب رہا ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ وید۔ ژند۔ اوستا۔ تالمود زبور۔ مسیحؑ اور اُس کے تلامذہ کی اناجیل۔ تصانیفِ افلاطون۔ قرآن۔ علیٰ ہذا القیاس ہمارے زمانہ میں سویڈنبرگ کی تحریریں۔ پھر بینتھم۔ کانٹ۔ اور ہیگل کے گرانبہا افکار۔ سب ایسے اعلیٰ پایۂ

کے ادبی ذخائر ہیں جو علمِ ادب کی حقیقی بلندیوں اور عروج کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں جس طرح دُنیا کے عظیم الشان پہاڑ سطحِ دُنیا سے بلند و نمایاں سر بفلک نظر آتے ہیں۔ پھر ان کے دوش بدوش شعرا کے وہ نتائجِ طبع بھی ہمیشہ حرزِ جاں بنے رہینگے جن میں اشخاص و واقعات۔ جذباتِ بہیمیہ انسانی اور مناظرِ عالمِ مادی کے متعلق رانگنیاں الاپنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے کلام میں مذہبی انداز اور شعورِ اسرار کے علاوہ مستقبل۔ غیب۔ شہود۔ مشیئت۔ غائتِ تکوینِ عالم وغیرہ وغیرہ مسائل پر حصولِ اطلاع کے مضامین کو بھی کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بلکہ بالواسطہ ہر ادائے بیان میں ان نکات کو ادا کر جاتے ہیں۔

مگر یہ علمِ ادب کے نقد و ماہیت کی بجائے اُس کی وسعتِ استعدادی کی تعریف ہے۔ جو "ٹمین" نے کی ہے۔ یعنی یہ ادب کا "کم" ہے نہ کہ اُس کا "کیف"۔ یہ تعریف "اندازِ بیان" و "حسنِ ادا" کے مسئلہ کو حل نہیں کرتی بلکہ اپنے الفاظ کی سادگی میں اسے پامال کر جاتی ہے (یہ گرامی تصانیف جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ علمِ حسن الاعیان کے نظریہ سے خواہ کتنی سقیم ہوں اپنی ذاتی خوبی میں ہمیشہ پاک و بے عیب ہیں۔ اُن کی طاقتِ فکر کی آتش سیری دشتِ خیالات میں نیا جادو پیدا کرتی ہے۔ اور قلوبِ اِنسانی کو پگھلا کر تمام عالم کو نئی شکل میں متشکل کر جاتی ہے) مگر اِن توضیحات کے زیرِ شرائط "ٹمین" کا مذکورہ صدر "منتہے" وہ صحیح ونقد "منتہے" ہے جو "عمل" و "بلا واسطہ افادہ" کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہر طرح موزون و مناسب ہے۔ آج اس مقام اور اس زمانہ میں اس "منتہے" کو نگاہ رکھتے ہوئے میرے ذہن میں اگر کسی زندہ شاعر کا خیال آ سکتا ہے جو اس میزان میں پورا اُتر سکتا ہے تو وہ ایک ہی ہے اور وہ بھی لازمی طور پر نہ ہمارا ہم قوم اور نہ ہمارا ہم مذہب۔ میری مراد اقبال سے ہے۔ جس کی نظم "اسرارِ خودی" ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ڈاکٹر رینلڈ نکلسن کے قلم سے اصل زبان فارسی سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر میسرز میکمیلن کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ ہمارے ہموطن متشاعر بلیّوں اور بٹیروں پر تک بندیوں سے اپنے یاروں کی ضیافتِ طبع کا سامان پیدا کر رہے تھے اور کیٹس[1] کے انداز پر پیش پا افتادہ مضامین پر طبع آزمائیوں میں مشغول تھے عین اس وقت لاہور میں یہ نظم جس کی نسبت ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس نے ہندوستان کے مُسلمان نوجوانوں کے

[1] انگریزی شاعر

خیالات میں ایک محشر برپا کردیا ہے۔ تصنیف کی گئی اور شائع کی گئی۔ ایک ہندی مسلمان[1] نے لکھا ہے کہ "اقبال ہم میں مسیح بن کر نمودار ہُوا ہے جس نے مردہ اجسام کو جنبش دے کر اُن میں حیات تازہ کی لہر دوڑا دی ہے"۔ تم پوچھو گے یہ کیا ٹوٹکا تھا جس نے نادان خریداروں کے دلوں کو موہ لیا؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ کوئی ٹوٹکا نہ تھا۔ کسی سیاسی مجذوب کی بڑ نہ تھی۔ کسی مکتی فوج کے نجات فروش کا نسخۂ نجات نہ تھا۔ بلکہ یہ اُس نظم کا اثر تھا جس کا حسنِ معنوی موجودہ فلسفہ کے تمام اہم ترین نکات و دقائق پر حاوی ہے۔ یہ اُس نکتہ آفرینی کا طلسم تھا جس نے افکار کی گوناگُونی سے وحدتِ ایمانی پیدا کردی ہے۔ یہ اس خفیقتِ ترجمانی کا سحرِ حلال تھا جس نے ایک ایسی منطق کو جو محض مدرسوں کے طلبا تک ہی محدود و مخصوص تھی ایک عالمگیر الہام کی صورت میں بدل کر عالم کے سامنے رکھدیا ہے۔

اقبال اس بات سے انکار کرتا ہے کہ اُس کے افکار نٹشا کے خیالات سے متاثر ہوئے ہیں بایں ہمہ نٹشا سے اُس کا موازنہ ناگزیر ہے نٹشا کا "فوق الانسان" اقبال کے "انسانِ کامل" سے صرف اتفاقی اوصاف میں مختلف ہے اگرچہ اول الذکر کی بنیاد اُمرا کے باطل تمدّن پر ہے اور موخر الذکر جہاں تک میرا خیال ہے اِن معنوں میں زیادہ یقینی اور مستحکم بنا پر مبنی ہے کہ اُس کی تعریف میں "منتہے" (یعنی کسی سقراط۔ کسی مسیح۔ کسی محمدؐ) کا صحبت آشنا ہونا یا اس کا از روئے پیدائش مکمل ہونا تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ اُسے فطرت کے قوائے مولّدہ کا مآل و مقصود ٹھیرایا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کے اقبال کا "انسان کامل" ارتقاءِ جمہور کا منتہے ہے۔ وہ ایک اصول ہے جو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہر انسان ایک مستتر طاقت کا مرکز ہے جس کے ممکناتِ زندگی ایک خاص طریقِ عمل سے ترقی پا سکتے ہیں۔ انسانیت کا یہ نصب العین حقیقت کے زیادہ قریب ہے اور اس لحاظ سے دشمین کے "نفسِ متوسط"[2] سے زیادہ مناسب و متشابہ ہے۔ تاہم تینوں نصب العینوں کی تہ میں ایک ہی ابتدائی خواہش یا خیال مضمر ہے۔ ان میں فرق صرف اسی قدر ہے جس قدر اُن کے دیکھنے میں پیش بینی سے کام لیا جاتا ہے۔ از روئے مذہب ان سب کی بنیاد یہ اعتقاد ہے کہ انسان ایک قوت الہیہ کی کشش و جذب سے پیدا ہوتا اور ارتقاء پاتا ہے جس کا نام "خدا" ہے۔ از روئے سائنس مفروضہ یہ ہے کہ ہیئت و اتفاقات میں ایک قوتِ مولّدہ داخل کی جاتی ہے جو شعورِ انسانی پر از خود جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور

---

[1] ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم [2] وکذالک جعلناکم امۃً وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا (قرآن)

نفسِ انسانی کے شعور و ادراک کو ہمیشہ ترقی دیتی رہتی ہے۔ ازروئے مابعد الطبیعیات یہ دونو پہلو جن میں سے ایک مذہب نے اختیار کیا ہے اور دوسرا سائنس نے۔ متحد ہیں۔ "زندگی (میں اقبال کی نظم کی تمہید سے نقل کرتا ہوں) ایک متقدم حرکتِ جذب و ہضم ہے۔ یہ اپنی پیش روی میں اپنے رستہ کی تمام رکاوٹوں کو خود اپنے اندر جذب کر کے دور کرتی جاتی ہے۔ آرزوؤں۔ اور نصب العینوں کا مسلسل پیدا کرتے رہنا اس کا اصلی جوہر ہے۔ اور اس نے اپنی حفاظت و توسیع کے لئے ایسے ایسے آلے (حواس۔ عقل۔ وغیرہ وغیرہ) ایجاد کئے ہیں یا خود اپنی ہی ذات میں سے پیدا کر لئے ہیں جو اس کے سنگہائے راہ کو جذب کرنے اور اس کے اپنے مشابہ بنانے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ زندگی کے رستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادّہ ہے۔ یا یوں کہو کہ نیچر ہے۔ تاہم نیچر اس لحاظ سے کہ وہ زندگی کی اندرونی طاقتوں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ عدم سے وجود میں آئیں اپنی ذات میں شر نہیں" لہذا زندگی ایک سعیِ آزادی ہے۔ اور اس سعی کا طریق "انا" کی تعلیم ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں جیسے خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بتایا تخلّقوا باخلاقِ اللّٰہ (اپنے اندر اخلاق الٰہ پیدا کرو) یہ حدیث ہمیں وٹمین کا یہ قول یاد دلاتی ہے "میں مکمل اشیا کی انتہا ہوں اور پیدا ہونے والی اشیا کا محیط"

وٹمین نے یہ بھی کہا ہے۔ کہ "میں خدا کو مردوں اور عورتوں کے چہروں میں دیکھتا ہوں اور خود اپنے چہرے میں جب آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں" نٹشا نے اسی نصب العین کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "خالق اپنے ایسے اَور خالقوں کی جستجو میں رہتا ہے"۔ اور فی الحقیقت سارے کا سارا مذہب اور سارے کا سارا فلسفہ بالآخر اسی تکمیلِ خودی کے اصول میں آجمع ہوتا ہے ازروئے نفسیات بھی انسان کسی ایسی اُلوہیّت کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ جس کا کہ وہ خود مظہر نہیں اور معلوم بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ امر ایک صداقتِ طبعیہ ہے۔ اقبال نے اس صداقت کا نٹشا۔ یا وٹمین کی نسبت زیادہ وثوق سے ادراک کیا ہے۔ وٹمین کا "نفسِ متوسط" مبہم و غیر مشخص ہے اور نہ اس قدر جامع ہی ہے جیسا کہ ایک منتہے کو ہونا ضروری ہے۔ نٹشا کا "فوق الانسان" صحبتِ انسان سے گریزاں اور نفور ہے۔ اس لئے جبلّتہً باطل ہے۔ مگر اقبال کا "انسان کامل" "نفسِ متوسط" ہے اور جلیسِ ہمدرد اور اقبال کا "نفسِ متوسط" "انسانِ کامل"

گویا ؎ "خود صنم ہے خود پرستارِ صنم"

با خودے بشنید ز افکارِ خودی
نعرہ زد از گنجِ "اسرارِ خودی"
وانگشتہ بر منِ بے خود ہنوز
سرے از "اسرار" و رمزے از "رموز"

(چوہدری محمد حسین ایم اے)

اقبال

درسِ ماضی از کتابِ حال گیر
ساغر از خمخانۂ اقبال گیر
حضرتِ اقبال آں بالغ نظر
دارد از بود و نبودِ ما خبر
ما بذوقِ سوختن کم ساختیم
بے خودی را از خودی نشناختیم
آں نواپردازِ اسرارِ ازل
شہسوارِ عرصۂ علم و عمل
بیخودی را در خودی منزل شناس
در غبارِ کاروان محمل شناس
از نوائش بزمِ یورپ در خروش
حکمتِ امریکہ او را سُفتہ گوش
نالہ ہائے آتشینِ آں حکیم
سوخت رختِ فتنۂ امید و بیم
ساخت با دلہا و بود ش ہیچ نیست
سوخت دلہا را و دودش ہیچ نیست

گرامی

چرخِ حیات

چرخِ حیات جسے بودھ دھرم کی اصطلاح میں گتی کہتے ہیں نہایت پُرمعنی نقشہ ہے جو کتبوں اور پتھروں میں کندہ پایا گیا ہے۔ جس سے عوام کے لئے اصولِ اخلاق کے تعلیم سہل اور عام فہم طریقہ سے اختیار کی گئی ہے۔

یہ چرخ ایک پہیہ ہے جس کے وسط میں تین جانوروں کی شکلیں ہوتی ہیں اور ان کے اردگرد ایک زنجیر جس کے بارہ کڑیاں ہوتی ہیں جسے ندہان بولتے ہیں۔ یہ کڑیاں باہم پیوستہ ہیں۔ اس نقشہ سے حیاتِ انسان کے پہلو دکھلائے جاتے ہیں پاپ یعنی گناہ کے جذبات بعض خصلتوں سے پیدا ہوتے ہیں یہ پہلو تمثیل سے ظاہر کئے گئے ہیں۔ اس چرخ سے یہ دکھلانا مقصود ہوتا ہے کہ انسان زندگی کے ہر پہلو پر نگاہ ڈالے۔ جن خصلتوں سے گناہ وقوع میں آتے ہیں اُنہیں دُور کرے تو اُس منزل کمال پر انسان پہنچتا ہے جسے نروان کہتے ہیں۔

اس چرخ کے وسط میں تین شکلیں ہوتی ہیں۔

اوّل۔ سانپ جس سے مراد غصہ لی گئی ہے۔

دوئم۔ سئور جس سے مراد جہالت لی گئی ہے۔

سوئم۔ فاختہ جس سے مراد خواہشِ نفسانی لی گئی ہے۔

تجربہ ثابت کرتا ہے کہ غصہ۔ جہالت۔ خواہش سے بہت گناہِ کبیرہ وقوع میں آتے ہیں اگر ان پر انسان قابو پائے تو زندگی پاک رہتی ہے۔

اس چرخِ حیات میں زنجیر کی کڑیاں حسبِ ذیل طریقہ سے ظاہر کیجاتی ہیں۔

(۱)۔ لاعلمی۔ اندھی عورت۔
(۲)۔ عمل۔ کمہار برتن بناتا ہُوا یا کوئی شخص میوہ چنتا ہُوا۔
(۳) وقوف یا آگاہی۔ بےچین بندر۔ (۴) نام وضع۔ کشتی۔
(۵) حواسِ خمسہ۔ مکان۔ (۶) مسّ۔ مرد و زن یکجا بیٹھتے ہیں
(۷)۔ حس۔ انسان کے کسی حصّہ جسم پر تیر لگا ہُوا ہے۔
(۸)۔ خواہش۔ انسان شراب پی رہا ہے۔
(۹)۔ تمنا۔ ایک جوڑا آپس میں ملا بیٹھا ہُوا ہے۔
(۱۰)۔ پیدائش۔ وضعِ حمل۔
(۱۱)۔ حیات۔ کوئی شخص نعش اُٹھائے لئے جا رہا ہے گویا مرگ تبدیل اجزا ہے
(۱۲)۔ بیماری پیری مرگ۔ بڑھیا عورت عصا ہاتھ میں لئے ہوئے ہے

بعض چکروں میں مہاتما بودھ یا بودھ ستوا (یعنی جو عنقریب بودھ ہونے والا ہے) اُنکی شکل بھی کسی مقام پر دکھلائی جاتی ہے جس سے مراد ہے کہ انسان اس ہادیٔ دین کی تعلیم ذہن میں رکھے۔

شمیم

فنِ قصّہ نویسی

۱

قسامِ ازل نے حسنِ شاہدِ تخیل کے دو خوشہ چین پیدا کئے ہیں۔ اول شاعر۔ اور دوئم قصہ نویس۔ اور وہ بھی دونوں ایک دوسرے کے رقیب۔ قسم اول میں تو مادر زاد عشاق ہی شامل ہیں مگر قسم ثانی زمانہ بڑی حد تک خود بھی پیدا کر سکتا ہے۔ جن کی تعداد اول الذکر سے کہیں بڑھ کر ہے۔ موخر الذکر زمانہ کی نظروں میں زیادہ مرغوب اور دل پسند ہیں اس لئے کہ وہ اپنا دردِ دل نہایت دلچسپ پیرائیہ اور عام فہم زبان میں ادا کر سکتا ہے اور شاعر نہایت ادق زبان میں جس کا مطلب سمجھنے کے لئے بھی بھول بھلیاں سے گذرنا پڑتا ہے۔ فسانہ نویس بے علموں میں بھی ویسا ہی ہر دلعزیز ہے۔ جیسا لکھے پڑھوں میں۔ شاعر کا حلقۂ ہمدردی محدود ہے۔ اگرچہ وہ دلسوز پیرایہ میں اظہارِ تعشق کرتا ہے۔ ان دونوں حضرات کی جولانیٔ طبع گذشتہ صدی کے چوتھائی حصہ تک تو صرف فرشِ قرطاس تک ہی محدود تھی کہ ایک اور رقیب ان کا پردۂ عدم سے معرضِ شہود میں آ گیا اُسے "متحرک تصاویر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس نے تخیل کی محبوبہ کو میدانِ عمل میں لا کر بے نقاب کر دیا ہے۔

فن قصہ نویسی فن شاعری کی طرح ایک دریائے ناپیداکنار ہے جس کی وسعت کچھ اس کے شناور ہی جانتے ہیں۔ زبان یا تو شاعری سے بنتی ہے یا فسانہ نویسی سے عروج پاتی ہے اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ موخر الذکر فن ایک ایسے کم علم طبقہ کے ہاتھ میں آ گیا جس نے اس کی وقعت اہل بینش کی نظروں سے گرا دی۔ جس قدر یہ فن دنیائے مغرب میں بام ترقی پر پہنچتا ہے اُسی قدر مشرق میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً تحت الثریٰ کی طرف جا رہا ہے۔ سبب؟

مندرجہ ذیل مضمون میں مذکورہ بالا عنوان کے تحت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ تمدن کے طلوعِ آفتاب سے لیکر آج تک انسانی ترقی اور تہذیب کا دار و مدار زیادہ تر قصہ کہانیوں پر ہی رہا ہے۔ اور اس سے بھی پیشتر جبکہ خداوند قدیر نے نظامِ عالم پیدا کیا مختلف اقسام کے قصے کہانیاں ابنائے وقت کی زندگی کا ایک جزو لاینفک تھیں۔ اگر تاریخ ماسبق کے اوراق پر ایک

نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن وحشی اقوام میں بھی ان کا رواج تھا۔ جن کے خونفشاں کارناموں کی شہادت پہاڑوں کے غار یا وادیوں کے پتھر ہی دے سکتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں ہر قوم میں خواہ وہ منطقۂ شمالی یا جنوبی میں بستی تھی۔ یا پہاڑوں کی سربفلک بلند چوٹیوں پر رہتی تھی کھلے سرسبز میدانوں۔ دریاؤں کی شاداب وادیوں میں بسر اوقات کرتی تھی اُن میں بھی اپنی طرز کے قصے ضرور رائج تھے۔ اُس زمانہ میں جبکہ انسان ایک درندہ سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ جبکہ اُس میں تن ڈھانپنے کی بھی معقولیت نہ تھی۔ خنک رات کی دشوار گذار گھڑیاں آگ کے ڈھیر کے گرداگرد بیٹھ کر صرف کہانیوں ہی سے بسر کی جاتی تھیں۔ اُن میں زیادہ تر اُن کے اپنے توہمات کے بنائے ہوئے نامعلوم بھوت پریت کے دہشتناک افسانے یا اُن کے آباؤاجداد کی فرضی لڑائیاں یا دیوتاؤں کی سحر آفرینیاں بیان کی جاتی تھیں۔ وہ اپنے اُن بہادروں کی مدح سرائی میں بڑے رطب اللسان رہتے تھے جنھوں نے اُن کے مخالف قبائل سے لڑ کر میدانِ جنگ میں اپنے اغراض کی حفاظت کے لئے جانیں دی تھیں اور انہیں کی تعریف و توصیف سے بھری ہوئی کہانیاں اُن کے سینہ بسینہ چلی آتی تھیں۔

اِس میں کچھ کلام نہیں کہ انہیں کہانیوں نے بعض گذشتہ زمانے کی اقوام میں ایک ایسی زندگی اور نئی رُوح پھونک دی تھی کہ اگر وہ رفتار زمانہ کے مطابق چلتے رہتے تو صدیوں بھی تہذیب و تمدن حاضرہ کی چوکھٹ کو بوسہ دینے کے قابل نہ ہوتے۔ یہی کہانیاں تھیں جنھوں نے تاریخ انسانی کی بنیاد ڈالی کیونکہ تاریخ صرف اعلےٰ کارناموں کا مجموعہ ہے اور وہ کارنامے عموماً کہانیوں کے ذریعہ سے ہی سینہ بسینہ چلے آئے یہانتک کہ ہم آج بیسویں صدی میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت سے ہزاروں برس پیشتر کے واقعات کتابوں کے اوراق پارینہ پر دیکھ سکتے ہیں اور بنی نوع انسان اس حد تک قصص اور کہانیوں کا یقیناً منت گزار ہے۔

سب سے اول کہانیاں صفحۂ قرطاس پر مصر میں لکھی گئیں اور یہ مسیح کی ولادت سے چار ہزار برس پیشتر شروع کی گئی تھیں۔ عموماً اس زمانہ میں وہ بھوج پتر یا پتھروں کی تختیوں یا جانوروں کی ہڈیوں پر لکھا کرتے تھے۔ اس کے بعد یہودیوں۔ یونانیوں۔ ہندؤوں اور بعد میں روما والوں نے اس فن کو زینتِ قرطاس بنایا۔ اس کے بعد کہانیاں نظم و نثر دونوں میں لکھی جانے لگیں جو زیادہ تر اپنے

مذہبی احکامات یا دیوی دیوتاؤں کی مدح سے لبریز تھیں یا اپنے مذہبی پیشواؤں کے کارناموں سے اُسے مزین کیا جاتا تھا۔ اس قسم میں کچھ یونانیوں اور رومادالوں کی اور کچھ ہندوؤں کی رزمیہ نظمیں ہیں اور یقیناً مہابھارت اور راماٸن بھی اسی تحت میں شمار کی جاتی ہیں۔

قصہ گو اُس زمانے میں ایسے ہی خوش آمدید کے مستحق تھے جس طرح موجودہ زمانہ میں ایک دور دراز جزیرہ کے مینار روشنی میں رہنے والا باشندہ ایک ایسے جہاز یا کشتی کو پیار محبت۔ اور دلی عقیدتمندی کی نظروں سے دیکھتا ہے جس میں کوئی انسانی صورت نظر آجائے۔ اور بلاشک وہ وقت قصہ گو کے لئے ایک سنہری زمانہ تھا جبکہ وہ بغداد و دمشق کے بازاروں میں اپنے پیچھے پیچھے ایک بھاری انبوہِ خلائق لئے لئے پھرتے تھے اور ایک کھلے میدان میں کھڑے ہو کر اپنے شاندار۔ نہایت دلچسپ اور نایاب قصے بیان کیا کرتے تھے اور جس ذوق شوق سے اہلِ شہر امیر و کبیر۔ برنا و پیر۔ ہر قسم اور ہر مذاق کے آدمی اُنہیں سُنا کرتے تھے وہ واقعی حیرت انگیز بات تھی۔ امیروں۔ رئیسوں اور صاحب ثروت آدمیوں کے علاوہ بادشاہوں اور دیگر خاندانِ شاہی کے معزز ارکان کے لئے علیحدہ علیحدہ قصہ گو مقرر ہوتے تھے جو رات کو سوتے وقت اُنہیں ہر دفعہ ایک نیا فسانہ سناتے تھے۔ اور جس وقت وہ قصہ سننے والا سو جاتا تھا قصہ گو کے لئے یہ لازمی امر تھا کہ وہ دبے پاؤں وہاں سے چلدے۔ اس فن کا رواج اگرچہ ہندوستان میں بھی ہوا مگر بہت دیر بعد اور خصوصاً مسلمان حکمرانوں کے عہد حکومت میں۔ اور اب بھی لکھنو یا دیگر ایسے پرانے شہروں میں کہیں کہیں قصہ گو پائے جاتے ہیں +

ہندوستان میں قصہ نویسی کا فن سب سے پہلے ۱۵۶۸ء میں شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں شروع ہوا۔ جبکہ فیضی نے بادشاہ کے ایما سے طلسم ہوش ربا فارسی زبان میں تصنیف کیا اور یقیناً یہ تصنیف آجتک اپنا جواب پیدا نہیں کر سکی۔ ایک اتنا بڑا قصہ جسے اس وقت اُردو کا لباس پہنایا گیا ہے تقریباً ۴۶ جلدوں میں منقسم ہے۔ کیسی علمی لیاقت حافظہ اور روانی کے ساتھ قابل مصنف نے اُسے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا واقعی محوِ حیرت ہو کر ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ ہندوستان میں اس کتاب کے لکھے جانے سے بھی پیشتر عرب میں الف لیلہ تصنیف ہوئی اور یہ فخر اسی کتاب کو حاصل ہے کہ باوجود کئی سو سال گذرنے کے آجتک دنیا کی کسی زبان میں ایسی پُر لطف اور دلچسپ

کتاب نہیں لکھی گئی اور موجودہ صدی میں ویسی ہی ہر ملک و ملت میں پیار کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے جتنی کہ اپنی اوائل عمر میں۔ اس کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ چند سال گذرے ایک مصری علامہ نے اسی قسم کے دو قصے بنام "شیخ اسکندریہ اور اُس کے غلام" اور "کاروان" تصنیف کئے جن کا ترجمہ اطالینی۔ فرانیسی اور ہسپانی زبان کے علاوہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے مگر اُن کو وہ مقبولیتِ عامہ ہرگز حاصل نہ ہو سکی جو اس وقت بھی الف لیلہ کو ہر قوم اور ہر ملک میں حاصل ہے

طلسم ہوش ربا اور اس قسم کی دیگر کتب کی تصنیف کے بعد ہندوستان بہت مدت تک کوئی اور مصنف پیدا نہ کر سکا جو فن کی ترقی و بہبودی کا باعث ہوتا۔ مگر پھر بھی خاندان مغلیہ کے آخری حکمرانوں کے عہدِ حکومت میں یعنی ۱۸۰۱ء میں باغ و بہار اور طوطا کہانی لکھی گئیں اور گل بکاؤلی ۱۸۱۲ء میں ترجمہ ہوئی اور انہیں پر زمانہ گذشتہ کی طرز تحریر کا خاتمہ ہوا۔

فن قصہ نویسی کی طرز جدید میں لکھنے والے یا اس فن کے موجد پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ اور مولوی عبد الحلیم شرر ہیں۔ اول الذکر نے فسانہ آزاد لکھ کر زبان اُردو کی جو خدمت کی ہے۔ وہ واقعی قابل داد ہے اور نہ صرف اس وقت بلکہ آئندہ صدی تک بھی یہ کتاب اُردو زبان کے بہترین نمونوں میں شمار کی جائیگی۔ جہاں یہ کتاب زباندانی کے لحاظ سے اعلیٰ پائے کی ہے وہاں فن قصہ نویسی کے اعتبار سے ہر گام پر لغزش کھائے ہوئے۔ قصہ کا کوئی سلسلہ نہیں۔ ایک قصہ میں ہزاروں داستانیں بیان کر دی ہیں اور تقریباً سب غیر مکمل جنہوں نے فسانہ کی دلچسپی اس حد تک زائل کر دی ہے کہ نری زباندانی کے سوا اور اُس میں کچھ رہا ہی نہیں موجودہ اخلاق سے بھی دُور سمجھی جانے لگی ہے۔ عموماً عیش پسند امرا کی شوریدہ سری کا خاکہ یا مضحکہ ہے اور امرائے لکھنو کے اسرار حرم بڑی وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں ارباب نشاط کی خوب مٹی پلید کی ہے۔ نوجوان عیش پسند نواب زادوں کے حالاتِ زندگی اگرچہ ایک نصیحت آموز باب کا اس کتاب میں اضافہ کرتے ہیں مگر قصہ کی رنگینی اور دلچسپی کا رنگ قائم رکھنے کے لئے اُس کے بیان کردہ لوازمات سے پڑھنے والا بجائے اس کے کہ اُن سے کچھ فائدہ اُٹھائے اُلٹا تیر عشق و محبت کا گھائل اور خیالِ فاسد کا شکار ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ میرے اس نقطۂ خیال پر پیروانِ سرشار کو کچھ اعتراض ہو۔ مگر یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہم اس غیر مسلسل کہانی کو ایک فسانہ نہیں

بلکہ چند ایک خیالات پریشاں یا چند ایک مضامین کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں جو اعلےٰ درجہ کی انشاپردازی اور ٹکسالی زبان کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔

موخرالذکر نے لاریب متعدد قیمتی ناول اور قصے تصنیف کئے ہیں مگر وہ یا تو بالکل تاریخی ہیں یا مختلف زبانوں کے تراجم۔ اُن کے طرز بیان میں اگرچہ بلاکی کشش اور دلچسپی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے مگر پھر بھی وہ طرز جدیدہ کی چاشنی نہیں رکھتے اور خصوصاً "بدرالنسا کی مصیبت" ایک خاص مگر وسیع حلقہ میں ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھی گئی ہے۔ میرا مدعا اس وقت اس بات پر بحث کرنیکا نہیں کہ ان ناولوں میں کیا کیا خامیاں اور نقائص ہیں مگر پھر بھی میں مولوی صاحب کو اس فن کا مسلمہ اُستاد تسلیم کرتا ہوں۔ اس مضمون کے لکھنے سے میرا مدعا صرف اس بات کے بیان کرنیکا ہے کہ دنیائے مغرب نے اس فن کو کس کمال تک پہنچایا۔ کیونکر پہنچایا اور اُس کا مقابلہ ہندوستان جیسے ملک سے جو چند ایک ایسی کتابیں تصنیف کر چکا ہے جس کا جواب آجتک دُنیا نہیں دے سکی اور جو اس فن لطیفہ کی طرف دن بدن غفلت شعاری سے کام لے رہا ہے۔

امریکہ کا سب سے بڑا ناول نویس پو اپنی کتاب موسومہ "امریکن ڈرامہ" میں لکھتا ہے۔ کہ ایجاد کی سب سے بڑی دشمن نقل ہے" اور یہ فی الحقیقت بالکل درست اور صحیح ہے۔ اگر کسی ہندوستانی ناول نویس سے یہ دریافت کیا جائے کہ کہانیوں کی کتنی قسمیں ہیں یا اُن کے لکھنے کے کیا طریق ہیں تو وہ ہرگز ان باتوں میں سے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دے سکیگا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اُسے خود معلوم نہیں وہ تو لکیر کا فقیر ہے۔ پُرانی روش میں قصہ لکھنا جانتا ہے نہ اُس نے خود اس فن کا مطالعہ کیا نہ کسی سے سیکھنے کی کوشش کی اور کرے بھی تو کیوں۔ کون جانتا ہے۔ اور جو جانتے ہیں وہ کس اُمید پر دماغ سوزی کریں۔ نہ تو اخبار نویس نہ رسائل و جرائد کے مدیر۔ نہ کتب فروش نہ کتابیں شائع کرنے والی انجمنیں کوئی بھی تو کسی قسم کے مصنفوں کی قدر نہیں کرتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک اعلےٰ پائے کے ناول کے لئے جس کے متعلق میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں انتخاب تھا۔ ایک سمجھدار سرد و گرم چشیدہ ایڈیٹر نے غریب مصنف کی محنت کا معاوضہ صرف تیس روپے میں دیا۔ اندریں حالات ہندوستان کا کون فردِ بشر اس بات کا حوصلہ کر سکتا ہے کہ وہ دماغ سوزی کر کے ہمارے لئے لٹریچر کا اعلےٰ نمونہ تیار کرے۔ برعکس اس کے یوروپ

اور امریکہ کے مصنفین کی شاہانہ عطیوں سے قدر افزائیاں کی گئی ہیں۔ مثلاً امریکہ کے ایک مشہور و معروف ہفتہ وار رسالہ نے اپنے صفحات میں ایک دفعہ مندرجہ ذیل اعلان شائع کیا:۔

"اعلیٰ درجہ کے لٹریچر کے انتخاب میں کسی قسم کے خرچ کی پروا نہیں کی جاتی ہم اسی ہزار روپے ایک ناول اور دس ہزار روپے تک ایک مختصر سی کہانی کے لئے دیتے رہے ہیں"

مصنف وہاں اپنے مضامین کی منہ مانگی قیمتیں وصول کرتے ہیں رُڈیارڈ کپلنگ مشہور شاعر و قصہ نویس ہر لفظ کے لئے جو وہ لکھے دو روپیہ فی لفظ کے حساب وصول کر لیتا ہے مثلاً اگر اُس نے ایک مضمون دس ہزار الفاظ کا لکھا تو اس کی مقررہ قیمت بیس ہزار روپیہ ہوگی۔ گورنر موریس ہر دفعہ اپنی ایک مختصر کہانی کے لئے دو ہزار آٹھ سو روپیہ وصول کرتا ہے اور بہت عرصہ نہیں گزرا کہ ایک عورت کو اُس کی ایک کہانی کے لئے چار ہزار دو سو روپے وصول ہُوئے تھے سلطنت متحدہ امریکہ کی نیوجرسی ریاست کی ایک عورت نے اپنا پہلا ناول پچاس ہزار روپے میں فروخت کیا اور اس انعامی مقابلہ میں پانچسو سے زائد قصے موصول ہُوئے تھے اُس کتاب کا نام Diane of the Green Van ہے۔ جارج رنڈلف چسٹر ایک سفری ایجنٹ تھا جس نے اس فن میں ید طولےٰ حاصل کرکے لاکھوں روپے کی املاک خرید کی ہیں ماٹیگو گلاس ایک مشہور و معروف قانون دان تھا جو ہر سال لاکھوں روپے اپنے موکلوں سے وصول کر لیتا تھا مگر قصہ نویسی کے منافع نے اُسے مجبور کیا کہ وہ اپنا قانونی پیشہ ترک کرکے ایک فسانہ نویس بن جائے کیونکہ اس فن میں وہ اپنے اول الذکر پیشے کی نسبت دوگنے سے بھی زیادہ کما لیتا تھا۔ ہیرلیڈ میک گرتھ امریکہ کے ایک نوجوان مصنف نے صرف ایک ناول بنام The man on the Box لکھ کر ایک لاکھ چھ ہزار روپیہ کمایا۔ اور نہ صرف مندرجہ بالا مصنفین کے نام قابل ذکر ہیں بلکہ چند ایک ایسے نام بھی ہیں جو ان سے بھی زیادہ اپنی کہانیوں کی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ او ہنری۔ ریکس بیچ۔ مارک ٹوین۔ سر رائیڈر ہیگرڈ۔ میری کوریلی۔ سر آرتھر کانن ڈائیل۔ ایڈنا فربر اور جیک لنڈن جو فن قصہ نویسی کے بہترین اُستاد زمانہ ہیں اپنا ہر قصہ لاکھوں روپے میں فروخت کرتے ہیں۔ یہ حالت تو ہے اُنکی جو قلم سے لکھتے ہیں اب اُن کا ذکر سُنئے جو ہر وقت ان کہانیوں اور ناولوں کے خریدنے کے درپے رہتے ہیں۔ چونکہ اس فن میں سلطنت متحدہ امریکہ ہی سب سے گوئے سبقت لے گئی ہے اس لئے میں اُسی مُلک کے ذکر پر اکتفا کرونگا تاکہ مضمون کی طوالت بھی مدنظر رہے۔

(باقی دارد)

محمد ضیاء الدین شمسی (لاہور)

شاعر

رات نصف سے زیادہ گذر چکی تھی۔ آسمان پر تاروں کی محفل آراستہ تھی۔ شاعر انہیں دیکھتا تھا۔ اور سوچ سوچ کر وجدانی کیفیت کے عالم میں شعر کہتا جاتا تھا۔ وہ کبھی لیٹتا، کبھی بیٹھتا۔ کبھی ٹہلتا اور کبھی جوش سے ہاتھوں کی مٹھیاں کس کر رہ جاتا تھا ـــــ وہ شعر کہہ رہا تھا۔

اسی طرح رات گذر گئی، مگر شاعر کی نظم تاحال ناتمام تھی۔ طلوع آفتاب کی سرخی دیکھ کر اُس پر حسرت چھا گئی، گویا یہ اُس کے لئے شامِ زندگی ہو۔ اس وقت اُس کا چہرہ کملایا ہُوا پھول تھا، آنکھیں اُجڑی ہُوئی تھیں۔ کبھی اپنی نظم کو دیکھتا، کبھی آسمان کو ـــــ اُس کا دل صبح کی روشنی میں رات کی تاریکی کا جویا تھا۔ جس میں تارے مسکراتے ہیں اور مدھم روشنیاں اپنی کمزور کرنوں کے لانبے لانبے ہاتھ بڑھا کر سوتی ہوئی دنیا کے غافل دماغوں پر حسین خوابوں سے سحر کرتی ہیں۔ وہ اس سحر پاشی کو نظم کر رہا تھا۔ مگر اب صبح ہو چکی تھی۔ معاً شاعر کے دماغ میں ایک خیال پیدا ہُوا۔ اُس نے کاغذ پنسل لی اور دریا کی طرف روانہ ہُوا۔ وہاں اُسے تنہائی تھی۔ اُس نے اپنے دل کی تاریکی باہر نکالی اور اُس خیالی تاریکی میں نظم کو ختم کیا۔ اس وقت اُسے ایسی مسرت حاصل ہُوئی گویا کوئی سلطنت مل گئی ہو۔ اپنی نظم کو بار بار پڑھتا تھا۔ اور جھومتا تھا۔ گاتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا کسی معصوم بچے کو خوشرنگ کھلونے مل گئے ہیں۔

معاً کسی کے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ شاعر چونک پڑا۔ جس طرح ہرن کا بچّہ آہٹ سے چونک اُٹھتا ہے۔ اُس نے اپنے پُرزہ کاغذ کو چھپالیا اور نگاہ اُٹھائی۔ سامنے لالہ امرناتھ آسیر کھڑے تھے۔ شاعر کو دیکھ کر وہ مسکرائے اور بولے "کیا ہو رہا ہے؟"

لالہ امرناتھ علم دوست آدمی تھے، پورے اپ ٹو ڈیٹ۔ اُن سے اور شاعر سے نہایت عمدہ تعلقات تھے۔ شاعر غریب تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ شادی بھی کر چکا تھا۔ اس کے ایک لڑکا تھا، دو لڑکیاں۔ اکثر دلگیر رہا کرتا تھا۔ ضروریات زندگی کے گرانی کے ایام میں بھی اُسے حیوانی جد وجہد کرنا گوارا نہ تھا۔ وہ اس میں اپنی کسرِ شان تصور کرتا تھا۔ اکثر کہا کرتا "لوگ کیسے بے وقوف ہیں۔ تھرما میٹر سے ہل کا کام

لینا چاہتے ہیں۔ لالہ امرناتھ اُس کے کلام پر فریفتہ تھے۔ کبھی اس کی نظم کا ایک بند بھی سُن لیتے۔ تو اُن پر خود فراموشی کا عالم طاری ہوجاتا تھا۔ امیر آدمی تھے۔ روپے پیسے کی چنداں پروا نہ تھی۔ وہ شاعر کی فراخدلی سے امداد کیا کرتے تھے۔ اس میں اُنہیں رُوحانی حظ حاصل ہوتا تھا۔

شاعر نے اُنہیں دیکھا۔ تو آنکھوں میں رونق آگئی۔ عقیدت مندانہ انداز سے بولا "نظم کہہ رہا تھا"

"کیا عنوان ہے؟"

"دُنیائے کہکشاں"

"خوب۔ عنوان تو خوب ہے۔ دیکھوں کیسی لکھی ہے؟"

شاعر نے نظم لالہ امرناتھ کے ہاتھ میں دے دی اور رک رک کر کہا "ساری رات جاگتا رہا ہوں"

"ہوں"

لالہ امرناتھ نے نظم پڑھی۔ تو اُن کی حیرت کا اندازہ نہ تھا۔ اُنہوں نے نظم کی سینکڑوں کتابیں دیکھی تھیں۔ بیسیوں شاعروں سے اُن کا تعارف تھا۔ لیکن جو تخیل، جو حُسن، جو اثر اس نظم میں تھا۔ وہ اس سے پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اُن پر جذبے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کاغذ اُن کے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ اُنہوں نے شاعر کی طرف نگاہِ عقیدت سے دیکھا، گویا وہ کوئی دیوتا ہو اور جوشِ مسرت سے کانپتے ہُوئے کہا۔ "شاعر"

۲

شاعر پر صورتِ حال روشن ہوگئی۔ اُسے اپنی رُوح کی گہرائیوں میں حقیقی مسرت اور غرور کا احساس ہُوا۔ اُس نے دھڑکتے ہُوئے دل سے جواب دیا۔ "جی"

"یہ نظم تمہاری ہے؟"

شاعر کو ایسا معلوم ہُوا جیسے کسی نے گالی دیدی ہو۔ شرم نے چہرہ سُرخ کر دیا۔ اُس نے ایک عجیب انداز سے اپنے محسن کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ہاں میری ہے"

"میں نے ایسا کلام آج تک نہیں دیکھا"

شاعر کا دماغ آسمان پر تھا۔ اس وقت اُسے ایسا معلوم ہُوا گویا دُنیا اپنی لاانتہا زبانوں کے ساتھ اُس کی کاوشوں کی داد دے رہی ہے۔ تاہم اُس نے سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ دیا۔ انسان جو

سوچتا ہے۔ بسا اوقات اُس کے اظہار کو اوچھا پن سمجھتا ہے۔ شاعر نے سر جُھکایا اور جواب دیا "یہ آپ کا حسنِ ظن ہے"

لالہ امرناتھ نے جوش سے کہا "حسنِ ظن ہے؟۔ نہیں۔ میں تمہاری بے جا تعریف نہیں کرتا۔ تم فی الحقیقت اس کے مستحق ہو۔ تم اپنے جوہر سے ناآشنا ہو۔ مگر میری دُور رس نگاہیں صاف دیکھ رہی ہیں۔ کہ شہرت تمہاری طرف تیزی سے دوڑتی ہُوئی آرہی ہے۔ اور وقت قریب تر ہے جب تمہارے لئے کامیابی اپنے سنہرے دروازے وا کردیگی۔ حیران نہ ہو۔ تعجب نہ کرو۔ شاعر تم حقیقت میں شاعر ہو۔ تمہارا تخیل عرش کی بلندیوں کو چھُوتا ہے اور تمہارے معلومات کائنات کے مانند وسیع ہیں۔ درد تمہارے کلام کا طغرائے امتیاز ہے۔ اور اثر اُس کا جزو خاص۔ میں سچ کہتا ہوں۔ تمہارا کلام لوگوں سے زبردستی خراجِ تحسین وصول کریگا اور دُنیا تمہاری قدردانی کرنے پر مجبور ہوگی"

تعریفی کلمات حوصلہ بڑھانے میں اکسیر کا کام دیتے ہیں شاعر نے غرور سے گردن بلند کی اور کہا "میں نے ایسی نظمیں اور بھی تیار کی ہیں"

"کتنی؟"

"پیشتر ازیں گیارہ لکھ چکا ہوں۔ یہ بارھویں ہے"

لالہ امرناتھ پر جیسے کسی نے جادو کردیا۔ اُن کو ایسی مسرت ہُوئی۔ گویا کسی غریب کو دفینہ مل گیا ہو۔ بچوں کے سے اضطراب سے بولے "وہ کہاں ہیں؟"

شاعر نے جواب دیا "گھر پر ہیں"

"چلو! میں ابھی دیکھنا چاہتا ہوں"

شاعر کا جسم شب بیداری سے چُور چُور ہو رہا تھا۔ لیکن اظہارِ کمال کے اشتیاق نے تھکے ہُوئے پیروں کو پر لگا دئے۔ دونوں اُڑتے ہُوئے گھر پہنچے۔ لالہ امرناتھ نے نظمیں دیکھیں۔ تو سناٹے میں آگئے۔ جیسے کوئلوں میں ہیرے مل گئے ہوں۔ وہ شاعر کے قدردان تھے۔ اُس کی نظموں کے مداح ہوگئے۔ اُن کو یہ گمان نہ تھا۔ کہ شاعر اس قدر بلندی پر پہنچ گیا ہوگا۔ وہ اپنے نام سے ایک نہایت نفیس مصوّر رسالہ نکالنے کی فکر میں تھے۔ شاعر کی نظمیں دیکھ کر یہ ارادہ مستقل

ہوگیا۔ جوش سے بولے: "آئینہ تمہیں شہرت کی صف اول میں جگہ دلا دے گا"

شاعر کے دماغ میں شعاع اُمید کا ظہور ہُوا۔ جس طرح تاریک رات میں بجلی چمک جاتی ہے اُس نے خوشی سے دھڑکتے ہُوئے دل اور لرزتے ہُوئے ہاتھوں سے نظموں کا مسودہ لالہ امرناتھ کے حوالے کردیا۔

۳

اس سے دوسرے دن شاعر سوکر اٹھا۔ تو کمر میں درد سا ہورہا تھا۔ لیکن بے پروائی لوازمات شاعری کا جزو خاص ہے۔ اُس نے اس طرف چنداں التفات نہ کی۔ اور فطرتِ انسانی کے مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔ وہ مطالعہ کتب کی نسبت اس کی اہمیت کا زیادہ قائل تھا۔ اس طرح دو چار دن گذر گئے۔ درد میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ لیٹنا اور بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ شاعر کو قدرے تشویش ہُوئی بھاگا بھاگا حکیم کے پاس پہنچا۔ معلوم ہُوا پھوڑا ہے۔ حکیم نے مرہم لگانے کو دیا لیکن اُس سے بھی افاقہ نہ ہُوا۔ یہاں تک کہ رات کو سونا ہی دشوار ہوگیا۔ اُس وقت شاعر کو خیال آیا۔ کسی ڈاکٹر کو دکھانا چاہئیے۔ لالہ امرناتھ کو ساتھ لیکر ڈاکٹر کنورسین کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب لالہ امرناتھ کے احباب میں سے تھے۔ اُنھوں نے بڑی محنت سے پھوڑے کو دیکھا اور فکرمندانہ لہجہ میں کہا۔ "آپ نے بڑی بے پروائی کی۔ کاربنکل ہے"

لالہ امرناتھ نے چونک کر پوچھا۔ "کیا ہوتا ہے"

"ایک سخت قسم کا پھوڑا"

اس کا علاج بھی کچھ ہے یا نہیں؟

ڈاکٹر صاحب نے چند لمحہ کے لئے سکوت کیا اور پھر جواب دیا۔ "صرف ایک علاج ہے مرہم سے یہ درست نہ ہوگا"

شاعر نے مضطرب ہوکر پوچھا۔ "کیا؟"

"اپریشن"

شاعر کی آنکھوں کے سامنے موت پھر گئی۔ گھبرا کر بولا۔ "اپریشن سخت تو نہیں"

"میں آپ کو تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتا۔ اپریشن سخت ہے۔ اگر آپ پہلے آجاتے۔ تو

یہ خوفناک صورت اختیار نہ کرتا۔"
لالہ امرناتھ کا چہرہ قوس قزح کی تصویر تھا۔ گھبرا کر بولے "کیا اس کے سوائے اور کوئی علاج نہیں؟"
"مُطلق نہیں"
"تو اپریشن کروا دینا چاہیئے۔"
"ضرور اور جلدی سے معمولی توقف بھی مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔"
لالہ امرناتھ نے سوال کیا "اپریشن کس سے کروانا ٹھیک ہوگا"
"میرے خیال میں میو ہسپتال بہترین جگہ ہے۔"
لالہ امرناتھ نے شاعر کی طرف رحم بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا "اپریشن کروا لو"
شاعر تن کر کھڑا ہو گیا گویا خوف کو دلیری نے پاؤں تلے مسل ڈالا۔ اس وقت اُس کے چہرے پر بے خوفی کے آثار نمایاں تھے۔ حوصلہ مندی کے انداز سے بولا "معمولی بات ہے اب اپریشن کوئی غیر معمولی بات تو نہیں رہا۔ آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔"
اور دوسرے دن وہ اپریشن روم میں میز پر لیٹا ہُوا تھا۔

۴

یکا یک سرجن صاحب گھبرائے ہُوئے باہر نکلے۔ امرناتھ کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اُنھوں نے آگے بڑھ کر پوچھا "صاحب! اپریشن ہو گیا"
سرجن کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ رُک رُک کر بولے "تم اُس کا کون ہوتا ہے؟"
"میں اُس کا دوست ہوں۔ اُس کا کیا حال ہے؟"
"ہارٹ فیل ہو گیا"
امرناتھ پر جیسے بجلی گر پڑی۔ چلا کر بولے "کیا فرمایا آپ نے"
"مین! اُس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ دل کا دھڑکن رُک گیا"
"تو وہ مر گیا"

"ریس۔ ہم کو یہ ہوپ (اُمید) نہ تھا"

شاعر کی بیوی سوشیلا امرناتھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ یہ سُن کر پاس آگئی۔ اور روتے ہُوئے بولی:۔ "بھائی مجھے دھوکے میں نہ رکھو۔ جو بات ہو صاف صاف کہہ دو۔"

امرناتھ کو شاعر سے دلی محبت تھی۔ وہ اُسے اس طرح چاہتے تھے جیسے بھائی بھائی کو۔ اور اتنا ہی نہیں۔ اُنہیں اُس سے بڑی بڑی اُمیدیں تھیں۔ اکثر سوچا کرتے تھے۔ یہ ہندوستان کا نام کریگا اس کی شاعری ٹیگور اور اناطول فرانس کے برابر کی ہے وہ جب اُس کی "دُنیائے کہکشاں کو دیکھتے تو اُن پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس وقت سرجن کے الفاظ نے اُن کے جگر پر انگارے دھکا دئے اُن کو یکایک یقین نہ آیا۔ کہ شاعر حقیقت میں مر گیا ہے۔ اُنہوں نے ریت کی دیوار کھڑی کی۔ اُس کی بیوی کے سوال کا جواب نہ دیا اور دوڑتے ہُوئے کمرے میں گھس گئے۔ شاعر میز پر لیٹا ہُوا تھا۔ اور سرجن نااُمیدی کے عالم میں سر ہلا رہا تھا۔ ریت کی دیوار گر گئی۔ امرناتھ کے دل پر کٹاریں چل گئیں۔ سوچنے لگے کیسا خوبصورت تارا تھا۔ مگر طلوع ہونے سے پہلے ہی غروب ہو گیا اس سے کیا کیا اُمیدیں تھیں۔ سب پر پانی پھر گیا۔ سُنا تھا۔ نیک اور ہونہار روحیں اس وادیٔ گناہ میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتیں۔ اس وقت اس کی تصدیق ہو گئی۔

امرناتھ باہر نکلے۔ تو چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں سوشیلا سامنے آئی۔ وہ مجسم یاس تھی اُس کی آنکھیں اس طرح کھُلی ہُوئی تھیں۔ گویا رُوح کی تمام تر قوتیں آنکھوں میں جمع ہو کر کسی بات کی انتظار کر رہی تھیں۔ اُس نے امرناتھ کو دیکھا تو بیتابانہ انداز سے بولی "بولو! کیا ہُوا؟"

امرناتھ کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ سوشیلا کو جواب مل گیا۔ اُس نے اپنے دونو ہاتھ سر پر مارے۔ اور پچھاڑ کھا کر زمین پر گر گئی۔

امرناتھ اور بھی گھبرا گئے۔ سوشیلا کو ہوش آیا تو اُس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اُس کے دلخراش نالے امرناتھ کے زخم جگر پر نمک کا کام کر گئے۔ اُن کو ہمت نہ ہُوئی۔ کہ اُس کی طرف دیکھ سکیں اس کی آواز شکوۂ بیکسی تھا، جسے سُن کر اُن کی رُوح تھرّا اُٹھی۔ اُنہوں نے جیب سے سو روپے کے نوٹ نکالے اور اُس کے ہاتھ میں دیکر اس طرح بھاگے۔ جیسے کوئی بندوق لیکر اُن کا تعاقب کر رہا ہو۔ یہ نظارہ اُن کے دردرس دل کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ گھر جا کر ساری

رات روتے رہے۔ اُن کو اس امر کا یقین ہو گیا۔ کہ شاعر کی بیوی اس موت کا ملزم مجھے قرار دے رہی ہے اور اپنی کشت آرزو کا برق شرر مجھے سمجھ رہی ہے اس لئے اُس کے سامنے جاتے ہُوئے ہمدردی کا جذبۂ راست وہم کی خلیج پر حادی نہ ہو سکا۔ کئی دن گذر گئے۔ امر ناتھ کے دل سے شاعر کی بے وقت اور پُر حسرت موت کا ملال مٹتا گیا۔ زخم رسیدہ دلوں کے لئے وقت بہترین مرہم ہے۔ صبح کا وقت تھا پریس کا آدمی "آئینہ" کا آخری پروف لیکر آیا۔ اس میں شاعر کی نظم تھی۔ امر ناتھ کے زخم جگر ہرے ہو گئے شاعر اکثر کہا کرتا تھا۔ شاعر کی اولاد اُس کا کلام ہے۔ امر ناتھ کو یہ مقولہ یاد آ گیا۔ شاعر کی نظم دیکھ کر اُن کو وہی صدمہ ہُوا۔ جو کسی عزیز دوست کے یتیم بچّے کو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ اُنھوں نے آہِ سرد بھر کر پروف دیکھنا شروع کیا۔ نظم میں نئے لطف کا احساس ہُوا۔ معاً اُن کے دل میں ایک گناہ آلود خیال نے سر اُٹھایا۔ اُنھوں نے چند لمحہ تک غور کیا۔ اور پھر لرزتے ہُوئے قلم سے شاعر کا نام کاٹ کر اُس کے بجائے اپنا نام لکھدیا۔ انسانی دل ایک اتھاہ ساگر ہے، جہاں کنول کے پھولوں کے ساتھ ساتھ خونی جونکیں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

۵

آئینہ کا پہلا پرچہ شائع ہُوا تو ادبی دُنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ لوگ دیکھتے تھے اور جوش مسرت سے جھُومتے تھے۔ آئینہ ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے محاسن سے مالا مال تھا۔ اور خصوصاً "دُنیائے کہکشاں" کے سلسلہ کی پہلی نظم پر تو جنسِ سخن کے جوہری فریفتہ ہو گئے۔ ایک مشہور رسالہ نے تنقید کرتے ہُوئے لکھا۔

"یوں تو آئینہ کا ایک ایک صفحہ بجائے خود ایک حسن آباد سے کم نہیں۔ لیکن "دُنیائے کہکشاں" کی پہلی قسط دیکھ کر تو دل رقص کرنے لگتا ہے۔ اس کی ایک ایک سطر میں اسیر صاحب نے سحر پاشی کی ہے اور جذبات کے تو دریا بہا دئے ہیں۔ سُنا کرتے تھے کہ شاعری دل کی عمیق گہرائیوں کے جذبات خوابیدہ کی کھُلی ہُوئی تصویر ہے۔ یہ نظم دیکھ کر اس قول کی تائید ہو گئی۔ بلاشبہ اسیر صاحب کی یہ نظمیں اُردو زبان کا درجہ انگریزی اور فرانسیسی کے مساوی کر دیں گی —— اسیر صاحب آسمانِ ادب پر آفتاب درخشاں کے مانند یکا یک نمودار ہُوئے ہیں۔ اور ایک ہی نظم سے صفِ اول میں درجۂ امتیاز پا گئے ہیں"

ایک دوسرے اخبار نے لکھا:-

"اسیر صاحب کی نظم کیا ہے اک مسلسل جادوئے حسن ہے اُردو زبان کی خوش نصیبی سمجھنا چاہیئے کہ اس میں ایسے جذباتِ لطیفہ کے بیان کرنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔ جن پر آئندہ نسلیں بجا طور پر فخر و ناز کریں گی۔ ہمیں یقین واثق ہے کہ یہ نظم اگر اسی شان سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ تو اسے اُردو میں وہی درجہ حاصل ہو جائیگا۔ جو ہندی میں تلسی داس کی رامائن کو سنسکرت میں شکنتلا کو انگریزی میں "پیریڈائس لاسٹ" کو اور بنگالی میں گیتان جلی کو حاصل ہے۔ اسیر صاحب کا نام اس نظم سے غیر فانی ہو جائے گا"، اور اتنا ہی نہیں۔ اس نظم کا ترجمہ بنگالی، مرہٹی، گجراتی انگریزی اور فرانسیسی رسائل میں شائع ہُوا اور تعریف کے ساتھ۔ امرناتھ جب اخبار کو دیکھتے، اُسی میں اپنا ذکر پاتے۔ اس سے اُنہیں رُوحانی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی دل میں ایک مدھم سی آواز سُنائی دے جاتی تھی "تو ڈاکو ہے" امرناتھ اس صدائے ضمیر کو سُنتے تو چونک اُٹھتے۔ لیکن پھر اپنے ارادے سے اس کو اندر ہی اندر دبا دیتے۔

اسی طرح ایک سال گذر گیا۔ لالہ امرناتھ کی شہرت ہندوستان سے نکل کر یورپ تک پہنچ گئی۔ انگریزی اخبارات میں اُن کے آرٹ پر مضامین شائع ہُوئے۔ رسائل نے اُن کے فوٹو دئے۔ نظم مکمل ہُوئی تو پبلشر اُس پر اس طرح ٹوٹے، جس طرح پروانے شمع پر ٹوٹتے ہیں۔ انگریزی پبلشروں نے ترجمہ کی اجازت کے لئے گراں بہا رقوم پیش کیں۔ امرناتھ کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی جب اپنی کرتوت کا خیال آتا۔ تو رگوں کا خون منجمد ہو جاتا تھا جس طرح بزمِ شادی میں موت کا خیال بے لطفی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر اُنہوں نے اپنے مرحوم دوست کو بالکل فراموش کر دیا ہو۔ یہ بات نہ تھی۔ وہ اُس کی بیوہ کے نام پچاس روپیہ ماہانہ بذریعہ منی آرڈر بھجوا دیا کرتے تھے۔ وہ اسے اپنا فرض سمجھتے تھے۔

۶

رات کا وقت تھا، شاعر کے مکان میں حسرت چھائی ہُوئی تھی۔ وہ موت سے تو بچ گیا تھا لیکن زندہ درگور تھا۔ سال بھر سے بیمار چلا آتا تھا۔ اس بیماری نے اُس کے جسم کا خون چُوس لیا تھا چہرے کا رنگ زرد تھا۔ وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ دن رات چارپائی پر لیٹا رہنے کے

باعث اُس کا مزاج بھی چڑچڑا سا ہو گیا تھا۔ اس پر امرناتھ کا ایک دفعہ بھی نہ آنا اُس کے غصہ پر ایندھن کا کام کر گیا۔ آٹھ پہر رنجیدہ رہتا تھا۔ اور امرناتھ کو گالیاں دیتا رہتا تھا۔ غم نصیب سوشیلا سمجھاتی نہیں آتے تو کیا ہُوا۔ اب کوئی تمہارے دشمن تو نہیں ہو گئے۔ پچاس روپے ماہوار بھیج رہے ہیں۔ ورنہ دوا کے لئے بھی ترستے پھرتے۔ کیا جانے۔ کسی ضروری کام میں لگے ہوں۔ شاعر یہ سنتا تو تلملا جاتا۔ اور کہتا۔ روپیہ واپس ادا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اظہارِ ہمدردی کے دو کلمے وہ قرض ہے۔ جسے ادا کرنا اِنسانی طاقت سے باہر ہے۔ اگر اُس کے بس میں ہوتا۔ تو وہ روپے واپس کر دیتا۔ حساس آدمی کے لئے بے پروائی بدترین قسم کا سلوک ہے وہ گالیاں کھا سکتا ہے۔ مار کھا سکتا ہے۔ لیکن بے پروائی نہیں سہ سکتا۔ شاعر اسی طبیعت کا آدمی تھا

رات کا وقت تھا۔ شاعر کے مکان میں ایک مٹی کا چراغ روشن تھا۔ جیسے حالتِ یاس میں شعاعِ امید ٹمٹماتی ہے۔ شاعر چارپائی پر لیٹا ہُوا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ خدا جانے دُنیائے کہکشاں کا کیا حشر ہُوا؟ اُسے یہ بھی علم نہ تھا۔ کہ آئینہ جاری بھی ہُوا یا نہیں اس نظم سے کیا کیا اُمیدیں تھیں۔ بیماری نے سب خاک میں ملا دیں۔ اتنے میں دروازہ کھُلا، شاعر کا ایک دوست رتن لال کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک مجلد کتاب تھی۔ شاعر نے پوچھا " یہ کیا ہے؟"

"رسالہ آئینہ کا فائل ہے"

شاعر کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اُس نے مضطرب ہو کر کہا" کیا آئینہ کا فائل؟"

"ہاں! دیکھو گے؟"

ضرور۔ ذرا چراغ لانا"

بچے بھُوک سے بلبلا رہے تھے۔ سوشیلا اُن کے لئے روٹی پکا رہی تھی۔ آٹے کا پیڑہ بناتے بناتے بولی" اب کیا کتاب پڑھو گے۔ حکیم نے منع کیا ہے کہیں پھر بخار نہ ہو جائے"

لیکن شاعر نے سُنا ان سُنا کر دیا۔ اور آئینہ کا فائل دیکھنے لگا۔ اپنی پہلی نظم دیکھ کر اُس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ جیسے پھُول کی کلی۔ ایک ایک مصرعہ دیکھتا تھا۔ اور سر دھنتا تھا۔ سوچتا تھا۔ کیا یہ میرے دماغ کی کاوش ہے۔ کیسی جدت ہے۔ کتنی بلند خیالیاں۔ ایک ایک استعارہ میں آسمانِ خیال کے تارے توڑ کر دکھلائے گئے ہیں۔ اُس کو اپنے ماضی پر خود رشک ہونے

لگا۔ کیا اب بھی دماغ کو یہ بلند پروازی میسّر ہے۔ حسرت۔ دل میں ہچکورے لینے لگی۔ جیسے کنول پانی میں تیرتا ہے۔

یکایک نظم کے خاتمہ پر نگاہ گئی۔ امرناتھ اسیر کا نام پڑھ کر شاعر کے کلیجے میں جیسے کسی نے گولی ماردی۔ اسکو اُن سے اِس کی توقع نہ تھی۔ اُس کو یہ خواب میں بھی خیال نہ آسکتا تھا کہ امرناتھ اتنے ذلیل ہو سکتے ہیں۔ اپنی محنت کے ثمرہ پر یہ ڈاکہ زنی دیکھ کر شاعر کا خون اُبلنے لگا۔ آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔ وہ اک جوش کی حالت میں تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور اپنے دوست سے بولا "کاغذ اور قلم دوات لاؤ۔ میں نظم لکھواؤں گا"

اس سے پیشتر وہ کئی دفعہ نظم تیار کرنے پر آمادہ ہُوا تھا۔ لیکن نقاہت نے اُس کے ارادے کو ہر دفعہ شکست دی تھی۔ رتن لال نے جواب دیا۔ رہنے دو۔ تمہارا دماغ کام نہ کرسکیگا"

شاعر نے اپنے ہاتھ کی مٹھیاں کس لیں۔ اور بھوکے شیر کی مانند گرج کر کہا "تم قلم دوات لاؤ۔ میں لکھا سکوں گا"

رتن لال نے بیجان مشین کی طرح تعمیل کی۔ شاعر بولا۔ عنوان لکھو "لٹی ہُوئی شہرت"

رتن لال نے لکھ کر کہا "لکھائیے"

شاعر نے لکھوانا شروع کیا۔ شاعری کا سوت کھُل گیا۔ جس طرح برسات کے ایام میں ندی نالوں میں سیلاب آجاتا ہے۔ اُسی طرح اس وقت شاعر کی طبع روانی زوروں پر تھی خیالات آپ سے آپ نظم ہورہے تھے۔ اُسے سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن شعر سانچے میں ڈھلے ہُوئے تھے۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا زبان پر سرسوتی آکر بیٹھ گئی ہے۔ کیا سُلجھے ہُوئے خیالات تھے، کیسا زبردست جذبہ۔ بند بند سے آگ کے شرارے نکل رہے تھے۔ جس طرح عروسِ نو کا سہاگ اُجڑ جانے پر اُس کے پرشور نالے پُردرد دلوں میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔ اس طرح اِس نظم کو دیکھ کر دماغ کھولنے لگتا تھا۔ اور طبیعت میں خیال یقین بن کر بیٹھ جاتا تھا۔ کہ کوئی مظلوم شکوۂ بیداد کررہا ہے۔

یکایک دروازہ کھُلا۔ اور امرناتھ اندر داخل ہُوئے۔ اُس وقت اُن کا چہرہ ڈوبتے ہُوئے سُورج کے مانند سُرخ تھا۔ شاعر نے اُن کو دیکھا۔ تو چونک پڑے۔ جیسے پرندہ اسیر صیاد

کو دیکھ کر چونک اُٹھتا ہے۔ شاعر نے نفرت سے مُنہ پھیر لیا۔ لیکن امرناتھ نے اس کی پروا نہ کی۔ اور روتے ہُوئے شاعر کے پیروں سے لپٹ گئے۔ جس طرح قصوروار بچّہ باپ کی گود میں مُنہ چھپا کر روتا ہے۔

رتن لال اور سوشیلا دونوں حیرت میں تھے۔ شاعر نے رکھائی سے کہا "یہ کیا کرتے ہو"

امرناتھ نے جواب دیا "میں نے تمہارا گناہ کیا ہے۔ جب تک معاف نہ کرو گے۔ پیر نہ چھوڑوں گا"

شاعر نے چند لمحہ تک غور کیا اور تب کہا "تمہیں شرم تو نہ آتی ہو گی"

"یہ کچھ نہ پوچھو۔ اب معاف کر دو"

"قدرت کے کان معافی کے نام سے ناآشنا ہیں۔ کفارہ دو"

"وہ میں کر دوں گا"

"کس طرح؟"

امرناتھ نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور شاعر کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ شاعر نے اُسے پڑھا اور سناٹے میں آ گیا "کیا تم یہ مضمون شائع کر دو گے؟"

"اس کے سوائے چارہ کار کیا ہے؟"

"اتنی شہرت چھوڑ دو گے؟"

"چھوڑ دوں گا"

"بدنام ہو جاؤ گے۔ لوگ تمہیں کیا کہیں گے؟"

امرناتھ نے اصرار کے ساتھ کہا۔ خواہ کچھ ہی کہیں۔ میں اپنے جرم کا اقبال کر لوں گا۔ اس سے میرا ضمیر مطمئن ہو جائیگا۔ شاعر! دُنیا مجھ پر رشک کرتی ہے۔ لیکن میری راتوں کی نیند حرام ہو چکی ہے۔ میں نے تمہاری محنت سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ تمہاری دماغی کاوشوں کی بدولت میرا نام یورپ تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن تابکے۔ تم یہ شہرت، یہ نام ایک دن میں مجھ سے واپس لے سکتے ہو۔ میں اُس کوے کے مانند ہوں۔ جس نے مور کے پر لگا کر خوبصورت مشہور ہونا چاہا تھا تمہاری نظموں کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے۔ اب میں چشمۂ خشک ہوں۔ دُنیا مجھ سے نئے خیالات، نئے

مضامین کا مطالبہ کریگی۔ میں اُسے کیا دے سکتا ہوں ـــــــــ نہیں نہیں میں اقبال کرلوں گا۔ اور تمہاری شہرت تمہارے حوالے کردوں گا۔ بولو مجھے معاف کردو گے ؟"

شاعر کا دل بھر آیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو لہرانے لگے۔ ان آنسوؤں میں دل کی کدورت بہہ گئی۔ اُس نے سچّے دل سے جواب دیا" یہ نہ کرو۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں"

امرناتھ تن کر کھڑے ہوگئے۔ اور بولے۔ کفارہ دئے بغیر مجھے چین نہ آئیگا"

یہ کہہ کر اُنھوں نے جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا اور شاعر کے حوالے کرکے کہا۔ "یہ تمہاری دولت ہے"

شاعر نے گِنا۔ تین ہزار کے نوٹ تھے۔ پوچھا۔ "یہ کیسے ہیں ؟"

"انگریزی ایڈیشن کی رائٹی ہے۔ اسے مستقل آمدنی سمجھو۔ میں نے پبلشر کو اطلاع دیدی ہے کہ آئیندہ رائٹی براہ راست تمہیں بھیجی جائے"

شاعر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ امرناتھ کے گلے سے لپٹ کر رونے لگے۔

صبح ہُوئی شاعر کی حالت میں نمایاں فرق واقع ہوچکا تھا۔ اتنے میں امرناتھ کا ایک ملازم آیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہُوا تھا۔ آتے ہی بولا" لالہ جی چل بسے"

شاعر کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ اُس نے زخمی پرندے کی طرح کے اضطراب سے کہا "کیا کہا تم نے ؟"

"لالہ جی چل بسے۔ رات کو کچھ کھا لیا"

شاعر کے دل میں کیا کیا اُمنگیں بھری ہُوئی تھیں۔ سب پر پانی پھر گیا۔ امرناتھ کی نیکیاں یاد آگئیں۔ کیسا فرشتہ سیرت آدمی تھا۔ گناہ کا کفارہ کس شان سے ادا کرگیا۔ ہاتھ آئی ہُوئی دولت کس آسانی سے میرے حوالے کردی۔ اور اتنا ہی نہیں میری شہرت مجھے واپس دے گیا اور اپنے ادبی جرم کا اقبال اپنے قلم سے کرگیا ہے۔ شاعر کا دل رونے لگا۔

معاً خیال آیا۔ اب "دُنیائے کہکشاں" کے مُصنّف ہونے کا دعوےٰ کرنا اوچھا پن ہے۔ وہ میرے ساتھ اس قدر نیکی کرتا تھا۔ کیا میں اُس کی لاش کو بے حرمت کردں گا۔ شاعر نے عالی حوصلگی کا ثبوت دینے کا تہیہ کرلیا اور تانگے میں بیٹھ کر سال بھر کی بیماری کے بعد پہلی دفعہ شمشان میں

پہنچا۔ وہاں شہر بھر کے علم دوست اصحاب جمع تھے۔ شاعر نے "اسیر کی شاعری" پر ایک عالمانہ تقریر کی۔ اور اُس کی تعریف میں لغات کے خوبصورت الفاظ ختم کر دئے۔

دوسرے مہینہ کا "آئینہ" شاعر کی ایڈیٹری میں شائع ہُوا اُس میں اسیر مرحوم کے نام سے ایک چبھتی ہُوئی نظم شائع ہُوئی جس کا عنوان "لُٹی ہُوئی شہرت" تھا۔ نیز شاعر کی طرف سے ایک مختصر سا نوٹ بھی چھپا:-

"اسیر مر گئے۔ لیکن اُن کی شاعری کو زوال نہیں۔ احباب یہ سُن کر خوش ہونگے۔ کہ اسیر اپنے پیچھے نظموں کا ایک قابل قدر غیر مطبوعہ مجموعہ چھوڑ گئے ہیں۔ یہ نظمیں آئینہ میں یکے بعد دیگرے شائع ہوتی رہیں گی"

سدرشن

میں ہستی کے بہترین خیالوں اور عملوں کو نہیں پا سکتا لیکن وہ مجھے پا لیتے ہیں۔

زندگی ایک قرض ہے جو موت کے بعد ادا کیا جاتا ہے۔

لہریں اور بحری پرندے مل جُل کر کھیلتے ہیں۔ لہریں بہ جاتی ہیں پرندے اڑ جاتے ہیں کچھ یہی حال ہم لوگوں کا ہے۔ زندگی کی گرم بازاری ہماری جامع ہے اور زمانے کی سرد مہری ہماری تفرقہ پرداز +

اُس کا غمگین چہرہ بارہا میری نیندوں کو اُچاٹ کر دیتا ہے۔

مرغزار کا سبزہ اُسی دُنیائے پاک کے شایاں نہ ہے جو اُس کی آزادیوں کا گہوارہ ہے۔

"گلچیں"

خود مختار رقاصہ

میرا عقل فریب رقص نہ کبھی ختم ہوا نہ ہوگا۔ ہر وقت ہر جگہ میرے پاؤں کی موسیقی اسیر جھنکار، سحر آموز حرکت، دلوں کو دماغوں کو اپنا شیفتہ و شیدا بنانے میں شاندار طریقے سے کامیاب رہی ہے اور رہیگی۔ مندر، مساجد، کلیسا، بامِ کوہ، گہوارۂ ابر، سقفِ فلک میری رقص گاہیں ہیں۔ صرف وقت مقام ہی نہیں بلکہ ساری آفریدۂ خیالِ دنیا، اُمید کی شگفتگی، عقائد کی درستگی سب میرے رقص کیلئے وقف ہیں۔ میں خود مختار ملکہ ہوں اور میرا پایۂ تخت مقدس کتابوں کے تراجم و تفاسیر۔ سائنس کے کارخانوں میں میری ٹکسال، مملکتی فرمانوں میں میرا دفتر، تواریخ میری سوانح عمری!!

میں ہی ہوں جو خدا کو بھی کہہ سکتی ہوں کہ اسکی آفریدہ نہیں۔ اسکی دنیا میں رہتی ہوں مگر اسکی نہیں۔ مُلک مُلک کے عارضی خدا میرے نام پر قربان ہُوئے میرے دھوکے میں وہ مٹائے گئے مگر مجھے آسیب نہیں۔

جو بات اصلی و حقیقی خدا، گو وہ مجھ سے بیگانہ ہے، اپنے لئے نہیں کر سکتا وہ اپنے نظر فریب رقص سے اپنے تخیّل رُباخرام سے میں اسکے لئے کرتی ہوں۔ وہ چھپ نہیں سکتا میں اسے ایسا چھپاتی ہوں کہ فلاسفر عقل کی خوردبین سے۔ بدھ راستی کی دُوربین سے اس کا نشان تک نہ پا سکے۔ وہ لم یلد و لم یولد بنتا ہے۔ اپنے شیوۂ مستانہ کے ایک کرشمہ سے اُسے صاحبِ اولاد میں نے بنایا۔ اُسے حاضر و ناظر ہونے کا دعوےٰ ہے دہریہ کے دل سے میرے پاؤں کی ایک لغزش نے اُسے قطعی محو کر دیا۔ اُسی خدا کے نام پر مجھے مٹانے کے لئے لاکھوں یورشیں ہُوئیں مگر میں ہمیشہ یورش کنندگان میں مل گئی۔ خود ناچی انہیں نچایا۔ میں ہمیشہ فاتح مجھ پر حملہ آور سدا مفتوح!

میں ناچتی ہوں۔ گاتی ہوں جشن مناتی ہوں کیونکہ دُنیا کے گراموفون میں جب کبھی انسانی کارناموں کا ریکارڈ ختم ہوتا ہے تو ہمیشہ میرے نام پر!

میرا نام ہے

غلطی

میری بہار بے خزاں، میرا حسن روزافزوں، میرا رقص عالمگیر۔ میں ثانئے ثانئے میں روپ بدل کرنت نئے رقص ایجاد کرتی ہوں۔ سمندر کی لہریں رُک جاتی ہیں مگر میری موجِ خرام نامتناہی ہے۔ میں ایک ہی ترانہ سو سو لَے سے گاتی ہوں کوئی اُسے انا الحق سنتا ہے کوئی ہذا الباطل مگر مجھے کیا؟ میں گاتی ہوں رقص کرتی ہوں۔ ثواب کے مزدور۔ حکومت کے غلام شہرت کے اجیر سب میرے رقص کے دلدادہ۔ میں اُن کے لئے ناچتی ہوں۔ اُنہیں اپنا بناتی ہوں۔ کوئی گھر کوئی دل میرے لئے بند نہیں مگر، مگر —— افسوس —— افسوس —— باوجود اس تمام اختیار کے باوجود اپنے کروڑوں شیدائی تماشائیوں کے اک خاص قسم کے دل کے آگے میں عاجز ہوں کہیں کہیں دُنیا میں ایسے انسان بھی ہیں جن کے دل میں نہ شک نہ شکایت۔ جنہوں نے اپنے آپ کو خدا کے پاس بیچ دیا۔ جو سیدھے راستے پر بلا خوف، بلا تعجیل، کسی اُمید پر نہیں بلکہ محض ادائیگیِ فرض کی خوشی میں بے مُنہ موڑے چلے جاتے ہیں۔ وہ تسلیم کی خو والے رضاکار جن کے زبانی اقرار کو تصدیق بالغیب کی مُہر لگی۔ جن کی حقیقت بین پیار بھری نگاہیں اور سب کچھ دیکھتی ہیں مگر مجھے کہیں نہیں دیکھتیں!

جب میں اِک ایسے انسان کو دیکھتی ہوں جو مجھے کہیں نہیں دیکھتا تو میرے برق رفتار پاؤں سُن ہو جاتے ہیں۔ میرا نہ تھمنے والا ترانہ بند۔ میں ڈر جاتی ہوں! میں مر جاتی ہوں!!

عبدالعزیز

اس غمگین و شادان زندگی میں جو خدا نے مجھے عنایت کی ہے اگر میں بغیر ماضی کی یاد یا مستقبل کی ہوس کے ہر روز اپنا صحیح خیال رقم کرتا رہوں تو مجھے شک نہیں کہ یہ روزنامچہ ترتیب شدہ پایا جائیگا اگرچہ نہ وہ ترتیب عمداً کی گئی ہو اور نہ میں اُسکو دیکھ سکوں، میری کتابوں سے چیل کے درختوں کی خوشبو آئیگی اور چڑیوں کے دلکش چہچہے سُنائی دینگے۔ ابابیل جو میرے دریچے کے سامنے اُڑ رہی ہے اک تار یا تنکا اپنی چونچ میں اٹکائے ہوئے ہے جس سے میری راگنیوں کی تنظیم ہو گی +

شب تاریک و مہرِ منوّر سے کہتی ہے" چاند کی روشنی تیرا محبت نامہ ہے اور شبنم کے آنسو میرا جواب!"

گلچیں

رونا ایک زبان ہے

دو مہینہ کی ایک لڑکی کو نمونیہ ہوگیا تھا۔ سانس کا رُکنا۔ ہاتھ پاؤں کی بے چینی اس بے زبان بتیتری کو کُملائے دیتی تھی۔ اس نے سینہ کی چھُپی ہوئی تکلیف سے بے تاب ہو کر رونے کی آواز نکالی اور صورت بھی بنائی۔ حلق صاف نہ تھا۔ آواز صاف نہ نکلی۔ ہاں رونے کی صورت سے مجھے شُبہ ہُوا کہ شاید یہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ تندرستی میں جب وہ بھوک سے روتی تھی تب بھی بارہا اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ رونا وہ بھی تھا رونا یہ بھی ہے۔ مگر وہاں شکل کا اور نقشہ تھا۔ یہاں وہ نہیں دوسرا ہے۔

قدرت کی آزاد زبان میں اس نے مجھ سے کہا مجھے بہت تکلیف ہے۔ اور اس بیان نے میرے دل کو بیقرار کر دیا۔ جب آدمی کی بناوٹی زبان بولنے لگتی ہے تو رونے کی قدرتی زبان خاموش ہو جاتی ہے۔ رونے کی زبان کا کام اسی طفلی کے زمانہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ اسکے بعد وہ یا تو اُستاد کے جبر سے کبھی کبھی کچھ کہتی ہے اور یا جوان ہونے کے بعد کسی خوف۔ کسی محبت۔ اور کسی غم کی حالت میں بولتی ہے۔ ہاں ہوش کے ہر زمانہ میں اسی رونے کی زبان میں خدا سے باتیں کیا کرتا ہے۔ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے۔ یا وہ اپنے خدا کی بڑائی اور اپنی ناتوانی کے تصوّر سے جوش میں آتا ہے تو اس جوشِ باطن کو رونے کی زبان میں خدا پر ظاہر کرتا ہے۔ اور خدا اپنے بندوں سے رونے کی زبان میں کلام کیا کرتا ہے۔ خدا نہیں روتا۔ بندہ ہی روتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ہی رونے میں خدا کا جواب بھی سُن لیتا ہے۔

جو قومیں رونے کو عیب کہتی ہیں انکو خدا کی اس پوشیدہ زبان کا یقین نہیں ہے جسکے ذریعہ سے ایشیا کی اقوام خدا سے ہم کلام ہوتی ہیں۔ خدا اس زبان پر بہت مہربان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معصوم بچّوں کو دی جاتی ہے جن سے خدا بہت محبت کرتا ہے۔ جانوروں کے بچے جلدی چلنے پھرنے اُڑنے اور کھانے پینے کے قابل ہو جاتے ہیں اِنسان کے بچّے مدت تک بے بس پڑے رہتے ہیں۔ اس واسطے خدا نے ان کو رونے کی زبان دی ہے جس سے وہ اپنی بیکسی کے زمانہ کو آرام سے گزار سکتے ہیں۔

حسن نظامی

لغات الجاہلین

بجلی۔ پرانے وقتوں میں وسعتِ آسمان میں آوارہ پھرنے والی اک ڈراؤنی بلا۔ نئے زمانے میں تنگیٔ مکان میں محبوس رہنے والی ایک گستاخ حسینہ جو دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہماری طرف دیکھتی ہے۔

تولیہ۔ انسان کی تردامنی کا حال۔ (ب)

تعلیم۔ موجودہ ہندوستان میں ایک عجوبہ زا مشغلہ۔ جو اب سے دو سال پیشتر ہر ہندوستانی کے لئے دین و ایمان سے زیادہ ضروری تھا لیکن اب نوجوانوں کے لئے زہرِ قاتل۔ روح سوز۔ غلام ساز۔ یہ اور وہ اور خدا جانے کیا کیا اس پر طرّہ یہ کہ صنفِ نازک تر (اسکول کے بچوں) کو جب تک وہ اسکول میں ہو یہ زہرِ قاتل ضرر رساں نہیں۔ (تاجور)

خدا۔ سادہ لوحوں کو ڈرانے کی "بیجا" اگلے زمانے کے ایک بزرگ۔
ایک باپ جس کی اولاد بوڑھا سمجھ کر اس کا کہنا نہیں مانتی۔

درخت۔ ایک ٹیڑھا شہتیر جس پر پھولدار کام کیا ہوتا ہے۔ (ب)
زمین کی دعا خدا کے حضور۔ (ٹیگور)

سائنس۔ جدید تعلیم یافتوں کا وحدہٗ لاشریک۔

شاعر۔ عقل کا اک دیوالیہ جس کی دنیا کے کسی بازار میں پوچھ نہیں۔
جو نظم کے توڑ جوڑ میں اپنے شیرازے کو بکھیر چکا ہے۔
جو استخوان گداز قحط کی حالت میں بھی عشق کی قصیدہ خوانی نہیں بھولتا حالانکہ عشق کے کوچے سے اتنی دور ہے جس قدر اس سے اس کی عقل۔
ایک بگڑے ہوئے بزرگ جنہیں یار لوگ جتنا بنائیں بنتے جائیں گے۔
جن کے نزدیک سب سے بڑا سخن فہم وہ ہے جو انکی ہر تک بندی پر "واہ جناب پھر ارشاد ہو" ور قلم توڑ دئے "ہ" قافیہ چھین لیا" جیسے بے روح الفاظ کی بارش کر دے۔ (تاجور)

محفل ادب

تلمیحات کا دائرہ وسیع کرنیکی ضرورت۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ زبان سے غفلت کرنا ایک ایسا گناہ ہے، جو کسی طرح قابل معافی نہیں ہے۔ اخبار نویس رسالوں کے مرتب کرنے والے "شاعر" انشا پرداز اور مُصنّف، جنہوں نے اب تک زبان کی طرف سے غفلت کا اظہار کیا ہے اگر چاہیں، تو نئے الفاظ، نئے محاورات، نئے استعارات، نئی اصطلاحات اور نئی تلمیحات سے ہماری زبان کو مالامال کر سکتے ہیں۔ میں عام زبان کی توسیع پر یہاں اظہار خیالات نہیں کرتا۔ صرف تلمیحات پر بحث کرنی چاہتا ہوں۔ موجودہ تلمیحات کا بیشتر حصہ عرب و ایران سے لایا گیا ہے۔ ہندوستانی تلمیحات عام بول چال میں کسی قدر ہیں، مگر وہ لائق شمار نہیں ہیں۔ ہندوستان کی زبانوں اور اُن کے ادبیات سے نفرت و گریز کرنے کے بعد کوئی حق نہیں ہے۔ کہ ہم اُردو زبان کو ہندوستان کی مشترک زبان کا خطاب دیں۔ اگر آپ جرمن، فرانسیسی، یا انگریزی زبان کی لغات کھول کر دیکھیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُنھوں نے تمام دُنیا کی زبانوں اور ادبیات سے فائدہ اُٹھایا ہے کوئی مذہب کوئی زبان کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں ملیگی، جس کے عقائد، رسوم، اوہام، تاریخ اور ادب کے متعلق ضروری الفاظ ان ترقی یافتہ زبانوں میں موجود نہ ہوں۔ گویا اُنھوں نے اپنی زبانوں کے ادب کو ایک عالمگیر ادب بنا دیا ہے۔ کیا ہمارے لئے یہ بات شرم کی نہیں ہے کہ ہم نے اپنی زبان کو اب تک ہندوستانی زبان کہلانے کا مستحق بھی ثابت نہیں کیا۔ اگر ہم فراخ دل ہوتے، اگر ہم میں تعصب کی جھلک نہ ہوتی اگر ہم کو اپنی زبان سے محبت ہوتی۔ اگر ہم اپنی زبان کے ساتھ اپنے وطن کی عزت بھی کرنا چاہتے، تو پھر ہمارا فرض تھا کہ جتنی قومیں ہندوستان میں آباد ہیں، اُن کے عقائد و اوہام اُن کے رسم و رواج اور اُن کی تاریخ و ادب کے تمام ضروری الفاظ اپنی زبان میں داخل کر لیتے اور اس دائرہ کو اس قدر وسیع کرتے کہ ہندوستان کی کوئی موجودہ زبان اُس کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ اگر عام بول چال میں تغیر و تبدل کرنیکا اختیار ہم نہیں رکھتے، تو یہ بات تو ہماری قدرت میں ہے کہ ہم اپنے ادبیات کا دائرہ وسیع کر دیں اور اُس کو ہندوستان کے تمام تعلیمیافتہ باشندوں کے

حدود میں دیکھنا چاہیئے۔

مثلاً اگر کسی غزل میں کھدّر پوشی اور چرخہ کی محبوبیت کا اعلان نہیں تو اس میں شک نہیں۔ کہ شاعر، گاندھی نہیں ہوسکتا، اور سیاسیات میں اُس غزل کو کوئی مرتبہ نہیں دیا جاسکتا، مگر ادبیات میں دیکھئے شاید وہ روحِ ادب کہی جاسکے۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ ملٹن یا تو ڈارون ہوجائے ورنہ ملٹن کوئی چیز نہیں۔ اور میر تقی اُسی وقت میر ہوسکتے ہیں۔ جب وہ امراء القیس بن جائیں نہیں میر نہیں۔ پھر اردو شاعری میں اگر ریگستان، اونٹ، اور عربی خونریزیاں اور تعلیاں نہیں تو بیزاری کا کیا واقعہ ہے، یہ دیکھئے کہ فنونِ ادب و شعر کے اعتبار سے اُس میں کتنے محاسن ہیں اور کتنے خیالات و مضامین کو کس کس طرح ادا کرتی ہے۔

شعر کا موضوع، حسن اور اُس کے تاثرات یا عشق اور اُس کے محرکات پر مشتمل ہے۔ اور ہر زبان و دور کی شاعری مخصوص محبوبات و تاثرات کی تفسیر ہوسکتی ہے ورڈسورتھ کا محبوب "جلوہ آثار کائنات" تھا۔ غالب کا معشوق "جمالِ خیال اور حسن انسانی" تھا اور کسی قومی شاعر کا مطلوب "حسن اعتبار" ہوسکتا ہے سب کو اپنے اپنے رنگ میں دیکھئے اور جب ورڈسورتھ کو گلیڈ اسٹن غالب کو محمد علی (ایڈیٹر کامریڈ) اور حالی کو متنبی دیکھنا چاہو گے تو کچھ نظر نہ آئیگا۔ ہومر کا کمال اسکندر اعظم ہونے پر منحصر نہیں، اور والمیکی کو رامچندر جی سے کیا سروکار، حیثیات و مراتب میں بوقلمونیاں ہیں۔ کوئی شخص اگر ایک قسم کا ذوق رکھتا ہے۔ ایک ہی قسم کی بینش کا عادی ہے اور ایک ہی کمال کی قدر کرسکتا ہے، تو یاد رکھنا چاہیئے کہ فطرت کے تنوعات کبھی ایک سانچہ میں نہیں ڈھل سکتے +

نقاش

ریڈیم۔ اس وقت تک جس قدر معدنی اشیاء دریافت ہُوئی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ قوی، سب سے زیادہ قیمتی، اور سب سے زیادہ عجیب و غریب ریڈیم خیال کیجاتی تھی، جسے پولینڈ کی ایک خاتون نے دریافت کرکے عالم ایجاد میں ہلچل ڈالدی ہے۔

ریڈیم، بلوری قسم کا سپید سفوف ہے جس میں مختلف دھاتیں ملی ہوتی ہیں۔ اس کی قوت تنویر اس قدر زبردست ہے کہ اشعۂ راانتجنی (X - rays) اس کے سامنے کوئی

حقیقت نہیں رکھتیں۔ اس کی شعاعیں، سورج کی کرنوں کے برابر تیز دوڑتی ہیں۔ اور تین فٹ موٹے لوہے کے اندر نفوذ کر جاتی ہیں۔ یعنی اگر آپ چاہیں تو ریڈیم کی مدد سے نہایت ٹھوس صندوقوں کے اندر کی چیزوں کو جلا کر خاکستر کر سکتے ہیں۔

پروفیسر کیوری (اس خاتون کا شوہر) کہتا ہے کہ اگر کسی کمرے میں دو پونڈ ریڈیم موجود ہو، تو وہ کبھی اس کے اندر جانے کی جرأت نہ کریگا، کیونکہ اس کی شعاعیں نہ صرف آنکھوں کی بینائی سلب کر لیں گی بلکہ سارے جسم کو خاک کا ڈھیر بنا دیں گی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جس قدر ریڈیم دنیا میں اس وقت تک فراہم ہو چکا ہے، اگر اس کا وزن کیا جائے، تو اس کی مقدار زیادہ سے زیادہ ۲ پونڈ ہو گی۔ لیکن اسی قلیل مقدار میں اتنی قوت پنہاں ہے کہ اگر اُس سے کام لیا جائے تو سارا کرۂ ارض اپنے محور سے ہٹ جائے اور تمام نظام عالم چند سیکنڈ میں درہم برہم ہو جائے۔ ریڈیم کے اندر سے جو مادی ذرات نکلتے رہتے ہیں۔ اُن کی رفتار کا اندازہ ۱۲ لاکھ میل فی سکنڈ کیا گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت کسی قدر حیرت ناک ہے کہ اجزائے ریڈیم بہت کم فنا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اس کے ایک مربع انچ ٹکڑے کو یونہی چھوڑ دیا جائے، تو وہ دس لاکھ سال تک برابر منوّر رہیگا۔

ولیم ہیمر نے، جو نیویارک کا برقی انجنیر تھا، ریڈیم کی مدد سے بہت سی تصویریں لی تھیں۔ اِن میں ایک تصویر اُس چوہے کی بھی تھی، جو نہایت دبیز صندوق کے اندر کئی کملوں میں لپیٹ کر رکھدیا گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ریڈیم کی قوت نفوذ کس حد تک بڑھی ہوئی ہے

ریڈیم سے زمانۂ آئندہ میں کیا کیا کام لئے جائیں گے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت تک جو کام اس سے لئے گئے ہیں، اُن میں بہترین، سرطان کا علاج اور کھوئی ہوئی بصارت کا واپس لے آنا ہے۔

چونکہ ریڈیم، نہایت کمیاب چیز ہے اس لئے عام تجارت یا صنعت و حرفت کی دُنیا میں اس کا ترقی پانا دشوار نظر آتا ہے، تاہم یہ ممکن ہے کہ کسی وقت روشنی کا انحصار بالکل ریڈیم پر ہو جائے، کیونکہ اس کا ایک ذرہ بھی متعدد کمروں کو ایک صدی تک مسلسل روشنی دے سکتا ہے۔ اس کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک ٹن ریڈیم اگر کسی کے پاس ہو تو وہ پانسو ٹن وزن کو

ایک میل کی بلندی تک اٹھا سکتا ہے یعنی صرف ایک اونس ریڈیم پچاس گھوڑوں کی قوت سے ایک انجن کو بحساب ۳۰ میل فی گھنٹہ، سارے کرۂ ارض کا طواف کرا سکتا ہے۔ اور برطانیہ و فرانس کے تمام جہازوں کو چشم زدن میں سطح آب سے اُٹھا کر خشکی میں پھینک سکتا ہے +

(نگار)

مفید اور دلچسپ مشورہ۔ امریکہ میں طاقت تولنے کی ایک مشین ایجاد ہوئی ہے جس پر گھونسہ مارنے سے نمبروں کی ایک خاص تعداد سامنے آجاتی ہے۔ اس مشین پر شیر نے گھونسہ مارا تو ۴۰۴ نمبر وزن تھا۔ اور ایک نہایت مضبوط اور زبردست آدمی نے گھونسہ مارا۔ تو نمبروں کی تعداد ۴۰ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ایک دفعہ دربار شاہی سے امیر خسرو کو ایک ہاتھی کے ہموزن سونا دینے کا حکم ہوا۔ کونسی ترازو تھی جس کے پلے ہاتھی کو اُٹھا سکتے۔ آخر ہاتھی کو ناؤ میں سوار کیا گیا اور ناؤ جتنی پانی میں دبی اُس پر نشان لگا دئے گئے پھر ناؤ میں سونا بھرا گیا۔ کہ پانی اُن ہی نشانوں کے برابر آگیا سچ یہ ہے کہ شیر میں غیر معمولی طاقت ہے اور تمام جانداروں سے زیادہ وزنی ہے۔ لیکن انسان جس میں نہ اتنی طاقت ہے اور نہ اِتنا وزن۔ ہاتھی کے سر پر سوار ہے۔ اور شیر کو اُس نے ایک کٹہرے میں بند کر رکھا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ انسان کیوں اتنا غالب ہے۔ اور یہ شہ زور جانور کیوں ایسے مغلوب ہیں؟ صرف ایک وجہ ہے یعنی انسان اپنی طاقت سے واقف ہے۔ اور یہ حیوانات اپنی طاقت سے ناواقف ہیں اب اس نظریہ کو ملحوظ رکھ کر اقوام عالم کو دیکھئے۔ جن قوموں کو یہ راز معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہیں وہ کامیاب ہیں۔ اور عروج کی بلندیوں پر نظر آتی ہیں لیکن جن قوموں نے ابھی تک یہ سوال حل نہیں کیا۔ وہ قعرِ پستی میں افتادہ ہیں +

(تاجور)

دی کیچر دہلی

جاتری۔ اے جاتری! تھکے ماندے سال کی رات بیت چکی۔ چمکنے والا سورج ترے رستے ملک الموت کی آواز کو لے آیا وہ آواز جو گئے گذرے زمانے کے گناہوں کے لئے ایک آتشیں تازیانہ ہے۔ فاصلے کی اک باریک سی لکیر رستے کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ہے جیسے کسی گم گشتہ راہ طلب فقیر کی اکتاری بانسری کی اُونچی باریک سُر!

تو رستے کی بھُوری گرد کو اپنی دایہ بنالے! خدا کرے وہ تجھے اپنی گود میں اُٹھا لے اور تجھے دامنگیر تامل کی گرفت سے بچا کرلے چلے!

گھر کا راگ، چراغِ شام کی روشنی، دربان عاشق کی ہتین گنگکی یہ تیرے لئے نہیں؟ تو ہمیشہ تحفۂ حیات کا آرزومند رہا ہے اور تحفہ خوشی یا سکون و آرام میں نہیں ملتا سو تیرے لئے وقت آگیا ہے کہ تو ہر در سے دھکیل دیا جائے۔

جفا کار آپہنچا ہے ــــ تیرے دروازے کی بھاری آہنی زنجیریں ٹوٹ گئی ہیں۔ تیرا شراب کا پیالہ چکنا چور ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑلے جسے تو نہیں جانتا جسے تو سمجھتے بھی ڈرتا ہے۔

اے جانثری! ہرگز نہ ڈر! ــــ سچائی کے تشدد سے کنارہ نہ کر، نقل کے کالے بھوت سے راہ نہ کترا۔ اس سے جو سب کچھ چھین لیتا ہے اپنا آخری تحفہ قبول کرلے!

کیا طول طویل رات تمام ہو چکی؟ تو ہو چکنے دے؟!

(ب) ٹگور (ماڈرن ریویو)

اعلیٰ و ادنیٰ شاعر۔ بڑے اور چھوٹے شاعر میں فرق قواعد عروض پر عمل کرنے میں نہیں ہوتا بلکہ اکثر زیادہ قاعدہ شناس شاعر شاعرانہ بلندیوں تک رسائی نہیں پاتا یہانتک کہ ہم عموماً زیادہ مہارتِ فن کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اصلی فرق اس شئے کا ہوتا ہے جو فقط شاعر کی خصوصیت نہیں بلکہ جو تمام طبع زاد فنون کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ ہے اجمالی اور راسخ مشاہدہ کی قوت! ہر قسم کے اعلےٰ آرٹ سے ہمارا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ وہ دنیا اور انسانیت کے وسیع و عمیق مطالعہ پر مبنی ہو۔

کسی شاعر کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایک لمبی نظم لکھے لیکن کام کی باتیں اس میں ڈھونڈے سے ملیں۔ اس کے برعکس ایک مختصر سی نظم دوربیں مشاہدہ سے لبریز ہو سکتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان فرق ایسا ہی ہوتا ہے جیسا طبیعات میں دو اشیا کے مختلف وزنِ مخصوص میں ہو۔ یا یوں کہئے کہ ایک میں توازن ہوتا ہے دوسرے میں نہیں ہوتا۔ جب ہم کسی شاعر کے سارے کلام پر نقد و تبصرہ کرنے لگیں تو اس صفت کی موجودگی یا فقدان کی اہمیت انتہا درجہ بڑھ جاتی ہے یہ حکم لگاتی ہے کہ اس شاعر کا درجہ تاریخ میں کیا ہے؟ اور کیا ہوگا!

شعر کا زیادہ گرانڈیل ہونا اگر نقص ہے تو اک نقصِ محمود ہے کیونکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اک ایسی کان ہے جسے ہم جب چاہیں کھودیں ہمیشہ اس میں نت نئے خزانے نکلتے رہیں گے۔

ایسے کلام میں ایک پائیدار جوہر پوشیدہ ہوتا ہے جو کم پایہ کلام میں کبھی دیکھنے میں نہیں آتا اور کلام کا پائیدار ہونا اُس کے اعلےٰ ہونے کا لاتردید ثبوت ہے!

(ب)

(شمع)

ایک فرانسیسی شاعرہ کی ادبی سرفرازی۔ گذشتہ ماہ جنوری میں کونٹس دی نوایل فرانسیسی شاعرہ بلجیم کی لٹریری اکاڈیمی کی ممبر بنائی گئیں۔ کونٹس دی نوایل فرانس میں امیرالشاعرات کا رتبہ رکھتی ہیں۔ بلجیم جاتے ہوُئے کونٹس موصوفہ کا استقبال عظیم الشان شہر بروکسل میں کیا گیا۔ اسٹیشن پر حکومت بلجیم کا نمائندہ فرانسیسی سفارت کے ارکین۔ اور بڑے بڑے اہل قلم موجود تھے فرانسیسی سفارت میں انہیں پارٹی دی گئی۔ اکاڈیمی کے اس جلسہ میں جو کونٹس دی نوایل کے خیر مقدم کے لئے منعقد ہوا تھا شاہ بلجیم بھی شریک ہوُئے۔ اکاڈیمی کے صدر نے کونٹس کا خیر مقدم کرتے ہوُئے ان کی شیریں شاعری اور ادبی رتبہ کا ذکر کیا شاعرہ موصوفہ نے صدر کی خیر مقدمانہ تقریر کا فصیحانہ انداز میں جواب دیتے ہوئے علم لغت فنِ شاعری۔ اور تاثیرِ شعری پر تقریر کی اثنائے تقریر میں اُس ادبی تعلق پر بھی روشنی ڈالی جو فرانس اور بلجیم کے درمیان ہے۔ اہلِ جلسہ کے پرزور چیئرز پر تقریر ختم ہوُئی۔ ابتک فرانسیسی اکاڈیمی میں عورتوں کو رکنیت کا حق حاصل نہ تھا۔ بلجیم کی نسواں نوازی کو دیکھ کر فرانس کے نسوانی اخباروں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس کی طبی اکاڈمی نے مشہور فرانسیسی عالمہ مدام کوری کو (جنہوں نے ریڈیم کا انکشاف کیا ہے) اپنا رکن بنالیا +

تاجور

الہلال (مصر)

حصۂ نظم

رباعیات گرامی

ہر مورد ماغ اجتہادے دارد　　ہر ذرّہ نگاہ کیقبادے دارد
در عقدۂ کارِ خویش بر خویش مپیچ　　بکشائے کہ ہر گرہ کشادے دارد

در حکمت و عقل بیدپا دانندم　　در شعر سنائیِ دِگر خوانندم
ویں بوالعجبی ہاکہ بسانِ خورشید　　خوانند ولیکن از نظر رانندم

ما سوختگاں زراہِ دُور آمدہ ایم　　در ظلمتِ امتحاں ز نور آمدہ ایم
درآمد و رفتِ ماست آتش مضمر　　مضطر برویم و ناصبور آمدہ ایم

بر چرخ ستارہ جستجوئے دارد　　ہر ذرّہ بخاک آرزوئے دارد
دارد ہر رہ نورد شورے در سر　　پیداست کہ ہر دماغ بوئے دارد

مارا در راہِ دوست کارے دگرست　　ذوقے دگرست انتظارے دگرست
ما سوختگاں ز آتشے گل چینیم　　گلزارِ خلیل را بہارے دگرست

زیب النساء کی قبر

زیب النساء کی قبر جو تھی خاک میں نہاں　　صدیوں کے بعد اُس کا ملا گم شدہ نشاں
مشہور ہے جو تیس ہزاری کے نام سے　　تھا گنجِ بے بہا اُسی میدان میں نہاں
مٹی میں مل رہا تھا دُرِ شاہوار حیف　　اوجھل نظر سے خاک کے تودوں کے درمیاں

شائد پسِ فنا یہ تخلص کا تھا اثر — مخفی کی قبر بھی جو خفا میں رہی نہاں
اُگلا ہے خود بخود یہ دفینہ زمین نے — ممنونِ جستجو نہیں رُودادِ بیکساں
تصویرِ دستبردِ حوادث ہے سربسر — اُبھرا ہے فرشِ خاک پہ جو نقشِ رائگاں
گنبد ہے۔ مقبرہ ہے۔ نہ لوحِ مزار ہے — تعویذ قبر کا بھی ہے مِٹتا ہُوا نشاں
نے شمع ہے۔ نہ چادرِ گُل ہے نہ قبر پوش — مٹی کا ایک ڈھیر ہے۔ عبرت کی داستاں
ویرانیٔ لحد ہے مجاورِ سرِ مزار — زائر ہجومِ یاس تباہی ہے پاسباں
ہے گرد سے اُٹا ہُوا انبار خاک کا — سبزہ تو کیا کہ شکلِ نمو بھی نہیں عیاں
اُڑتی ہے خاک اور برستی ہے تیرگی — چھایا ہُوا ہے حسرت و اندوہ کا سماں
روتی ہے بیکسی سرِ بالیں کھڑی ہُوئی — تربت پہ کس مپرسی کا عالم ہے نوحہ خواں
بادِ صبا چڑھاتی ہے چادر غبار کی — ہیں ذرہ ہائے ریگِ بیاباں گہر فشاں
ہے اُس کی خوابگہ یہ شبستانِ خاک اب — زیبندہ جس کے دم سے تھے قصرِ فلک نشاں
جو دُختِ نامہوش شہِ ہندوستان کی تھی — تھا مصدرِ سخا و کرم جس کا آستاں
روشن چراغِ بزمِ سخن جس کے دم سے تھا — مشہور تھی جو شاعرۂ فیض ترجماں
اِس کو پسِ فنا ہے یہ مٹیا محل نصیب — دامن کو جس کے گردِ سرِ راہ تھی گراں
سچ ہے نہیں زمانے کو یک وضع پر قرار — نیرنگِ روزگار چنیں ہے گہے چناں
برحق کہ بے ثبات ہیں اسبابِ ظاہری — سچ ہے کہ انقلاب کی تصویر ہے جہاں
ہے امتیازِ شاہ و گدا تا بہ زندگی — ہے زیرِ خاک پست؟ بلندیٔ عز و شاں

وہ آج غرقِ خوں ہیں جو کل محوِ ناز تھے
وہ آج سرنگوں ہیں جو کل سرفراز تھے

برق دہلوی بی اے



جذباتِ عالیہ

گرامی

شکوہ بر نمی تابد نالہ بیزبانیہاست — مدعا نمی فہمد گریہ ترجمانیہاست
مدعی سر خود گیر بیخودی بہل یکچند — بر نخیزم از کوئش زور ناتوانیہاست
اندکے تو اے صیاد بند از قفس برگیر — مرغِ نو گرفتارم ذوق پرفشانیہاست
ہاں وہاں چہ سحر انگیخت چشمِ سرمہ آلودش — خامشی بحرف آمد حرفِ بیزبانیہاست
شہرِ عشق را نازم طرفہ دارد آئینے — مدعاست نومیدی مرگِ زندگانیہاست
بر شجر تجلی ریخت موسیٰ از تغافل سوخت — رمزِ بے نیازیہاست زخمِ لن ترانیہاست
حکم آرمیدن نیست رخصتِ تپیدن نیست — عاشق آزمائیہاست بسمل امتحانیہاست
مرگِ بے اجل خواہی عشق را صلا در دہ — زندگانی عاشق مرگ زندگانیہاست
قاصدِ گرامی را کامد از سر کویش — زیر لب تبسم چیست سخت بدگمانیہاست

ریاض گورکھ پوری

مکان ملتے ہیں کیا لامکاں نہیں ملتا — نشان لاکھ ہیں لیکن نشاں نہیں ملتا
کہیں بھی جائیں کہاں آسماں نہیں ملتا — لحد ہی ایک جگہ ہے جہاں نہیں ملتا
سُنی ہے میں نے بھی رنگیں نوائی ناقوس — مرے گلے سے یہ وقتِ اذاں نہیں ملتا
ہُوئی ہے روشن اُسی سے مری یہ پیشانی — جبینِ عرش کو وہ آستاں نہیں ملتا
یہ چاہتا ہوں کہ بے مُنہ کے آبلوں سے نبھے — کہیں بھی خار کوئی بے زباں نہیں ملتا
بہار آتے ہی پھولوں نے چھاؤنی چھائی — کہ ڈھونڈتا ہوں مجھے آشیاں نہیں ملتا
ہزار چاہے ترنم ہوا کی موجوں کا — خموش پھولوں کا حسنِ بیاں نہیں ملتا
یہ شب گزارِ حرم ہے ضرور اے ساقی — کسی سے رات کو پیرِ مغاں نہیں ملتا

ہر ایک بات سے اس کی لہو ٹپکتا ہے
کوئی بھی دل سا ہمیں نوحہ خواں نہیں ملتا

خدا کے واسطے پہنچا دے کوئی منزل تک
بچھڑ گیا ہوں مجھے کارواں نہیں ملتا

چلے نہ ہاتھ گلے پر تو خود ہی چل جائے
شکائتیں ہیں کہ خنجر رواں نہیں ملتا

شفق کھلی نہ سرِ قبر پائے رنگین سے
زمیں سے جھک کے کبھی آسماں نہیں ملتا

زبانِ حال میں ان کی عجب لطافت ہے
کسی سے پھولوں کا حسنِ بیاں نہیں ملتا

ریاض چھانٹ لیا اُس نے مجھ سے بوڑھے کو
کوئی بھی دخترِ رز کو جواں نہیں ملتا

وحشت کلکتوی

گو نہ ہو پوری، مگر اک آرزو دل میں رہے
یونہی کچھ کچھ لطف اپنی سعیِ باطل میں رہے

شوقِ شور انگیز نے دم بھر نہ دم لینے دیا
عمر بھر مصروف ہم قطعِ منازل میں رہے

اے فروغِ حسن! روشن کر بساطِ بزمِ شوق
اے کمالِ عشق! دل کی آرزو دل میں رہے!

تھا زیارت گاہِ اربابِ نظر اُن کا جمال
شمعِ محفل ہی رہے جب تک وہ محفل میں رہے

میں ہی تنہا کیا اُٹھاؤں لطفِ سوزِ عشق کا
کچھ مرے دل میں رہے اور کچھ ترے دل میں رہے

قعرِ دریا کا تلاطم تھا طلبگارِ حریف
حیف اُن لوگوں پہ جو آغوشِ ساحل میں رہے

عمر بھر کھایا کئے وحشت فریب آرزو
پھر کہاں نکلے وہ ارماں آ کے جو دل میں رہے

شوق قدوائی

سیکھو وفا۔ جو دلبر بننے کا حوصلہ ہے
انسان کی کسوٹی۔ اس کا معاملہ ہے

پہچان کیا بتاؤں؟ وہ پوچھتے ہیں مجھ سے
دونوں میں کون دل ہے اور کون آبلہ ہے

دل میں امنگ آئی۔ تو عشق کیوں نہ آتا
آخر شباب ہی کا اک یہ بھی ولولہ ہے

صورت تو دیکھتے ہو۔ پھر پوچھتے ہو ناحق
تم آپ جانتے ہو جس بات کا گلہ ہے

یہ سب ہیں تیرے قیدی جن سے ہے تو مخاطب — زنجیر سے زیادہ۔ باتوں کا سلسلہ ہے
پوچھے جو کوئی دل کی۔ تو کون اب بتائے — وہ بیزباں ٹھیرا جس کا معاملہ ہے
غفلت کی رہبری سے پہنچے قریب منزل
سکتے سے شوق اجل تک کون ایسا فاصلہ ہے؟

سائل

اس کو کہتے ہیں قناعت قول یہ سائلؔ کا ہے — گوہرِ شہوار تنخالہ لبِ ساحل کا ہے
آپ یہ سمجھے کہ گویا تیر مارا آپ نے — ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ جذبہ ہمارے دل کا ہے
آرزومندِ شہادت سر خمیدہ ہو گئے — دیکھئے اب کیا تقاضا ہمتِ قاتل کا ہے
عشق میں رسوائیوں کا کونسا پہلو بچا — یہ نتیجہ عمر بھر کی سعی لاحاصل کا ہے
دوستوں کی اشک شوئی سے مجھے کیا فائدہ — اُن کو آنکھوں کی پڑی ہے مجھ کو رونا دل کا ہے
حسرتِ دیدار رہ جائیگی رُک اے تیغ تیز! — آنکھ پر بسمل کی پردہ دامنِ قاتل کا ہے
قصدِ الفت کر رہا ہوں ترک الفت کرکے میں — پھر مرے دل میں خیال اک سعی لاحاصل کا ہے
داستان فرہاد کی ہو یا فسانہ قیس کا — جب نظر فرمائیگا تہ میں جلوہ دل کا ہے
فکر اب اُس زلف رہ کی چاہیے سائلؔ تجھے — وہ جو باقی مرحلہ اک دور کی منزل کا ہے

"خنجر لکھنوی"

شکوہ سنجِ اثر، خوگرِ فریاد بھی ہے — واہ، کیا چیز؟ ہمارا، دلِ ناشاد بھی ہے
جور کیوں دل پہ کئے؟ سوچئے، کچھ یاد بھی ہے؟ — ہوئے ایجاد، تو کچھ، باعثِ ایجاد بھی ہے
آ گئے ہو، تو ذرا دیکھ لو، انجامِ وفا — کس کی؟ ٹوٹی ہوئی یہ قبر ہے، کچھ یاد بھی ہے؟
تھا کبھی بستۂ فتراکِ جفا، صید کوئی؟ — اے مرے بھولنے والے، تجھے اب یاد بھی ہے؟
توڑ دے عہدِ وفا، دل پہ جفا کر، "لیکن" — یہ سمجھ لے، کہ "اسی دل میں، تری یاد بھی ہے"
زمزموں کو مرے، کیا جانئے، کیا سمجھا ہے؟ — کہ مری تاک میں گلچیں بھی ہے، صیاد بھی ہے!

گو، ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا، لیکن
عالمِ کون و مکاں کی، کوئی بنیاد بھی ہے

روزِ بیتابیٔ پیہم کا گلہ تھا، دل سے
اب مری ضد سے، وہ آمادۂ فریاد بھی ہے!

ناوکِ چشمِ ستم نے، کسے چھوڑا ہوگا؟
جس میں تم رہتے ہو! وہ شہر کچھ آباد بھی ہے؟

زیرِ لب پڑھ کے جسے، دل میں وہ شرماتے ہیں
شاید اُس خط میں، مرے عشق کی روداد بھی ہے

تم نے دامن سے گرایا ہے، جھٹک کر جن کو
اُنہیں ذرّوں میں، ہمارا دلِ ناشاد بھی ہے

قلبِ خنجر ہے یونہی، دامِ محبت میں اسیر
جس طرح سروِ چمن قید بھی، آزاد بھی ہے

اطہر ہاپوری

جی بہلنے کا سہارا کوئی زنداں میں نہیں
خار دامن میں نہیں تار گریباں میں نہیں

تابِ دیدار اگر موسیٰ عمران میں نہیں
یہ تو معنی نہیں اسکے کہ ہر انسان میں نہیں

جو نہ وحشت میں ہو پرزے نہ جنوں میں ٹکڑے
جیب میں جیب گریباں وہ گریباں میں نہیں

ولولے نکلیں تو کیا نکلیں دمِ بیتابی
لوٹنے کے لئے کانٹے بھی تو زنداں میں نہیں

ہم تھے جب تک تو بڑی دھوم بڑی رونق تھی
ہم نہیں ہیں تو کوئی آج بیاباں میں نہیں

گرد ہوں گرد حقیقت نہیں کچھ بھی میری
ہوں ابھی اور ابھی جنبشِ داماں میں نہیں

تم سلامت رہو دنیا میں ہزاروں وحشی
نہ سہی قیس اگر ایک بیاباں میں نہیں

تو وہ آزاد کہ ہرگز نہیں پابندِ قرار
میں وہ پابند کہ لغزش مرے پیماں میں نہیں

یا تو اس وسعتِ صحرا سے بھی دل تنگ تھے ہم
یا جگہ پاؤں بھی پھیلانیکو زنداں میں نہیں

تم کرو جور، عدو خوش ہوں، زمانہ دیکھے
جو مزا اس میں ہے وہ رنجشِ پنہاں میں نہیں

فصلِ گل آئی ہے کس طرح بنے گی اطہر
کہ یہاں تار کفن کو بھی گریباں میں نہیں

بیخود دہلوی

جس میں وہ جلوہ نما تھا دلِ شیدا ہے وہی ∴ ہم سے پردہ ہے مگر محملِ لیلا ہے وہی

عجز کی حد نہ رہی رنجش بھی ہے وہی
مجھ کو شایاں ہے یہی آپکو زیبا ہے وہی

جو نکل جائے تمنا نہیں کہتے اسکو
جو کھٹکتی رہے پہلو میں تمنا ہے وہی

لے چلے دل میں ترا داغ محبت والے
جان دیکر جو خریدا ہے وہ سودا ہے یہی

عشق کو حسن سے بڑھ کر ہے زمانے میں قیام
گل تو دو دن نہ رہا بلبل شیدا ہے وہی

ہائے مٹتی ہی نہیں خار تمنا کی خلش
دل کو بیکار کیا جس نے یہ کانٹا ہے وہی

کہہ کے ہر بات پلٹتے تھے وہی تو تم ہو
کیا قیامت ہے کہ اک وعدۂ فردا ہے وہی

طاقتِ دید جہانتک تھی اسے دیکھ لیا
دیکھ سکتا نہیں تو حسن کا دعوے ہے وہی

نام بیخود ہے تو میخوار بھی ہوگا وہ ضرور
پارسا ہم تو سمجھتے نہیں کہتا ہے وہی

عبدالحی صدیقی

جلوہ ہائے عالمِ حیرت سے دل لبریز ہے
اللہ۔ اللہ بیخودی بھی کیا طلسم انگیز ہے

انقلابِ دمبدم ہے دل کی ہستی کا خمیر
اس کے افسانے کا ہر صفحہ جنوں انگیز ہے

اشکباری میں نہ ہے اب خونفشانی میں وہ جوش
چشمِ محروم تماشا یاس سے لبریز ہے

عشق کا نیرنگ دکھلاتا ہے کیا کیا شعبدے
ہر جھلک رنگِ مجازی کی حقیقت ریز ہے

کر رہا ہے تجھ سے باتیں بیخودئی شوق میں
تیرے دیوانے کی تنہائی بھی لطف انگیز ہے

دیکھنا ہے گر تجھے نیرنگِ فطرت کی بہار
دیکھ اپنے دل کو یہ بھی ایک عالم خیز ہے

تیز رو ہوں کس قدر میں عرصۂ ہستی میں۔ اُف
ہر نفس گویا سمندِ عمر کو مہمیز ہے

شذرات

اُردو دنیا آنریبل جسٹس عبدالقادر کی اُن بیکران ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہ کریگی جو انہوں نے مخزن کے ذریعہ انجام دی ہیں۔ یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ موجودہ دور کے اکثر سحر طراز ادیب جو آسمانِ ادب کے تابناک ستارے کہے جاسکتے ہیں۔ ایک ادیب کی حیثیت سے مخزن ہی کی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ شیخ صاحب موصوف کی حوصلہ افزائی و رہنمائی نے بہت سی ایسی شخصیتوں کو ادبی دنیا میں اک کامیاب ادیب کے لباس میں پیش کیا کہ اگر وہ آپکی توجہ سے محروم رہتیں تو بہت ممکن تھا کہ ان کا جوہر استعداد کس مپرسی کی گرد میں دب کر معدوم ہوجاتا۔

ہم چاہتے ہیں کہ صاحب موصوف کے نقش قدم پر چل کر ہم بھی بقدر استطاعت اُن لوگوں کو صلائے عام دیں جو مستقبل کے بہترین انشاپرداز بن سکتے ہیں بشرطیکہ انہیں کوئی توجہ دلانے والا ہو جن میں جوہر قابلیت تو موجود ہے مگر خود انہیں اسکی خبر نہیں یا خبر ہے مگر اس میدان میں آنے کی ہمت نہیں یا ہمت بھی ہے مگر اک رہنما کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اسلامی درسگاہوں۔ کالجوں بلکہ اسکولوں میں بھی ایسے ہونہار طلبا موجود ہیں کہ اگر رہنمائی کے ساتھ انکی حوصلہ افزائی کیجائے تو وہ ادبی دنیا کے لئے سرمایۂ ناز ہوسکتے ہیں

لہذا ایسے طلبا جنہیں ادبی دلچسپی ہے جو مضامین نظم و نثر لکھتے ہیں جنہیں دوسری زبانوں سے ترجمہ کی مشق ہے۔ ہم سے خط و کتابت کریں اور اپنے مضامین نظم و نثر ہمیں بھیجیں تاکہ ہم انکے مضامین سے انکی استعداد طبعی کا اندازہ کرکے انہیں اک مفید ادیب بنانے کی سعی کریں۔ جو طلبا ہمایوں کے معیار کے مطابق مضامین لکھ سکتے ہیں۔ ہم ان کے مضامین کو اس وجہ سے رد نہیں کرینگے کہ وہ کسی معمولی کلاس میں پڑھتے ہیں۔ نہیں بلکہ ہم کوشش کرینگے کہ ہمایوں کے صفحات اُن کی ادبی شہرتوں کا گہوارہ بنائے جاسکیں۔

لاہور میں تعلیم پانے والے طلباء خط کے ذریعہ سے دو دن پہلے وقت مقرر کرکے ہم سے دفتر ہمایوں میں مل سکتے ہیں۔

تاجور

بزمِ تحقیق۔ "ہمایوں" کے گذشتہ نمبروں میں اس عنوان کے تحت اردو زبان کے متعلق چند سوالات اس غرض سے درج کئے گئے تھے کہ انکے متعلق حضراتِ اہلِ تحقیق اپنے غور و فکر کے نتائج سے دنیائے اُردو کو مستفید فرمائیں گے۔ چند حضرات کو خاص طور پر توجہ بھی دلائی گئی تھی۔ مگر سوائے حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی کے کسی ادیب کے پاس ان نہایت اہم اور ضروری اذوقت سوالات پر توجہ ضائع کرنے کے لئے وقت نہ نکلا

علاوہ ازیں اس عنوان کی اہمیت کا ہر ایک نے اعتراف کیا مگر اہلِ ادب کی بے نیازی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تین نمبر اس عنوان کے بغیر ہی شائع ہو چکے ہیں۔ اسے قائم کرنے سے یہ مقصد نہیں تھا کہ ہر مرتبہ اڈیٹر ہی اس صفحہ کی خانہ پوری کیا کریں۔ ہم تو اس یقین میں مبتلا تھے کہ اہلِ فن اپنے محققانہ خیالات سے اس عنوان کو اردو کی تاریخِ ارتقا کا اک اہم باب بنا دینگے۔ مگر ہمارے یقین کی حیرت تماشا رسوائی کس قدر عبرت آموز ہے!!

ہمایوں کے اجرا سے پہلے ادبی تحریکات کے لئے موجودہ وقت کی ناسازگاری کا خیال یاس آفریں صورتیں پیش کر رہا تھا۔ لیکن نتیجہ کی طرف سے آنکھیں بند کر کے "ہمایوں" جاری کر دیا گیا۔ ہمایوں کو گرانقدر بنانے کے لئے مجھے جہانتک علم ہے روپیہ صرف نہیں کیا گیا۔ بہایا گیا ہے۔ اگرچہ ایک ہزار کے لگ بھگ خریدار بہم پہنچ گئے ہیں مگر رسالہ ابھی تک نقصان برداشت کر رہا ہے۔ اخراجات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ خریداروں سے جس قدر روپیہ سال بھر کے لئے وصول ہوا تھا۔ تین ماہ میں صرف ہو چکا ہے گویا آئندہ سال نو ماہ تک کے اخراجات اپنی جیب سے دئے جائینگے۔ خیر اس کا غم ہو گا تو میاں بشیر احمد کو ہوگا مجھے نہیں ہے لیکن میرے دل میں اک اور خواہش چٹکیاں لے رہی ہے اور اسی لئے مجھے یہ چند سطور سپردِ قلم کرنی پڑیں۔

میں چاہتا ہوں کہ ہمایوں کم از کم اُردو کا "ماڈرن ریویو" بن جائے اس کی ضخامت بھی موجودہ ضخامت سے زیادہ ہو۔ تصاویر کا اضافہ کیا جائے۔ مضامین زیادہ گرانقدر۔ زیادہ عمیق اور زیادہ کار آمد ہوں غرضیکہ بہمہ وجوہ "ہمایوں" کو وہی حیثیت حاصل ہو جائے جو کسی زندہ زبان کے ادبی رسالوں کو حاصل ہوتی ہے مجھے اُمید ہے کہ میری آرزو کے ساتھ "ہمایوں" کے ہزاروں ناظرین کی آرزوئیں بھی ہیں۔ کاش "ہمایوں" کو اس عروج پر پہنچانے کے متعلق میری تجویز کی عملی تائید بھی اسی گرمجوشی سے کیجائے۔ یہ تجویز اگرچہ بظاہر مینیجرانہ تجویز ہے اور اسی اشتباہ کی وجہ سے میری خودداری مجھے پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ لیکن اس امر کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس تجویز کی سر سبزی کے مادی مفاد سے (جس کا ہونا محالِ عقلی نہیں تو محال عادی ضرور ہے) مجھے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ البتہ روحانی مسرت مجھے دوسروں سے زیادہ ہوگی۔ تجویز تو میں پہلے لکھ چکا ہوں مینیجرانہ ہے اس میں کوئی خاص جدت نہیں۔ لیکن کیا کیا جائے۔ کہ ہمایوں کی گرانقدری کا انحصار اسی تجویز کی کامیابی پر ہے۔ اس لئے جو حضرات "ہمایوں" کو اُردو کا رُوح نواز

رسالہ دیکھنا چاہتے ہیں وہ کم سے کم ایک ایک خریدار کی درخواست اس ماہ دفتر "ہمایوں" میں بھجوا دیں۔ آٹھ سو جدید خریداروں کی فراہمی پر "ہمایوں" کی گرانقدری میں موعودہ اضافہ نظر آنے لگیگا۔

دنیائے اُردو میں یہ وحشت انگیز خبر مسرت سے سُنی جائیگی کہ اُردو کے محسنِ اعظم مولانا آزاد دہلوی کی چند ایسی گرانبہا تصانیف جو ابتک منظرِ شہود پر نہیں آئی تھیں۔ اب مولانا مرحوم کے گرامی قدر نبیرہ آغا طاہر دہلوی کی مساعی سے بصیرت افروز ہونے کو ہیں۔

اُردو زبان کے دوسرے گرانمایہ مصنف شبلی۔ حالی۔ نذیر احمد وغیرہم کے بعد انکے جانشینوں نے ایک حد تک اِن حضرات کی عدم موجودگی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ لیکن بزمِ اُردو میں آزاد کی کُرسی ہمیشہ کے لئے خالی ہو گئی ہے۔ آزاد نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔ اس لئے اس کے گوہر چکاں قلم کی ایک ادنےٰ تراوش بھی کم مایۂ اُردو کے لئے مایۂ صد نازش ہو سکتی ہے۔

آغا طاہر اردو دُنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے مولانا مرحوم کی تمام تصانیف کو شائع کرنیکا تہیہ کیا ہے جو ابتک مسودات کی صورت میں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم اپنی جانب سے اصالتًہ اور ناظرین "ہمایوں" کی طرف سے نیابتًہ آغا صاحب موصوف کی اس گرانقدر توجہ کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ انھوں نے مولانا آزاد کی غیر مطبوعہ اعجاز نگاریوں کی اشاعت کے لئے "ہمایوں" کے صفحات کو اس حتمی وعدہ کے ساتھ خاص کر لیا ہے کہ اس فخر میں "ہمایوں" کا کوئی حریف نہیں بنایا جائیگا۔ چنانچہ اس سلسلۂ عواطف کی ابتدا آزاد کی ایک غیر مطبوعہ غزل اور آزاد کے سفرنامۂ ایران کی تمہید سے شروع ہوتی ہے۔

تاجور

تقریظات

بھارت کی دیویاں۔ دورِ حاضرہ کی قوم پرست و محبِ وطن خواتینِ ہند کے ولولہ انگیز و سبق آموز حالات کا مجموعہ مرتبہ مولوی محمد الدین صاحب فوق اڈیٹر اخبار کشمیری لاہور۔ اس میں تینتیس اُن ہندوستانی خواتین کے حالات جرأت و ایثار کا دلچسپ بیان ہے۔ جو آجکل حریت و آزادی کے حصول میں مردوں کا ساتھ دے رہی ہیں۔ یہ مجموعہ ہندوستان کے کسی خاص فرقہ یا مذہب کی عورتوں سے مخصوص نہیں بلکہ اس میں مسلمان سکھ۔ عیسائی ہندو ہر قوم و ہر مذہب کی حریت پسند خواتین کا ذکر ہے۔ قیمت آٹھ آنہ۔ دفتر اخبار کشمیری لاہور سے طلب کیجائے۔

خلافت کا پہلا خطبہ۔ جناب حاجی محمد موسیٰ خانصاحب رئیس دتاؤلی نے چوالیس صفحات کے اس رسالہ میں نہایت توضیح و انشراح سے یہ ثابت کیا ہے کہ خلافت من جانب اللہ ہے جگہ جگہ قرآن کریم کی آیات بطور استشہاد پیش کی ہیں ابتدا میں اُن مصائب کا دردناک ذکر ہے جو آجکل بعض جابر سلطنتوں کے ہاتوں مسلمانوں پر نازل ہو رہے ہیں۔ قیمت ۔ ۔ دو آنہ

ہندی قوم۔ اس غایت درجہ مفید رسالہ میں حاجی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ مذہبی اختلاف قومی اتحاد میں خلل انداز نہیں ہو سکتا ہندو و مسلمان دو مختلف مذہبوں کے پابند ہوتے ہوئے بھی ایک قوم بن سکتے ہیں اسی ذیل میں ہندی قوم کی ساخت۔ اسکی تنظیم پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندی قوم کے مُلکی کارناموں کو مفید اور واضح پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ وطن دوست اس کے مطالعہ سے مستفید ہو۔ حجم ۲۷ صفحات۔ لکھائی چھپائی قابلِ رشک ہے۔ قیمت ۸/ دونوں رسالے حاجی عبد الغفور صاحب سے دتاؤلی ضلع علیگڈھ سے مل سکتے ہیں۔

نغمۂ توحید۔ مولوی سید علی احمد صاحب نیّر نہٹوری کی ان ملکی و اسلامی نظموں کا مجموعہ جو مختلف قومی و ملکی اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ حجم ۳۲ صفحات قیمت چار آنہ۔ اس مجموعہ کی اکثر نظمیں موثر۔ جاذب توجہ اور حریت و آزادی کے جذبات سے معمور ہیں۔ جناب مصنف سے نہٹور ضلع بجنور کے پتہ سے درخواست کیجائے۔

تاجور

ہمایوں کے متعلق اہلِ قلم کی رائیں

جناب مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی اڈیٹر دلگداز

"ہمایوں" کسی ریویو کا محتاج نہیں، حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلارام را۔ آپنے بے نظیر پرچہ نکالا ہے۔ اور ایسی علمی ادبی کوشش شروع کی ہے کہ خدا اس میں ضرور برکت دیگا۔ واقعہ یہ ہے کہ "ہمایوں" اپ ٹوڈیٹ ہے اور ہم لوگوں کا لٹریچر تقویمِ پارینہ ہو چکا۔ نوجوانوں کی اردو اس قدر آگے بڑھ آئی ہے کہ ہم بہت پیچھے ہیں اور اگر زبردستی قدم بڑھا کے اس مجمع میں شریک ہونے کی کوشش کریں بھی تو اندیشہ ہے کہ کچل ڈالے جائیں

لسان الملک حضرت ریاضؔ گورکھپوری۔ مکرمی! "ہمایوں" نے دیدۂ و دل کو رہینِ منت کیا ہے۔ اسے دقتِ تو خوش کہ وقت ما خوش کردی زیرِ شذرات اصولِ تنقید و انتخاب کو دیکھ منتخب کلام دیکھا جو اثر ہوا کہنے کی بات نہیں۔ پنجاب نے اردو لٹریچر اور زبان میں جتنی جلد ترقی کی خداداد بات ہے۔ دہلی و لکھنؤ سے بھی سبقت لیجانا چاہتا ہے "دل ترے کوچے میں ہم سے دو قدم آگے چلا"

افسانہائے عشق کے عنوان سے سید سجاد حیدر صاحب کا لٹریچر قابلِ رشک ہے۔

گرامیؔ کی رباعیاں ان کے مرتبے کے قابل ہیں عنوانِ شذرات کے ذیل میں آپ جیسے اشعار کے طالب ہیں، ان کا ملنا دشوار ہے مگر کوشش ہونا چاہیئے۔

ریاضؔ

جناب نواب سراج الدین احمد خانصاحب سائلؔ دہلوی۔ اس پرچہ کی خوبیوں کی مبارک مجھے آپ کو تو دینی ہی تھی مگر آپ کے ساتھ حضرت تاجور بھی اس کے مستحق نظر آتے ہیں۔ الف سے لے کر یا تک پرچہ اپنی خوبی ترتیب میں درخورِ ستایش ہے۔ اللہم زد فزد۔ آپ کے علمی ذوق کا اور حضرت تاجور کی خوش سلیقگی کا اس سے پتہ چلتا ہے۔

ابو المعظم سراج الدین احمد خاں سائلؔ

فہرست مضامین بابت ماہ جون ۱۹۲۲ء

جلد ۱ | نمبر ۶

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذبات عالیہ

بزمِ ہمایوں

آج ہمایوں کی پہلی جلد ختم ہوتی ہے چھ ماہ تھوڑی سی مدت ہے مگر جیسے ماں اول اول اپنے بچے کی عمر کے مہینے گنا کرتی ہے اسی طرح ہمایوں جو دنیائے اردو میں اک ناچیز سی ہستی ہے اپنی عمر کے چھ مہینے گذار کر ذرا سی تسلی کے ساتھ سمجھتا ہے کہ میں چھ مہینے کا ہو چکا۔ ہمارے بحرِ ادب میں اک ننھی سی کشتی کا جو فقط اک کاغذ کی ناؤ ہوتی ہے ساحل سے جدا ہو کر ٹھاٹھیں مارنے والے سمندر کی طرف چل دینا اک عام نظارہ ہے اور عموماً اُس کے دیکھنے والوں کی حالت نہیں دیکھی جاتی، کیونکہ یہ کاغذ کی نائیں جلد ہی ڈوب کر بہتوں کی اُمیدوں کو بھی اپنے ساتھ ڈبو دیتی ہیں۔ یہ اکثر بڑی شان شوکت کے ساتھ ساحل سے رخصت ہوتی ہیں اور ان کے کھینے والے بحرِ ادب کے شیدائیوں کو کبھی نیلے پانیوں کی کہانی اور کبھی ایسے ہی اور فرضی افسانے سُنا سُنا کر وجد میں لاتے ہیں اور اسی عالمِ بیخودی میں اُنہیں لا کر بندرگاہ کے چکروں سے دور اُچھلتی لہروں کے درمیان لے جاتے ہیں جہاں ادبی تباہی کی ڈریل مچھلی موجوں کی کشاکش میں ان بدنصیبوں کی منتظر ہوتی ہے۔

ہمایوں بھی اک ایسی کاغذ کی ناؤ ہے جو زیادہ سے زیادہ مشرق کی اک بادبانی کشتی بن سکتی ہے مغربی دنیا کے دخانی جہاز ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتی کہ بادو آب کے طوفانوں کو حقارت سے دیکھے اور سمجھے کہ ان کا اثر مجھ سے قوی ہیکل پر نہیں۔ روزِ اول سے ہمایوں نے ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان نہیں کیا کہ وہ فوقیت کا دعوےدار ہے اور اک ایسا معیار قایم کرے گا جو دوسروں کے لئے موجبِ عبرت ہوگا۔ نہ اِس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ہماری ادبی کوششیں اِس حد تک پہنچ چکی ہیں کہ مدیرِ ہمایوں سا کم استعداد شخص بھی اُس میں قطعی طور پر کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ دنیا میں بالعموم وہی انسان عملی طور پر کچھ کر سکتا ہے جو نہ اپنے تئیں فرعونِ بے سامان سمجھ لے اور نہ ہمیشہ کے لئے اک حقیر و ذلیل ہستی۔ خدا جس ذی فہم کو اس اصولِ زرّیں پر عمل کرنے کی توفیق دیتا ہے وہ اپنی بساط کے موافق دائرۂ معاشرت کے لئے اک مفید ہستی ثابت ہو سکتا ہے۔

بشیر احمد

والگا کا قحط۔ وادی والگا نہایت بھیانک خشک سالی کے باعث زندہ دوزخ کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ اور دو کروڑ بدنصیب آدمی روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ ان میں سے نصف آبادی کی شکم پری کے انتظامات امریکہ، برطانیہ اور سوویٹ گورنمنٹ کے امدادی فنڈوں سے کئے جا رہے ہیں۔ اور بقیہ نصف کے متعلق نہیں کہا جا سکتا۔ کہ جب تک امداد پہنچے گی۔ تب تک وہ زندہ بچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ اگر کافی امداد وقت پر نہ پہنچ سکی۔ تو یقیناً تمام علاقہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ ایک انگریز نے جو وہاں کے چشمدید حالات دیکھ کر آیا ہے۔ لکھا ہے۔ کہ جب قحط اول اول نمودار ہوا۔ تو لوگوں نے ایک قسم کا زہریلا گھاس کھانا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اُن کے جسم کا خون خشک ہو گیا۔ آنکھیں اندر کو گھس گئیں۔ اور پیٹ بڑھ گئے۔ اُن کو دیکھ کر خوف معلوم ہوتا ہے۔ اور آدمی سمجھ نہیں سکتا۔ کہ یہ آدمی کے بچے ہیں۔ یا کسی مہیب قسم کے پرندے۔ جن کے بال و پر کسی حادثہ سے جھڑ چکے ہیں۔ والدین اپنے بلکتے ہوئے بچوں کو مقتدر لوگوں کے دروازوں پر پھینک کر بھاگ جاتے ہیں۔ اور پھر یہ دیکھنے کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ کہ بعد میں اُن کا کیا حشر ہوا؟ ایک آدمی اپنے تین بچوں کو ہمراہ لے کر ایک امدادی کمپ میں آیا۔ اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا "صاحب! میں تو اب بالکل مجبور ہو چکا ہوں"

"لیکن یہ کمپ تو صرف یتیموں کے لئے ہے"

بدنصیب باپ نے لڑکوں کو شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیا "آپ انہیں داخل کریں۔ یہ یتیم ہو جائیں گے"

اور یہ کہہ کر خودکشی کرنے کے ارادے سے بھاگ گیا۔

علمی شعاعیں

ایک نیا ہوائی جہاز۔ شکاگو میں مسٹر ای پی جانسن عرصۂ طویل سے اس قسم کا ہوائی جہاز بنانے کی کوشش میں تھے جو بغیر بازؤں کے اُڑ سکے اور جس کی پرواز کے لئے میدان کی ضرورت نہ ہو۔ اخبار پاپولر سائنس منتھلی راوی ہے۔ کہ صاحب موصوف اپنے تجربات میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ آپ نے ایک اخبار کے نمائیندہ سے دورانِ گفتگو میں کہا۔ کہ میرا جہاز زمین کے ساتھ ساتھ چکّر کھا کر بتدریج بلند نہ ہوگا۔ بلکہ پرندے کے مانند کُھلی چھتوں سے سیدھا اوپر کو پرواز کر سکے گا۔ اِس کے علاوہ اُس کے بازو بھی نہیں ہونگے بلکہ اُن کے عوض میں ایک مشین ہوگی جو جہاز کے اندر کی طرف رہے گی +

مسٹر جانسن نے اخبار کے نمائندہ کو یقین دلایا کہ یہ جہاز بہت جلد تیار ہوجائیگا +

تیرہ کا منحوس عدد۔ یورپ کی مہذب اور تعلیم یافتہ اقوام میں بھی یہ وہم موجود ہے۔ کہ تیرہ کا عدد منحوس ہے۔ اور کہ اگر کسی دعوت میں تیرہ آدمی شریک ہوں تو اُن میں سے ایک مرجاتا ہے۔ اِس وہم کی ابتدا یوں ہُوئی۔ کہ پہلے تیرہ مہینے تھے۔ بعد میں اُن میں سے ایک اُڑا دیا گیا۔ اور سال کو بارہ مہینوں میں تقسیم کردیا گیا۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ لوگوں میں یہ خیال زور پکڑتا گیا۔ کہ تیرھویں چیز کا وہی حشر ہوگا جو تیرھویں مہینے کا ہُوا +

لیکن اس کے باوجود بعض آدمی اس عدد کو مبارک تصوّر کرتے رہے ہیں۔ لوئس سیزدہم نے ۱۳ کا عدد اس خیال سے منتخب کیا تھا اور وہ ہر ایک مہم کے لئے تیرھویں ہی تاریخ کو انتخاب کیا کرتے تھے +

دُھوپ چُولھا۔ یہ بات چنداں تعجب خیز نہیں۔ کہ دھوپ گھڑی کے مانند دھوپ چُولھا بھی تیار ہوسکتا ہے۔

دوپہر کے وقت کسی پتھّر پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ اس میں کتنی حرارت ہے اگر اس حرارت کو قبضہ میں لایا جاسکے تو یقیناً اس سے بہت کام لیا جاسکتا ہے +

ڈاکٹر سی جی ایبٹ اس باب میں کئی سالوں سے تجربات کو رہے ہیں۔ اُنہوں نے محدّبی شیشوں کے ذریعہ سے اس حرارت کو ایک تیل کے حوض میں بند کیا ہے اور اُس سے دن رات کام لیتے ہیں۔ کچھ سال ہُوئے۔ اسی قسم کا ایک چُولھا ایک ہندوستانی نے بھی تیار کیا تھا۔ لیکن اُس میں ایک نقص تھا وہ رات کے وقت بیکار ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر ایبٹ نے اس کمی کو دور کر دیا ہے۔

ایام گذشتہ کا ایک سانپ۔ لنڈن کے عجائب خانہ میں ایک سانپ کا پنجر رکھا ہُوا ہے۔ جس کی لمبائی ۴۸ فٹ ہے۔ آج کل بڑے سے بڑا اگرمچھ جو ملتا ہے۔ اُس کی لمبائی ۲۸ فٹ سے بھی کم ہے۔
کیا اِس کا یہ مطلب تو نہیں۔ کہ جانداروں کے قد دن بدن کم ہو رہے ہیں۔

ذیابیطس کا علاج۔ اس وقت تک طبی دنیا ذیابیطس کے علاج سے عاجز رہی ہے اب مانچسٹر سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے دو ڈاکٹروں نے اس کا مجرب علاج دریافت کر لیا ہے۔ اِس باب میں اُن کی بنیادی دریافت یہ تھی۔ کہ اس بیماری کے مریضوں میں ایک مہلک قسم کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اگر اُن جراثیم کو ہلاک کر دیا جائے۔ تو مریض کا تندرست ہونا بالکل آسان ہے۔

ہمالہ کی سب سے بلند چوٹی پر۔ دُنیا میں سب سے بلند پہاڑ ہمالہ ہے اور اُس کی سب سے بلند چوٹی گوری شنکر۔ چند انگریز گذشتہ سال اُس کی "جاترا" کے لئے گئے تھے۔ مگر تیئیس ہزار فٹ کی بلندی سے واپس آ گئے۔ اُن کا بیان ہے کہ اُس بلندی پر پہنچ کر دم لینا دشوار ہو گیا۔ وہاں دھوپ اس قدر کڑی تھی۔ کہ سر گھوم جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جلتی ہُوئی ریت کی آندھیاں اِس شدت سے آتی تھیں۔ کہ اُن کے پاؤں اُکھڑ اُکھڑ جاتے تھے۔ اور ہر لمحہ یہی اندیشہ رہتا تھا۔ کہ ہوا اور ریت مل کر اب اُن کو پہاڑ سے نیچے پھینک دیں گی۔

نسوانی دُنیا

جاپان میں عورتوں کی تعلیم کے لئے صرف ایک یونیورسٹی ہے۔ لیکن جاپانی مستورات اس سے مطمئن نہیں۔ وہ کوشش کر رہی ہیں۔ کہ اُن کے لئے تعلیم کے دروازے زیادہ فراخ حوصلگی سے وا کر دیئے جائیں ٭

آسٹریا کے قدیم قانون کے مطابق مستورات کو لا کالج میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جمہور نے اس قانون کو تبدیل کر دیا اور عورتوں کو لا کالج میں پڑھنے کا حق دیدیا۔

فرانس میں ایک ناٹک کمپنی قائم ہوئی ہے۔ جس میں کام کرنے والی سب کی سب عورتیں ہیں۔ اور اُن کے تماشے محض عورتوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اشتہار میں صاف طور پر لکھا رہتا ہے۔ کہ اس کمپنی کے تمام ناٹک صرف عورتوں کے لئے ہیں۔ مردوں کو شامل ہونے کی اجازت نہیں۔ اس جدت نے اس کمپنی کو بہت کامیاب بنا دیا ہے۔ عورتیں تعیبانہ جوشِ انہماک سے اس کے تماشوں میں شامل ہوتی ہیں۔ اور مقررہ قیمت سے زیادہ دام دے کر ٹکٹ خریدتی ہیں۔

بنگال میں اس وقت کئی عورتیں ہیں۔ جو اعلےٰ درجہ کی کتب تصنیف کر رہی ہیں۔ شریمتی سورن کماری دیوی جو ایشیا کے ملک الشعراء ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی ہمشیرہ ہیں۔ تین چار ناول لکھ چکی ہیں جنکے تراجم غیر زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔ اسکے علاوہ شریمتی شانتا دیوی، شریمتی سیتنا دیوی، شریمتی چارو بالا دیوی سرسوتی اور چند دیگر خواتین کے ناول بنگالی زبان میں بڑی قدردانی سے پڑھے جاتے ہیں

لیجسلیٹو اسمبلی میں ڈاکٹر گوڑ نے تحریک پیش کی۔ کہ اس وقت تک مستورات کو وکالت کرنے کی اجازت نہیں۔ اس قانون کو منسوخ کر دیا جائے۔ سر ولیم ونسنٹ نے آنریبل ممبر کو یقین دلایا کہ اس سوال پر اُس وقت بحث کیجائیگی۔ جب اسکے متعلق گورنمنٹ کے پاس صوبجاتی کونسلوں، ہائیکورٹوں اور مستورات کی انجمنوں کی آراء پہنچ چکیں گی۔ اس باب میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بہار کونسل نے اس قانون کو اُڑا دیا ہے۔ اور اب وہاں عورتیں وکالت کر سکتی ہیں ٭

باڑہ گلی

ضلع ہزارہ پنجاب کے شمال مغرب میں ایک خوش منظر علاقہ ہے جس کے مضافات میں کوہ مری نتھیاگلی باڑہ گلی وغیرہ پُرفضا مقامات واقع ہیں۔ والدِ مکرم کو بارہا کشمیر اور ان مقامات میں موسمِ گرما کی تعطیلات بسر کرنیکا موقع ملا۔ اس زمانے کی اکثر نظمیں انہیں سفروں کی یادگار ہیں۔ (ب)

پھر آ کر دیکھ لی اُس کی جھلک اِن سبزہ زاروں میں
جو شان اے وادیٔ کشمیر! تھی تیرے چناروں میں

عجب ہے کیفیت باڑہ گلی! کہسار میں تیرے
تری اِن وادیوں میں جنگلوں میں مرغزاروں میں

عروسِ گُل ہے بیٹھی کس ادا سے فرشِ مخمل پر
پرندے گا رہے ہیں گیت مِل کر شاخساروں میں

فلک پر مہرِ تاباں سے رواں ہیں نُور کے چشمے
تہِ وادی میں موسیقی کی لَے ہے آبشاروں میں

ہوا میں تازگی ہے بھینی بھینی ہے مہک پھیلی
رگِ گُل کی نزاکت ہے عیاں گُلبن کے خاروں میں

بھرا ہے ہر کلی میں عطرِ حُسن اے وادیٔ دلکش!
یہ رنگ و بُو کبھی دیکھا نہیں گُلچیں کے ہاروں میں

سرِ کہسارِ سبزہ پوش پر اِک ہُو کا عالم ہے
نظر آتی ہے کب یہ شان گُلشن کی بہاروں میں

شمارِ دانۂ تسبیح میں زاہد! دھرا کیا ہے؟
خدا کے جلوے دیکھ آ کر ذرا اِن کوہساروں میں!

کہیں وہ بھی نسیمِ فصلِ گُل بن کر نہ رہ جائے
خزاں ڈر کر کبھی آتی نہیں اِن سبزہ زاروں میں

بہت خوش ہے ہمایوں دیکھ کر تیرے یہ نظّارے
ہزارا! خوش بزی! ہاں تُو بھی ہے یکتا ہزاروں میں

میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

روزنامچۂ آزاد

گذشتہ سے پیوستہ

۲۳ ستمبر ۱۸۸۵ء ۱۲ ذوالحجہ ۱۳۰۲ھ یوم سہ شنبہ ۶ بجے شام کو ریل میں بیٹھ کر کراچی کو روانہ ہوا اور ۲۵ ستمبر یوم جمعہ کو کراچی میں داخل ہوکر اپنے سعید و عزیز شاگرد مولوی عمردین ہیڈ ماسٹر مدرسہ کے مکان پر اترا یہاں معلوم ہوا۔ کہ کل ہی جہاز روانہ ہوا ہے۔ اور اب پھر جمعہ کا انتظار کرنا چاہیئے اگرچہ دل بہت گھبرایا۔ مگر کیا ہوسکتا تھا۔ رہا اور ان کی محبتوں نے اس طرح رکھا۔ کہ نہ معلوم ہوا۔ گھر میں ہوں۔ یا سفر میں۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء

کراچی میں مرزا احسن علی خاں صاحب وکیلِ عدالت سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مدرسہ قائم کرنے میں کوشش کی ہے۔ بالیاقت شخص ہیں، جس طرح امیر ہیں۔ ویسا ہی امیرانہ دماغ بھی رکھتے ہیں۔ اگرچہ سنت جماعت ہیں۔ مگر اس طرح بسر کرتے ہیں۔ کہ اہلِ سنت شیعہ جانتے ہیں۔

عام قلم۔ مرزا محمد جعفر مالک مطبع مفرح القلوب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ بالیاقت۔ بامروت بااخلاق لوگ ہیں، جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کے والد مرزا مخلص علی مرحوم اور میرے والدِ مغفور سے خط وکتابت تھی تو زیادہ متوجہ ہوئے۔ بلکہ مجھے ایک خط مدیرِ فرنگ کے نام دیا۔ اور میرے ارادے کا حال مفصل دریافت کیا کہ درجِ اخبار کرینگے۔

عام قلم ۔ کے برابر مسلمانوں میں کوئی صاحبِ دولت سوداگر نہیں وہ ہمہ صفت موصوف ہیں وہ بھی اخلاق سے ملے۔ ان کا مذہب شیعہ ہے۔

راہ چلنے کا لطیفہ۔ سکھر سے سوار ہوا۔ راستہ میں ایک جگہ سے سڑک کٹتی ہے۔ وہاں سرحد کے کئی سو پہاڑیوں کا انبوہ تھا۔ سب کو گاڑیوں میں بھر دیا۔ ان کی زبان میں اکثر الفاظ فارسی کے معلوم ہوئے۔ پوچھا تو کہا کہ ہم مکرانی ہیں سبی کی ریل پر کام کرتے ہیں مجھے تعجب ہوا کہ کیچ مکران کا ملک کتابوں میں دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ کہ یہ ایک خشکی کا رستہ ہے جدھر سے کسی وقتوں میں کئی کئی دفعہ اسلام کا لشکر ہند میں آیا تھا۔ آج میں اس کے ہمسایہ میں بیٹھا مکرانیوں سے باتیں

کر رہا ہوں ایک شخص کے قیافہ پر ذرا انسانیت اور بات میں سلاست معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پوچھا رعایائے کدام بادشاہ ہستید۔ اُس نے کہا "قجر ناصرالدین شاہ"۔ میں نے کہا۔ "شما نوکری فرنگ می کنید او ناخوش نمی شود۔ اس نے کہا۔ "اُو پروا نمی کند"۔

۲۔ اکتوبر ۱۸۸۵ء۔ ۲۲ ذوالحجہ ۱۳۰۲ھ یوم جمعہ کراچی سے عربیہ (عرب) جہاز ڈاک میں ۱۶ روپیہ کرایہ دے کر سوار ہوا۔ تمام دن جہاز میں گزرا کہ اسباب بہت اُترا اور چڑھایا گیا۔ ۴½ بجے قریب شام جہاز نے لنگر اُٹھایا۔ سب سے پہلے شکرِ خدا ہے اس نعمت پر کہ مجھے اضطراب۔ دورانِ طبع اور استفراغ سے لوگوں نے ڈرایا ہوا تھا۔ مگر مجھے اصلاً معلوم نہیں ہوا۔ لیمو۔ انار۔ تربوز وغیرہ اسباب میں موجود تھے۔ اس جہاز پر ۱ کپتان ۳ افسر معلم۔ ۴ انجینئر۔ ۱ ڈاکٹر ایک انگریزی نویس ذمہ دار ہیں۔ جہاز ہمارا اوسط دن رات میں ۱۵۰ میل چلتا ہے ؛

آغا عبدالکریم۔ ایک ایرانی سے مُلاقات ہوئی مگر یہ ۳۰ برس سے ایران چھوڑ کر بطورِ سوداگری مدراس۔ رنگون وغیرہ میں رہتے ہیں۔ فی الحال سوئیز سے کراچی آ کر کربلا کو جاتے ہیں۔ فارسی شاعری کا بہت شوق ہے۔ مدح اور مرثیہ کہتے ہیں۔ عربی بھی بولے مگر سواحل کی۔ انگریزی بھی بولتے ہیں۔ مگر جہازی۔ میرا ان کا بستر یکجا ہُوا۔ کہ دونو ایک دوسرے کو غنیمت سمجھتے تھے ؛

اس جہاز پر مولوی عبدالعلی صاحب سورت کے رہنے والے بھی تھے۔ ان کے عیال بھی ساتھ تھے ۳ عفیفہ۔ ایک ۳ برس کا بیٹا۔ ایک یک سالہ۔ ایک کتخدا نوجوان یہ تینوں صاحب بوئرے تھے۔ مولوی صاحب وعظ و نصیحت سے خاص و عام کو ہدایت فرماتے تھے۔ اور خوش اعتقاد مومن تھے۔ مجھ سے وہ اور اُن کے وابستہ کمالِ محبت سے پیش آتے تھے۔ رات آرام سے گزری۔ اس مقام پر اہلِ جہاز اور اُس کے ادنےٰ ادنےٰ نوکروں کی تعریف کئے بغیر چلنا۔ انصاف پر ظلم کرنا ہے۔ کیونکہ میں نے خوب دیکھا۔ کہ ان لوگوں کی کثافتیں عورتوں کی طرف سے اصلاً منحرف نہیں ہوتیں۔ ۳۔ اکتوبر ۲۳ ذوالحجہ۔ ہفتہ۔ دن آرام سے گزرا۔ مگر صبح کو ۷½ بجے تک تمام جہاز دھویا جاتا ہے پھر روغن وغیرہ پکانے کے سبب سے دھواں رہا۔ اس سلئے ایک دو بجے تک تکلیف رہی رات آرام سے گزری الحمد للہ۔

رات کو تمام شب وسطِ جہاز میں ایک معلم ٹہلتا رہا۔ ایک دوسی عرشہ پر کھڑا تھا۔ اور

بموجب قاعدے کے گردش دیتا تھا۔ اس کے حساب اور اندازے پر جہاز کی رفتار ہوتی ہے۔ آدھ گھنٹہ میں گھڑیال بجتا تھا اور خاصی آواز دیتا تھا۔ کہ خبردار رہنا۔ آگے عرشہ میں ایک اور خلاصی تھا۔ وہ کہتا تھا۔ کہ میں خوب دیکھتا ہوں۔

ایک صاحب کراچی سے سوار ہوئے۔ بوشہر کو جاتے ہیں۔ دوسرے درجہ میں بیٹھے ہیں۔ ہم کالے آدمی کل پندرہ ہیں تیسرے درجہ میں گزارہ کرتے ہیں۔ مجھے خود بیچارے نے دوسرا درجہ دکھلایا۔ مگر حب الوطنی نے کہا۔ کہ اتنے روپیہ جمع کر کے کتابیں لو۔ تو ایک خانہ المباری کا آباد ہوتا ہے۔ اس لئے تکلیف مجھے آرام معلوم ہوئی۔

جہاز پر گھنٹہ کا حساب خدا پرسے ۱۲ بجے پر آدھ گھنٹے کے بعد ایک آواز۔ پورے گھنٹے پر دو آوازیں۔ ۱ گھنٹے کے لئے تین آوازیں۔ چار گھنٹے کے لئے ۸ آوازیں۔ پھر آدھ گھنٹے کے لئے ایک آواز پورے گھنٹے کے لئے دو آوازیں . . . ہمارے ۸ بجے کے لئے ۸ آوازیں پھر اُسی طرح غرضیکہ چار چار گھنٹے کا ایک مجموعہ رکھا ہے۔

۱۴ اکتوبر ۱۸۸۵ء ۴ ذلحجہ ۱۳۰۲ھ یوم اتوار۔ نماز کے وقت عرشہ جہاز پر جاکر ہوا کھانے لگا۔ ذرا روز روشن ہوا۔ تو ایک میمن دوکاندار بندر عباس کا جانے والا بھی آیا۔ اور مجھے بتایا۔ کہ دیکھو گادر جو ایک معمولی لنگر ہے ہمارے دائیں ہاتھ کو پیچھے رہ گیا اور یہ سامنے دائیں ہاتھ پر اسی کے سلسلے کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں، ان میں بلوچ لوگ رہتے ہیں۔ پہلے غارت پیشہ تھے۔ اب دولتِ انگلشیہ نے انہیں درست کیا ہے۔

میمن کا نام حبیب دوراجی ہے علاقہ سینا دریلاول کا رہنے والا ہے۔ بندر عباس جاتا ہے۔ کہ بادام۔ انگور وغیرہ میوہ جات خرید کر لائیگا۔ یہ حنفی مذہب ہے مگر ملنسار آدمی ہے شیعوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔

ایک جہاز ٹھیک سامنے سے نظر آیا۔ کہ غالباً مسقط سے آتا تھا۔ مجھے نہ معلوم ہوتا۔ دور تھا۔ اسی رفیق نے بتایا۔ وہ ساعت بہ ساعت نزدیک آتا تھا۔ آخر ہمارے داہنے ہاتھ کو ہوکر گادر کو چلا گیا۔

(باقی)

*

روس کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر

قرون وسطیٰ کی ابتدا سے مشرقی یورپ میں اوڈر (Oder) سے یورال (Ural) تک سلافی (Slavs) قبائل کے مسکن تھے، یہ قبائل قدیم رومیوں کی نسل سے ہیں، ان کی زبان یونانی و لاطینی کی طرح ایرین (aryan) زبان سے مشتق ہے، یہ قبائل اپنی تعداد کے لحاظ سے بھی ان تمام قبائل سے زیادہ ہیں، جو سلافی نسل سے ہیں، اور مغربی یورپ میں آباد ہیں، یہ تمام قومیں اصلاً سلافی ہیں، لیکن مغربی یورپ میں مختلف اقوام میں منقسم ہو کر آباد ہو گئی ہیں، مثلاً پول (Poles) ثنگ - سرنی (Serbians) بلغاری (Balgars) کروٹس (Croats) وغیرہ مشرق میں بھی سلافی متعدد قبائل پر منقسم تھے، اور نویں صدی تک بالکل غیر متمدن تھے، ان کا پیشہ زراعت تھا۔ کاٹھ کے مکانوں میں رہتے تھے، انہوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی حکومتیں بھی قائم کر رکھی تھیں اور ان کے استحکام اور شان سلطنت قائم کرنے کے لئے قلعے بھی بناتے تھے، جن کی تعمیر مٹی کے تودوں سے ہوتی تھی، زمانۂ جنگ کے لئے خندقیں بھی کھود رکھتے تھے تاکہ اگر دشمن قوی ہو تو بلا فکر و تردد اس کے حملوں سے نجات پا سکیں، علم و فن ان لوگوں میں نام کو نہ تھا، معاشرت نہایت پست و مبتذل تھی، لباس بھی بالکل وحشیانہ پہنتے تھے،

ان کی یہی بربریانہ زندگی تھی، اور اسی کی خار دار چادر میں یہ سب مست تھے کہ شمالِ یورپ سے ایک بادل اٹھا، اور ساون کی گھٹاؤں کی طرح ان کی آبادیوں پر چھا گیا۔ یہ بادل ژالہ باری کے بادل نہ تھے، بارش نیساں کے بادل تھے، ان کے دامن سے جو قطرہ ٹپکا، ایک ایک باغ لگا گیا۔ مگر یہ کون تھا؟ جس نے روسی تسبیح کے منتشر دانوں کو ایک سلک میں منسلک کر دیا، ابر رحمت کے اس پردۂ زنگاری میں کون آیا تھا؟ جس نے وحشی قبیلوں کو اسٹیم رولر (Steam Roller) بننے کی راہ دکھلا دی،

یہ سویڈن (Sweden) کی ترقی یافتہ قوم تھی جس کی ایک جماعت اس طرف آئی، اور اس نے تمام سلافی قبائل کو روسی قوم کے نام سے ایک رشتہ میں منسلک کر دیا، اور

وحشی صفت انسانوں، اور درندہ خو جماعتوں کو تہذیب و تمدن سے روشناس ہونے کی دعوت دی، انہوں نے امراء کو آمادہ کیا کہ وہ فوجیں مرتب کریں، غرباء کو تعلیم دی کہ وہ صنعت بھی سیکھیں، اس وقت تک ان قبائل کا کوئی ایک مذہب بھی نہ تھا، مختلف عقائد و اعمال بے ترتیبی سے رائج تھے، ان کے اثر سے انہوں نے نصرانیت قبول کی، اور رفتہ رفتہ تمام قبیلے اسی مذہب کے پیرو ہو گئے، اور گیارھویں صدی میں بائزنطینی (Byzantine) مشنریز کی دعوت پر آرتھوڈکس (Orthodox) بپتسمہ لے لیا،

روس دو حصوں پر منقسم ہے، ایک مغربی دوسرا مشرقی، مغربی روس کو روسیائے مغربی اور مشرقی کو روسیائے کبری کہتے ہیں، روسیائے مغربی میں دو شہر نہایت مشہور اور روسی حکومتوں کا مرکز تھے، ایک تجارتی شہر تھا، اور وہ جھیل المن (Elmen) پر آباد تھا، دوسرا سر تا سر مذہبی، اور یہ دریائے نیپر (Dneiper) کے ساحل پر تھا، اسی شہر میں صوفیا نامی وہ مقدس گرجا تھا جس کی دیواریں مطلا و مذہبی تصویروں سے آراستہ تھیں، اور جس کے طول و عرض کا دوش مقدس صوفیا کے علاوہ چار سو گرجوں کا حامل تھا،

لیکن باوجود وسعت کے روس کوئی مستحکم سلطنت نہ تھی، اس عظیم الشان پھیلاؤ میں ہر طرف طوائف الملوکی تھی، جو امیر سب سے زیادہ قوی، متمول اور ذی اقتدار ہوتا تھا، وہی اس رقبۂ زمین کا حاکم بن بیٹھتا تھا، جب وہ مرتا تو ریاست اس کی اولاد میں تقسیم ہو کر، حکومت کسی دوسرے خاندان میں منتقل ہو جاتی تھی، چنانچہ تیرھویں صدی میں روسی حکومت (۲۷) حکومتوں پر منقسم تھی،

اسی زمانہ میں ایشیا کے سنگلاخ میدانوں سے ایک طوفان اٹھا، اور ساری جماعتوں اور طوائف الملوکیوں کو تہ و بالا کر کے خود قابض ہو گیا، یہ طوفان مشہور تاتاری قوم کا طوفان تھا، جسکے تین لاکھ نفوس نے روسیائے صغریٰ میں خوفناک خونریزی کر کے، چشم زدن میں سارے ملک کو زیر نگیں کر لیا، اور کامل دو سو برس تک مطلق العنان حکومت کی، اس زمانہ میں روسی امراء کی صرف یہ عزت رہ گئی تھی کہ وہ خان اعظم کی خدمت کریں، اس کے گھوڑوں کے سامنے مؤدب کھڑے ہوں، ندمائے سلطنت کو تعظیم دیں، اور ہر ہفتہ ان کے پاس حاضری دیا کریں، ان عظیم الشان خدمات کے صلہ میں ایوان شاہی سے انہیں خطابات عطا ہوتے تھے، معزز عہدے دئے جاتے تھے، اور

ان کی سپاس گذاری میں ان کا فرض تھا کہ عمدہ عمدہ ساز و سامان سے اپنے محلوں کو سجا کر اعیانِ اساطینِ حکومت کو دعوت دیں، اور زر و جواہر کی نذریں پیش کریں، روسیوں نے یہ تمام ذلتیں برداشت کیں، اور دامنِ حکومت سے وابستہ رہے،

گو تاتاریوں کا یہ طرزِ عمل نہایت شرمناک تھا، لیکن حقیقتہً یہ ایک تازیانۂ عبرت تھا، اس میں روسیوں کی ساکن و جامد زندگی کے لئے پیغامِ انقلاب تھا، اس نے اُن کو مرکزیت کی دعوت دی، اس سے ان کو اتحاد و اتفاق کا سبق ملا، اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس پردے میں تیار ہوئے، فاتح قوم کی ٹھوکریں کھا کر جاگے، محکومی کی زندگی میں استقلال کی بنیادیں استوار کیں، لطماتِ حوادث کھا کر لیلائے تمدن کی طرف بڑھے، اور ذلت و غلامی کے تلخ جام پی پی کر حکومت کے طریقے سیکھ گئے، آبادیوں میں نظم و جماعت کی لہر دوڑ گئی، ہر شخص حبِ وطن کے جوش سے گرما گیا، مگر ہر حالت میں اپنے جذبات پر قابو رکھا اور وفاداری کا بھیس بدل کر حکومت کے اکثر کام اپنے ہاتھ میں لے لئے، ٹیکس کی وصولی پر ماسکو کے امراء نے قبضہ کیا، عدالتی و انتظامی اختیارات بلادِ بحیرات کے رُوسا نے حاصل کئے، اور فوجی خدمات روسِ جدید[1] کے زمینداروں کے حصہ میں آئیں، غرض ہر جماعت نے اپنی خدمات و مساعی اور اطاعت و وفاداری سے حکومت کے ہر چھوٹے بڑے کام پر اپنا تسلط جما لیا تھا، اور سب اس مقصدِ وحید پر متفق و متحد ہو گئے تھے کہ کسی طرح اپنی کھوئی ہوئی امارت و سیادت حاصل کر لیں، چنانچہ انہیں اس کوشش میں کامیابی ہوئی، تعاون و اطاعت کے اسٹیج پر جو تماشا کھیلا گیا تھا، وہ تاتاری سقوط اور روسی عروج پر ختم ہوا،

اس انقلاب کے بعد تختِ حکومت ایفان (Ivan) نامی ایک امیر کے سپرد کیا گیا، اور اُسے بلا شرکتِ غیرے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا گیا، ایفان کی حکومت کا مرکز ماسکو تھا، یہ واقعہ ۱۵۴۷ء کا ہے، جب روس اپنی مجموعی صورت میں نمایاں ہوا تو سب کی نظریں اس کی طرف اُٹھ گئیں، اور سب

---

[1] تاتاریوں کے تسلط کے بعد روسیوں میں مشرقی روس کے لق و دق جنگلوں کو آباد کرنے کی تحریک پیدا ہو گئی تھی، اس تحریک کی روحِ رواں مغربی روس کے باشندے تھے، جو مغرب سے اُٹھ کر مشرق کے ویران میدانوں کو بسا رہے تھے، یہ آبادی روسِ جدید کہلاتی ہے۔

اس کے مستقبل سے ڈرنے لگے، کیونکہ بلحاظِ وسعتِ ارضی یورپ میں اس سے بڑی کوئی حکومت نہ تھی،
اور بلحاظِ مطلق العنانی زار، یورپ کے پادشاہوں میں سب سے بڑا پادشاہ تھا، اس لئے کہ روسیوں
نے اپنے پادشاہ کو شانِ الوہیت دے دی تھی، اور اس کو اس قدر سر پر چڑھا لیا تھا کہ اس کی غلامی
کو اپنی سعادت، اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کو اپنا فرض جانتے تھے جب اس کے پاس جاتے تو فرطِ شوق
و عقیدت سے زمین بوس ہوتے، جبتک وہاں رہتے مودب کھڑے رہتے تھے۔ ہر شخص اپنے مال و
جائداد کو اسی کی ملک سمجھتا تھا، اس کی زبان کا ہر لفظ وحی آلہی تھا، اس کے قلم کی ہر جنبش فرمانِ ربانی
تھی، وہ جسے چاہتا سزا دیتا، جس کے مال و جائداد کو چاہتا ضبط کر لیتا، اور جس کو چاہتا قتل کر دیتا تھا، نہ
کسی جرم کی ضرورت تھی نہ خطا کی، جُرم و بے جُرمی کا مفہوم کالعدم ہو گیا تھا، ہر سزا کے لئے صرف ارادۂ
سلطانی کافی تھا، جو کسی طرح نہیں ٹل سکتا تھا، اور جس کے آگے ملزم کو بغیر کسی عذر و انکار، اور بلا کسی قانونی
چارہ جوئی کے اپنا سر جھکا دینا پڑتا تھا، اور یہ سب اسی میں خوش تھے کہ غیروں کی ٹھوکریں کھانے سے
اپنے بھائیوں کی ٹھوکریں کھانی بہتر ہیں، اس کا ہر ظلم برداشت تھا، اس لئے کہ وہ ان کا آقا تھا، اس کی
ہر خواہش ان کی خواہش تھی، اس لئے کہ وہ ان کا باپ تھا، اس کی ہر بولی فرمانِ آلہی تھی، اس لئے کہ وہ
خدائی وکیل تھا، جو کوئی اس اطاعتِ اعمیٰ، وفاداری بے چون وچرا سے انحراف کرتا سزا پاتا، اور خود
اس کے عزیز و اقارب، دوست احباب نکوہش کرتے، کیونکہ ان کے عقیدہ میں ایسا کرنا ناصیۂ انسانیت
کے لئے بہت ہی بدنما داغ تھا، اس لئے تمام روس میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا، جو اس جابرانہ
مطلق العنانی کے خلاف اُٹھتا، اور قہاری وجفا کاری کا دروازہ بند کرکے منتظم و باقاعدہ حکومت کی
بنیاد ڈالتا، لیکن یہ حالت ہمیشہ قائم رہنے والی نہ تھی، جماعتوں کے نفسیات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے،
منٹوں میں انقلاب ہو جاتا ہے، اور جسے اب تک شہد سمجھ کر چاٹ رہے تھے، حنظل سمجھ کر
تھوکنے لگتے ہیں، زار کا ظلم و ستم دن بدن بڑھ رہا تھا، وہ طاقت کے غرور اور قوت کے گھمنڈ میں مبتلا
تھا، اور انسانوں کی گردنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیتا تھا، روسیوں نے بڑی حد تک اس کے ظلم سہے
اور اپنے اندر پوری طرح ضبطِ نفس اور وطن پرستی کی روح پیدا کر لی، ہر شخص آزادی کی قدر و قیمت۔ اور
مرکزیت کی برکات سے واقف ہو گیا، تو مظالم پر ناراضی کے جذبات پھیلنے لگے، اطاعت کیش سر
متمردانہ کھینچنے لگے، اور کورنش بجالانے والے ہاتھ اُٹھے۔ اور زار کی مطلق العنانی کو کم کر دیا سب سے

پہلے اس قہرمانی تسلط کے سقوط کا بوریک (Borik) خاندان نے اعلان کیا، بعد کو دوسرے خاندانوں نے بھی اس کی عملی تصدیق کی، زار اس اعلان و تصدیق سے بہت برہم ہُوا، اور اس نے اس جوش میں اور زیادہ ظلم وستم کئے، جس سے ایک دوسرا انقلاب پیدا ہُوا، ایس سیپٹیناک (S.Stepniak) نے لکھا ہے کہ ایفان کا تشدد دن بدن بڑھ رہا تھا، روسی قوم سُکھ اور چین کو ترس گئی تھی، ملک میں ہرطرف ناراضی کے جذبات تھے، اور ہر شخص اس امر پر آمادہ ہو چلا تھا کہ ایفان سے تختِ حکومت خالی کرائے، جب ان آمادگیوں نے عزمِ صمیم کی صورت اختیار کرلی تو چند امرا، نے مسلح خروج کیا، ایفان کو تخت سے اُتارا اور حکومت دو امیروں کو سونپ دی[1]، ان میں ایک امیر پول (Pole) خاندان سے تھا، دوسرا سویڈش (Swedish) سے، ایک کا پایۂ تخت وہی ماسکو رہا، اور دوسرے نے نوگراڈ (Novgrad) کو دارالسلطنت بنایا، اس سے دونوں جماعتوں میں فخرِ سبق کا جوش پیدا ہُوا، ہرگروہ ترقی کے میدان کو جیتنے کے لئے بڑھا، اور اپنے اپنے خیال میں کامیاب رہا،

لیکن اس پر مشکل سے ۲۵-۳۰ برس گذرے ہونگے کہ ۱۶۱۴ء میں رُوساء و نمائندگانِ حکومت اور نمائندگانِ قوم کی ایک مجلس منعقد ہوئی، مجلس کا مقصدِ انعقاد یہ تھا کہ دوعملی کو ختم کرکے، جدید زار کے مسئلہ نصب پر بحث کیجائے، مجلس نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ دونوں حکومتوں کو ایک شاہنشاہی میں ضم کردیا جائے، لیکن یہ طے کردینے کے بعد ایک اور مسئلہ بھی قابلِ غور تھا، اور وہ جدید زار کے انتخاب کا مسئلہ تھا، کئی دن تک اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی، ہر جماعت اپنے اپنے سربرآوردہ لوگوں کے نام پیش کرتی تھی، اور ردّوکد کے بعد واپس لیتی تھی، انہی ناموں میں ایک نام میخائل رومانوف (Romanov) کا نام تھا، سب کی نظرِ انتخاب اسی پر پڑی، اور مجلس اس کے سر پر تاج شاہی رکھ کر منتشر ہوگئی، اور حقوق و اختیارات کا مسئلہ ویسا ہی غیر منحل رہ گیا، جس کی وجہ سے زار کے تمام و کمال وہی حقوق قائم رہے، جو اسے پہلے سے حاصل تھے، یعنی وہ جس قسم کے چاہے احکام نافذ کرے، جو قانون چاہے بنائے، رعایا اور اس کے نمائندوں کو اس کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، وہ ہر بات میں خود مختار ہے، اور اس کی خودمختاری کا ایک فردِ بشر بھی مانع و مزاحم نہیں

[1] یہ عزل و نصب سولھویں صدی کے اخیر کا واقعہ ہے۔

ہوسکتا، اس فروگذاشت کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہی سزائیں اب بھی برقرار رہیں، بلکہ اثرِ تمدن سے یہ اور اضافہ ہوگیا کہ تاتاری چمڑے کا تازیانہ بنوایا گیا، جس کی مار سے جسم لہو لہان ہوجاتا تھا، اور شدتِ ضرب سے اکثر اوقات جانیں بھی ضائع ہوجاتی تھیں، مگر اسی کے ساتھ ایک خوبی بھی تھی، اور وہ یہ تھی کہ ان سزاؤں میں امیر وغریب میں کوئی امتیاز نہ تھا، سب مساوی وہمرتبہ تھے، جس طرح غریب سزاؤں کا شکار ہوتے تھے، اسی طرح امیروں کو بھی اپنی پشت جُھکانی پڑتی تھی،

روس، یورپ میں سب سے بڑی سلطنت تھی، لیکن یہ وُسعت جنگلوں اور ویرانوں کی تھی، اس میں بڑے بڑے شہر نہ تھے، آبادی بہت کم تھی، دارالسلطنت ماسکو کی حالت بالکل گاؤں کی سی تھی، جو امراء وندماءِ سلطنت کی آبادی کی وجہ سے دوسرے گاؤں کے مقابلہ میں بڑا اور کسی قدر شاندار تھا، ورنہ عام طور پر بہت ہی ویران اور فلاکت زدہ گاؤں تھے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ روس میں متوسط درجہ کے لوگ نہ تھے، یا امراء اور زمیندار تھے، یا مزارعین اور غربا، اور اس میں بھی یہ تقسیم ہوگئی تھی کہ امراء علیحدہ رہتے تھے اور غرباء علیحدہ، مزارعین اور غرباء کی زندگی تو جیسی ہوتی ہے، اور خصوصاً ایک وحشی ملک میں ویسی تھی، لیکن امراء بھی کچھ زیادہ بہتر اور کشادہ دل نہ تھے، بلکہ امیر وغریب سب ایک رنگ میں رنگے ہُوئے تھے، غریبوں کی طرح ان کی معاشرتیں بھی نہایت پست، ان کے اخلاق بھی نہایت بتذل، اور ان کے رسم ورواج بھی شانِ ریاست سے نہایت فروتر تھے، اس پر مستزاد یہ تھا کہ آبادیوں میں بھی تقسیم تھی، امیروں کی الگ، غریبوں کی الگ اور یہی لوگ ہر ملک کی آبادی کا غالب حصہ ہوتے ہیں، اس لئے مُلک کی عام حالت بہت خراب تھی،

روسیوں میں ایک یہ بھی دستور تھا کہ جائداد کی طرح مناصب وخدمات بھی میراث سمجھی جاتی تھیں، اور نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی تھیں، جو سب سے بڑا رئیس ہوتا تھا وہی سب سے بڑا عہدہ دار بھی سمجھا جاتا تھا، لیکن ہر حال میں زیادہ اعزاز خاندانِ شاہی کے لئے ہوتا تھا، اور مناصب حکومت بھی زیادہ تر انہی لوگوں سے مخصوص ہوتے تھے،

روس میں مصاحبی بھی ایک خاص اعزاز تھا، اور اس اعزاز کے مستحق وہ لوگ ہوتے تھے جن کے آباؤ اجداد کسی ممتاز وجلیل القدر عہدے پر فائز رہ چکے ہوتے، یا خاندانِ شاہی سے

تعلق رکھتے، گویا شاہی معیت و ہم نشینی ان کے اعزاز و اکرام کے لئے مُہرِ تصدیق تھی، جس کی طرفِ کلہ میں یہ طرّہ لگا ہوتا تھا، وہ قریب قریب خاندانِ شاہی کے ہمرتبہ سمجھا جاتا تھا، اور مدتوں اُس کا احترام کیا جاتا تھا، خود یہ لوگ بھی اپنے اور اپنے آبائی مناصب و درجاتِ اعزازی کی بیحد قدر و حفاظت کرتے تھے، جس کے باعث اکثر باہم تنازعات رہتے تھے، اور بسا اوقات خانہ جنگیوں تک نوبت پہنچ جاتی تھی، خصوصاً مجالس و محافل اور دعوتوں میں اس کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا تھا، اور جو شخص اس کا خیال نہ رکھتا، یا اپنے درجے سے آگے بڑھتا وہ اُٹھا دیا جاتا تھا، یہ ایک مستقل وجہِ نزاع ہوتی تھی، اور اس طرح روسی امراء کے دل حسد و مخاصمت کا آتشکدہ بنے رہتے تھے، لیکن جب پانی سر سے گذر گیا، اس قسم کی معمولی معمولی باتوں پر آئے دن کشت و خون ہونے لگے، اور حسد و رقابت کی آگ کی لپٹیں ایوانِ شاہی تک پہنچنے لگیں، تو عہدہ و منصب کا لحاظ اُٹھا کر جھوٹی مشیخت کا دروازہ بند کر دیا گیا، اور اس طوفان کو آتے آتے روک دیا گیا، جو ایک دن عظیم الشان خونریزی برپا کرنے والا تھا، اور جو خاندانوں سے گذر کر قبائے حکومت کو بھی تار تار کر دیتا، چنانچہ کتاب الاعزاز جلا دی گئی، اور اس قسم کی خاندانی نزاعات کے لئے خاص سزائیں مقرر کی گئیں، عہدہ و منصب کے لئے ذاتی قابلیتوں کی پُوچھ ہُوئی، اور وہی شخص معزز سمجھا جانے لگا جو اعزاز کے قابل ہو، یا بادشاہ اس سے گفتگو کرے،

صفحاتِ گذشتہ میں کسی جگہ ضمناً پڑھا ہوگا کہ روسی اپنے مال و متاع کو زار کی ملک سمجھتے تھے، یہ خیال عرصہ تک قائم رہا، اور اس طرح قائم رہا کہ امراء صرف عارضی زمیندار اور کاشتکار محض مزدور کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا کام یہ تھا کہ شبانہ روز کی محنت سے کھیتوں کو تیار کریں اور بادشاہ و امراء کو نفع پہنچائیں، اس میں سے وہ جو کچھ چاہیں دیدیں، اور اس کے عوض جس طرح اور جو چاہیں کام لیں، وہ نہ اس کے مجاز تھے کہ اپنی محنتوں کا صلہ مانگیں، نہ اس کا حق رکھتے تھے کہ کسی کام سے انکار کریں، بالفاظِ دیگر یہ لوگ بالکل غلام تھے، اور ان بے درم غلاموں کے سپرد مختلف کام تھے، بعض کا کام خدمت و چاکری تھا، بعض کے تفویض زمینیں تھیں جن کو وہ بوتے اور ان کی حفاظت کرتے تھے، بعض سے بیگار کا کام لیا جاتا تھا، اور بعض یہ تینوں کام کرنے پر مجبور تھے، جو لوگ اس قدر کام نہ کرتے، یا نہیں کر سکتے تھے، اُنہیں سالانہ ٹیکس دینا پڑتا تھا، ورنہ قید کی سختیاں جھیلنی ہوتیں

جس کی میعاد سال میں کم ازکم ایک مہینہ ہوتی تھی،

اس کے علاوہ ان غریبوں پر ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ امراء ان کو بیچ ڈالتے تھے، اور یہ سلسلۂ فروخت برابر جاری رہتا تھا، آخر تنگ آکر ان غریبوں نے احتجاج کیا، حضورِ شاہی میں عرضیاں بھیجیں، لیکن قوت کے گھمنڈ نے پرامن احتجاجوں، اور وفادارانہ درخواستوں کو ٹھکرادیا، اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بدامنیوں نے سر اُٹھایا، جنوبی روس کے بعض علاقوں میں ہنگامے ہُوئے، اور ۱۵۹۷ء کی خونریز شورش نے حکومت تک کو ہلادیا، اس پر زار کو ہوش آیا، اور نقیب نے شاہی فرمان کا اعلان کیا، اس فرمان کی رو سے یہ ناجائز خرید و فروخت قطعاً بند کردی گئی، ایسا کرنے والوں کے لئے سزائے تازیانہ مقرر ہوئی، اور مزارعین کے ساتھ مراعات کا قانون جاری کیا گیا، لیکن جب حکومت خود ناانصافیوں میں ڈوبی ہوئی تھی، اور نظامِ حکومت سرتاسر ظلم وستم پر مبنی تھا، تو ان باتوں سے کیا ہوتا کچھ دن تو اس فرمان کی تعمیل ہوئی، اور قانون پر بھی عملدرآمد رہا، لیکن پھر وہی جوروجفا کا دور دورہ ہوگیا بیگار کا کام بھی جاری ہوا، ٹیکس اور قید و بند کی مصیبت بھی زندہ ہوئی، اور اپنے ساتھ چند مصیبتیں اور لائی، یہ مُصیبتیں زجر و توبیخ، ضبطیٔ مال و جائداد اور جلاوطنی کی مصیبتیں تھیں، مگر ظلم وستم کی یہ آخری یورش تھی، جو ایک خوفناک خونریزی کے بعد پسپا ہوگئی، اور گو اس وحشیانہ رسم کا کلیتہً خاتمہ نہیں ہُوا، تاہم غریب مزارعین کو روز روز کی مُصیبتوں سے نجات مل گئی، اور وہ ایک گونہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگے •

(باقی دارد) "ناظر"



ان ۴۸ ریاستوں میں کسی جگہ شاید ایک چھوٹے سے قصبہ یا جھونپڑہ میں ایک غیر معروف عورت یا مرد رہتا ہے جو بہت جلد ایک اعلےٰ پایہ کا قصہ نویس بن جائیگا +

صرف ایک کہانی یا کوئی طبع زاد دلاویز قصہ اُس کی شہرت کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگر دراصل یہ اپنے ذہن سے اختراع کیا ہُوا افسانہ ہوگا اور حد درجہ کا موثر و دلچسپ جو جمہور کی عنانِ توجہ اپنی طرف منعطف کرا لیگا جو موجودہ قصہ نویسوں کے دامِ تزویر میں پھنسے ہُوئے ہیں۔ ایسے مصنف کی تلاش کے لئے مالکان کولیرس نے مِس وائیلار وزبرو کو مقرر کیا ہے جس نے او ہنری اور ایکس ریچ کو تلاش کیا تھا اور اس کی امداد کے لئے تیس ہزار روپے کی رقم پیش کی گئی ہے !!

انعامی مقابلہ کا اعلان ہر شخص خواہ اُس میں شامل ہونے کی استطاعت و جرأت ہو یا نہ ہو ضرور بہ نگاہِ تعمق اُس کا مطالعہ کریگا۔ تیس ہزار روپے کی رقم خطیر کتنے آدمیوں کو اعلےٰ درجہ کا قصہ لکھنے کا لالچ دیگی۔ کتنے قصے کہانیاں اخبار اور رسالے کے لئے جمع ہو جائینگی اور کس قدر نئے پُرانے مضمون نویسوں میں سخت مقابلہ ہوگا؟ ایک نیا مصنف ایک سالخوردہ مصنف سے زیادہ دلچسپ قصہ لکھ سکتا ہے کیونکہ تمام و کمال خیالات ابھی تک اُس کے دل و دماغ کی چار دیواری میں ہی مستور ہیں۔ کہنہ مشق قصہ نویس اگرچہ لکھنے کے ڈھنگ قصہ کی ترتیب اور زباندانی و روزمرہ کے لحاظ سے ہر طرح نئے رنگروٹ پر فوقیت رکھتا ہے مگر مقابلہ خوب ہوتا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مالکانِ اخبار کی چاندی ہو جاتی ہے وہ محنت و کاوش سے لکھے ہُوئے بہت سے نایاب و بلند پایہ قصے حاصل کر لیتے ہیں جو شاید پچاس ہزار یا ایک لاکھ روپیہ علیحدہ علیحدہ نئے اور پُرانے مصنفین کو پیش کرنے پر بھی میسر نہ ہو سکتے۔

مُدیرانِ جرائد کے علاوہ کتب فروش بھی قصہ نویسوں کی حوصلہ افزائی گرانبہار قوم سے کرتے ہیں۔ خرید شدہ کتابوں اور ناولوں کو اعلیٰ کاغذ پر چھاپ کر ہر طرح نظر فریب دیدہ زیب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ حال ہی میں مختلف دارالعلوم کی قصہ نویس جماعتوں کے لئے زبانِ انگریزی کی ایک لغت مرتب کی گئی جسے فنک اور ویگنلس کمپنی نے اٹھاون لاکھ کی رقم صرف کر کے شائع کیا۔ یہ ایک کتاب کے شائع کرنیکا خرچ ہے +

وہ قصص جو کسی انعامی مقابلہ میں پیش کئے جائیں عموماً اُن کی تعداد اشاعت زیادہ ہوتی ہے اور نہ صرف یہ شائع کنندگان کے لئے موجب نفع ہو سکتے ہیں بلکہ عام پبلک کا رجحانِ طبیعت بھی انہیں کے مطالعہ کی طرف ہوتا ہے۔ میری کوریلی کا ناول تھلما صرف انگریزی زبان میں سات لاکھ چھپا اور بکا۔ "ڈائین آف دی گرین وین" پہلی مرتبہ لاکھوں کی تعداد میں ۹ فروری ۱۹۱۴ء کو چھپا مگر بکری اور مانگ کی یہ حالت تھی کہ شائع کنندگان نے بار دیگر کئی لاکھ کی تعداد میں ۱۲ روز کے بعد ۲۱ فروری کو پھر چھاپ دیا مگر مشتاقانِ قصہ کا یہ عالم تھا کہ ۸ دن کے بعد ۲ مارچ کو تیسری دفعہ پھر شائع کیا گیا۔ ایتھل۔ ایم۔ ڈیل کا قصہ بنام "دی وے آف این ایگل" ۱۹۱۲ء سے لیکر ۱۹۱۷ء تک ۳۶ دفعہ صرف انگلینڈ میں چھپا۔ الگزینڈر ڈوما کا ناول "دی تھری مسکیٹرز" ایک کروڑ سے زائد کی تعداد میں صرف امریکہ و انگلینڈ میں بک چکا ہے ان کے علاوہ سراغرسانی کے افسانوں کی بکری اور مانگ ان سے بڑھ کر ہے۔ سر اے کانن ڈائل ایڈگر ایلن پو اور آرتھر بی ریو کے ناول اور کہانیاں لاکھوں کی تعداد میں ہر سال شائع ہوتی ہیں۔ اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں مگر کیا مجال کہ ہندوستان کے کسی ناول نویس کا کوئی قصہ کبھی ایک دو دفعہ سے زائد چھپا ہو۔ اور دس بیس ہزار کی تعداد میں بکا ہو۔ اول تو صحیح فسانہ نویسی کا مذاق نہ ملک میں پیدا ہوا نہ کسی نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی۔ ملک کی اس علمی کمی کو پورا کرنے کے لئے جو کچھ بھی اُستادانِ فن نے لکھا وہ بسا غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس فن کی توسیع میں ابھی بہت گنجائش باقی ہے +

ایک مشہور قول ہے کہ انسان شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اکتساب سے کوئی شاعر نہیں ہوتا ایک ایسے فن کے لئے جو مبداء فیاض نے ودیعت کیا ہو۔ انسان تلمذ اختیار کر سکتا ہے۔ مگر وہ فن جو خود بھی انسان حاصل کر سکتا ہے اُس کے لئے کوئی صلاح کار نہیں کوئی مشورہ نہیں۔ مگر ممالکِ مغرب میں جہاں فنِ موسیقی۔ فنِ شناوری۔ فنِ رقص۔ فنِ حکمت و جراحی اور فنِ شاعری کی درسگاہیں موجود ہیں وہاں فنِ قصہ نویسی کے لئے بھی ملک کی ضرورت کے مطابق کئی دارالعلوم جاری کئے گئے ہیں۔ بہرحال اب میں قصہ لکھنے کی ترکیب پر مفصل اور مجمل طور پر بحث کرونگا۔ سب سے اول یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا مطمحِ نظر اہلِ مغرب کے زاویۂ نگاہ سے

بالکل مختلف اور واضح تر ہے۔ جس طرح انگریزی اور ایشیائی شاعری بالکل دو مختلف چیزیں ہیں اسی طرح ہمارا مذاقِ قصہ گوئی یورپ و امریکہ کے مذاق سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ بدقسمتی سے قصہ کی رنگینی محبت و الفت اور تعشق خیز باتوں کو تفویض کی جاچکی ہے۔ جہاں قصہ میں یہ مفقود ہوں وہاں دلچسپی عنقا ہے۔ ممالکِ مغرب میں قصہ گو کے لئے یہ بڑی رعایت ہے کہ اُسکی کہانی میں رنگینی و لطف بڑھانے اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اعلےٰ طبقہ سے لے کر ادنیٰ درجہ تک کی بے حجاب و بے نقاب عورت ہر وقت دست بستہ اُس کے حضور میں حاضر رہتی ہے۔ جہاں اتنی آزادی و بے باکی ہو جو آج متمدن دنیا کو حاصل ہے وہاں ناول نویسی کا دائرۂ خیالات نہایت وسیع ہو سکتا ہے برعکس اس کے ہندوستان کی تہذیب اور غیرتِ قومی اِس بات کی مقتضی ہے کہ ہم اپنی شانِ خودداری اور حمیتِ دینی کو ہاتھ سے نہ جانے دیں مگر یہ دو باتیں قصہ نویس کے لئے بالکل متضاد ہیں۔ ملک کے بگڑے مذاق کے مطابق ہم کسی قصہ سے جو مقبولِ انام ہونیکا آرزومند ہو صنفِ نازک کو دُور نہیں رکھ سکتے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم یورپ و امریکہ جیسا غیر مہذب سلوک اس کے ساتھ روا نہ رکھیں۔ علاوہ ازیں بہت سے موضوع ایسے بھی ہیں جن میں اس جنسِ لطیف کا ذکر خیر نہ ہو مگر وہ ایک خاص طبقہ یا حلقہ میں محدود ہو کر اُنہیں کی داد و دہش حاصل کر سکتے ہیں +

کہانیوں کی اقسام پر تبصرہ کرتے ہُوئے وائیٹ کُومب اپنی کتاب "مکالمۂ ناول" کے دیباچہ میں دو سو سے زائد کہانیوں کا تذکرہ کرتا ہے مگر اُنہیں کسی تحت میں منقسم نہیں کرتا۔ ذیل کی تقسیم ایک قصہ نویس کے لئے کئی طریقوں سے سودمند ہو سکتی ہے :-

(۱) قصص جن کی بنیاد انسانیت پر ہو۔
- قصص طفولیت و عہد شباب۔
  - اسکول
  - کالج
  - سیاحت
  - آغاز زندگی
- صنفِ نازک
  - خاندان و انتظامِ خانہ داری
  - محبت و الفت
- صنفِ ذکور
  - سیاحت و رحلت
  - جنگ و جدل
  - سیاست

(۲) قصص جو فطرتِ اخلاقی پر مبنی ہوں
- اوضاع و اطوار
  - عروجِ اطوار
  - انحطاطِ اطوار
  - تربیت اطوار
- محرکات یا تحریکی
- مسائلِ اخلاقی
- مذہبی

(۳) قصص جو پیشہ وری پر مبنی ہوں
- قصصِ مزدوری
- " تجارتی
- " صنعت و حرفت
  - علمی
  - فنی
  - طبعی
- " بحری و بری
- " تفریحی
  - سفرنامہ
  - سیر و شکار
  - تمثیلات یا تھیئٹر

(۴) قصص بدوی و حضری
- قصص حالات روزمرہ
- " ملک
- " شہری
- " جماعتی
- " قومی
- " غیر ملکی
- " بین الاقوامی

(۵) قصص جن کی بنیاد تحیر پر ہو
- قصص پُر تخیل
- " توہم پرستی
- " پُر خطر
- " ارواح سفلی و علوی
- " رازداری
- " سراغرسانی
- " سعی و استقلال

(۶) قصص جنکی اساس معاشرت پر ہو
- قصص امرا
- " مجالس
- " متوسطین
- " غربا
- " ارذال فرد مائگان
- " جرائم پیشہ

(۷) قصص جن کی بنا تحریکِ جذبات پر ہو
- قصص محبت و الفت
- " دوستی و صداقت
- " شجاعت و تہور
- " حقارت و تنفر
- " حسد و رشک
- " قصاص و انتقام

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہنر مندی سے قصہ لکھنا ایک فن تصور کیا گیا ہے۔ بُرا قصہ لکھنے سے نہ لکھنا بہتر ہے کیونکہ وہ غیر مطبوعہ رہتا ہے یا پڑھنے والے کے دل پر کوئی خاص اثر نہیں پیدا کرتا جو قصہ نویس کا منتہائے خیال ہوتا ہے +

سب سے اول ہمیں قصہ کا مضمون تلاش کرنا ہوتا ہے۔ یا یوں کہئیے کہ نفسِ مضمون کی خواہش ہوتی ہے ہم اس خیال میں محو ہو جاتے ہیں جس پر ہمارے قصے کو نشوونما پانی ہو ہم سوتے ہوں یا جاگتے۔ کھاتے ہوں یا پیتے۔ چلتے ہوں یا بیٹھے کہ دفعتہً ہمارے دل میں ایک تحریک سی اُٹھتی ہے جو تھوڑی سی موہوم شکل کے ساتھ ہمارے پیش ہو کر دست بستہ عرض کرتی ہے "حضور عالی! میں ایک کہانی ہوں۔ مجھے لکھ لو" اور پھر اُس وقت چین نہیں آتا جب تک کہ درحقیقت وہ ایک کہانی کی شکل وصورت اختیار کر کے صفحۂ قرطاس پر نہ پھیل جائے

بعض اوقات ایک غیر معمولی نگاہ۔ کسی گفتگو کا ایک لفظ۔ کسی بازار کا واقعہ۔ کسی اخبار کا پھڑکتا ہُوا محاورہ۔ کوئی تحریکِ اعصابی یا کسی کتاب کا چست فقرہ موادِ قصہ تلاش کرنے میں بڑی حد تک ممد ومعاون ہو سکتا ہے۔ اِس قسم کے ہزاروں واقعات سے ہم کوئی ایک ایسا چھوٹا سا خیال حاصل کر لیتے ہیں جو ایک ننھے پودے کی طرح بڑھتے۔ پھلتے۔ پھیلتے گنجان درخت کی شکل اختیار کر لے۔ بعض اوقات اُس چھوٹی سی تجویز کو کئی دن۔ ہفتے۔ مہینے اور سال گذر جاتے ہیں مگر وہ کہانی کی اُس دل آویز ودلفریب شکل میں نہیں ڈھلتی جس کے لئے اتنی دماغ سوزی کی گئی ہو۔ مگر عقلمند ہے وہ مصنف جو نہایت تحمل وبردباری سے اپنے خیالات کی تربیت وپرورش میں کوشاں رہے۔ کیونکہ تعجیل وتعویق ہی قصہ کی بربادیٔ بردمندی کے ضامن ہیں +

موادِ قصہ تلاش کرنے کے بعد تخیلی عالیشان وسر بفلک عمارت کو استوار کرنے کے لئے مصالحہ کی ضرورت لاحق ہُوا کرتی ہے۔ اور قصہ کا مصالحہ حاصل کرنے کے مندرجہ ذیل ماخذ قرار پائے ہیں:۔

(۱) مشاہدہ	(۳) مطالعہ بدون استمدادِ غیری	(۴) اقتباس	(۶) مباحثہ
(۲) تجربہ		(۵) مُطالعۂ کتب	(۷) ضبطِ خیالات

(۱) مشاہدہ

واقعات کی جستجو کرو۔ وہ تمہارے دل پر اثر انداز ہونگے اور پھر تمہارے قصہ کی وساطت سے ویسا ہی اثر تمہارے قارئین پر ڈالیں گے۔ رسکن نے ایک معمولی بلوری ٹکڑے کے سنگین دل میں دلچسپیوں کی ایک چھوٹی سی دنیا دیکھی تھی۔ تھوریو ایک گنجان جنگل میں ایسا بیخود ہوکر بیٹھا کہ تمام حشرات الارض اور طیور نے اُس کی چشمِ ظاہر بین کے سامنے اپنی تمام حقیقت زندگی کھول کر رکھ دی۔ پریر تین سال تک اپنے خورد سال بچّے کا مطالعہ کرتا رہا حتٰے کہ وہ بچوں کے دلی جذبات کا محرم راز بن گیا۔ سر والٹر سکاٹ نے روکبی کی "غار گیٹوڈ ینزائل" کا خاکہ کھینچنے کے لئے اُن عجیب خودرو پھولوں اور جڑی بوٹیوں کا مشاہدہ کیا جو اُس کے ارد گرد قدرت نے پیدا کر رکھے تھے۔ غرضیکہ ہر خاکہ سپردِ قلم ہونے سے بیشتر مشاہدہ کا طالب ہوتا ہے۔ ایک ایسا قصہ نویس جس نے آج تک کوہستان نہیں دیکھا۔ وہاں کے حالات ایسی خوبی و خوش اسلوبی سے ہرگز بیان نہ کر سکیگا جس قدر کہ وہ شخص جس نے اُس سرزمین میں مشاہدۂ قدرت کیا ہو۔ ایک جہاز کا واقعہ بیان کرنے سے پہلے اُس کے چپہ چپہ کا مطالعہ لازمی و لابدی ہے ورنہ تمہارے قصہ کی رنگ آمیزی اس قدر پھیکی پڑ جائیگی کہ پھر کوئی رنگ چڑھائے نہ چڑھیگا۔

(۲) تجربہ

آلبرائیٹ اپنی کتاب "مختصر کہانی" کے صفحہ ۱۵ پر لکھتا ہے کہ امریکہ کے مشہور ظریف قصہ نویس مارک ٹوین نے اس بات کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے کہ بلا ٹکٹ ریلوے یا ٹرام گاڑی میں سفر کرنے والے مسافروں کا کیا حال ہوتا ہے اور ریلوے ملازمین اُن کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھتے ہیں۔ پندرہ دفعہ اپنا خریدا ہُوا ٹکٹ پھینک کر دوبارہ اُن کی قیمتیں طلب کرنے پر ادا کیں اور اس تجربہ کی بنا پر جو کہانی لکھی گئی وہ دو ہزار پانچسو روپے میں بکی +

ایک اور سالخوردہ مصنف اپنے الفاظ میں ایک ذاتی تجربے کا بیان کرتے ہُوا لکھتا ہے کہ میرے افرادِ قصہ میں ایک پادری تھا جس نے یہ بیڑا اُٹھایا کہ وہ پیرس کے اُن تاریک گوشوں تک جو جرائم پیشہ اشخاص کے جائے پناہ تھے اپنا پند و نصیحت کا جال پھیلا دیگا۔ لیکن مجھے خود کبھی اُن خوفناک مکانوں میں جانیکا اتفاق نہ ہُوا تھا۔ میں اُن کی ساخت یا اُن کے مکینوں

کی طرز رہائش سے بھی ناواقف تھا۔ بازاری گپ شپ میرے قصہ کی دلچسپی بڑی حد تک زائل کر سکتے تھے مگر میں نے ذاتی تجربہ کو سب سے بہتر معلم خیال کیا اور پیرس کے ادنیٰ درجہ کے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں تبدیلِ لباس واسم کرکے جا کھیلنے اور دیگر ایسے خرافات و مشاغلِ واہیات میں منہمک ہوگیا۔ آخر اپنے یاران سرپل کی رسائی سے میں اُن تہ خانوں اور تنگ و تاریک مکانوں میں بھی جا پہنچا جہاں روزِ روشن میں وہ سیاہ کاریاں ہوتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اور اس تجربہ نے جہاں میرے اس قصہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر میری شہرت و ناموری کا ڈنکا چار دانگِ عالم میں بجا دیا وہاں مجھے اُنہیں شوریدہ سر اور اوباش بیفکروں کی صحبت میں رہنے کے باعث ایک معمولی نقب زنی کے جرم کی پاداش میں تین مہینہ کا جیلخانہ بھی دیکھنا پڑا۔ مگر آنی دفعہ میں دو اور ناولوں کے لئے ایسے نایاب اور گرانبہا خیالات و مضامین لیکر آیا جنھوں نے میری ڈیڑھ سال کی دلی کلفت دھونے کے علاوہ لاکھوں روپے بھی دلا دیئے۔

مگر بعض اوقات اس قسم کے تجربات نہایت تلخ ثابت ہوئے ہیں۔ امریکہ کا فنِ سراغرسانی کا ایک ماہر جو اس ہنر کے مبتدیوں کو تعلیم دیا کرتا تھا اپنے خود تصنیف قصہ کے لئے ایک نقب زن کے دلی جذبات کا چربہ اُتارنا چاہتا تھا۔ وہ ایک رات بتبدیلِ ہیئت ایک کروڑپتی کے گھر جا گھسا اور نہایت کامیابی کے ساتھ اُس کے کمرۂ شب خوابی سے اُس کی خوب صورت نوجوان بیوی کا موتیوں کا ہار چرا لایا جو بلاشبہ پچاس ہزار روپیہ سے کم قیمت کا نہ ہوگا۔ اگرچہ اُس وقت تک اُس کا یہی ارادہ تھا کہ دوسرے روز ایک رسمی خط کے ساتھ وہ ہار واپس کرکے مالکِ مکان کو شب کے وقت ہوشیار رہنے کی ہدائت کریگا مگر آفتابِ عالمتاب کے نصف النہار تک پہنچتے ہی ایک بیوفا محبوب کی طرح اُسکا دل پھر گیا صرف ایک چوری سے اُسکا اپنا مدعا بھی پورا نہ ہوا تھا۔ دوسری شب اُس نے ایک واقفکار کے گھر ڈاکہ ڈالا جہاں سے ایک ننھا سا خوبصورت صندوقچہ جواہرات کا اُڑا لایا جو کئی لاکھ کی مالیت کا تھا۔ اب وہ حالتِ قلبِ دو نیم میں تھا۔ خواہشاتِ نفسانی کے ترازو میں اُسکے ضمیر اور جواہرات کا وزن ہو رہا تھا آخر تھوڑے عرصہ کی جد وجہد کے بعد نتیجہ بخش پلڑوں نے تصفیہ کے خرمن ادھر اُدھر الٹ دیئے۔ پروفیسر نے فیصلہ کر لیا کہ وہ قسمت سے ہاتھ آئے ہوئے مال کو یوں واپس ہوتے دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ اب چور پکڑنے والا افسر خود چور تھا اور پولیس اُس کی تلاش میں تھی۔

(باقی آئندہ)

محمد ضیاء الدین شمسی (لاہور)

قافیہ و روی الطا

عرب کے اشعار میں قافیہ کے لئے دو اعتبار ہیں ایک تو قریب قریب اُسی کے ہے جیسے فارسی و اردو والے بھی قافیہ کہتے ہیں فرق اتنا ہے کہ عرب کے اشعار میں ردیف نہیں ہوتی لامحالہ قافیہ اُن کا آخر بیت میں واقع ہوگا اور راو اور تاسیس و دخیل کا عرب لوگ وجوباً التزام رکھتے ہیں۔ وہ لوگ کبھی قاتل دکامل کے ساتھ محل کو قافیہ نہ کرینگے۔ فارسی و اردو والوں نے تاسیس ردخیل کو اُڑا دیا قاتل کو بسمل کے ساتھ بے تکلف قافیہ کرتے ہیں۔ عرب جبر کا قافیہ فخر واجر بے تامل کرتے ہیں فارسی والوں نے قید کو لازم کرلیا ہے۔

دوسرے وزن ضرب کا اعتبار قافیۂ عرب میں واجب ہے مثلاً متدارک یا متواتر ہونا یعنی متواتر کے ساتھ متدارک وغیرہ کو جمع نہ کرینگے۔ محقق علیہ الرحمہ نے اسکے خلاف یہ شعر نقل کیا ہے

یا لیتنی فیہا جذع + اخب فیہا و اضع

یعنی پہلے مصرع میں دو ساکنوں کے درمیان دو حرف جیم و ذال متحرک ہیں پس قافیہ متدارک ہُوا۔ دوسرے مصرع میں دو ساکنوں کے درمیان تین حرف واو الف ضاد متحرک ہیں اور قافیہ متراکب ہے۔ اسی وجہ سے محققؒ کی رائے میں وزنِ ضرب کا اعتبار قافیہ میں قضیۂ مانعۃ الخلو ہے

نہ مانعۃ الجمع۔ لیکن عروض مجمع البحرین میں یہ فقرہ "والتجرید من عیوب القوافی وھو ان یختلف ضروب الابیات فی الوزن کما اذا کان احدی قوافی الطویل المعنی والاخری الغنی" سراسر اس رائے کے خلاف میں ہے یعنی بحرِ طویل میں کسی شعر کا قافیہ المعنی ہو اور کسی کا الغنا اس میں پہلا متواتر ہے دوسرا متدارک اس اجتماع کو عیب تجرید کہتے ہیں کہ ایک بیت کے آخر میں مفاعیلن آئیگا دوسری بیت کی ضرب مفاعلن ہوگی۔ محقق نے جو شعر مثال میں لکھا ہے اُس میں عیب تجرید ہے اس سبب سے وہ شعر ہی قابلِ استناد نہیں ہے جس بنا پر محقق نے مانعۃ الخلو ہونے کا حکم کیا ہے۔

ہاں فارسی و اُردو کہنے والوں نے قافیہ سے وزنِ ضرب کے اعتبار کو اڑا دیا وہ معنی

کا قافیہ غنا بے تامل کرتے ہیں جیسے گلشن کا قافیہ چمن اور کوثر کا قافیہ قمر۔ مگر عربی میں ایسا نہیں ہے صدہا دیوان اقحاحِ عرب و مولّدین کے موجود ہیں اُن میں ڈھونڈھئے کسی قصیدہ میں وزنِ ضرب کا اختلاف نہ ملیگا۔ اُردو والے بھی اس عیب سے بے خبر ہیں بحرِ خفیف میں مثلاً ایک بیت کا قافیہ چوکھٹ (فعلن) کرتے ہیں دوسری کا لپٹ یعنی جزوِ فَعِلن اور یہ اختلافِ ضرب بے شک بُرا معلوم ہوتا ہے مگر فارسی و اُردو والوں کو اس کی عادت ہوگئی اس لئے عیب ڈھنگ گیا۔ میں نے ایک شعر بتکلف اس بات کے سمجھانے کے لئے بنایا ہے ؎

ابر آیا ہے بادہ خوار آئے (اب) بے پئے کس طرح قرار آئے

ردیف۔ عروض و ضرب کے مقام پر ہے اور ایک مصرع میں فعولن دوسرے میں مفاعیل کے آجانے سے ردیف میں جو تغیر ہو گیا ہے وہ برا معلوم ہوتا ہے۔

ہیچمدان کو اس بات پر وثوق حاصل ہے کہ فارسی والے جس طرح عروض کے اکثر مسئلوں کو نہیں سمجھے قافیہ میں وزنِ ضرب کے التزام کو بھی بیکار سمجھے اور آج تک قافیہ کی اس تقسیم کو یا مترادف ہوگا یا متواتر یا متدارک یا متراکب یا متکاوس معمیٰ سمجھا کئے۔ یہ قضیہ منفصلہ حقیقیہ ہے اسے مانعۃ الخلو نہ کہنا چاہیئے۔ محقق رح نے فارسی والوں کو اس الزام سے بچانے کے لئے یہ تاویل کرلی ہے۔

یہ ذکر یہاں فائدہ سے خالی نہ تھا اس سبب سے مفصل بیان کردیا تفصیل سے مقصود یہ بھی ہے کہ عرب کے قافیہ میں اتنے جھگڑے ہیں۔ ۱۔ آخر بیت میں واقع ہو۔ ۲۔ تاسیس و دخیل کا التزام ضرور رہے ۳۔ حرفِ قید کا التزام مطلق نہ ہو۔ ۴۔ وزنِ ضرب بدلنے نہ پائے یعنی قافیہ اگر متواتر ہے مثلاً تو سارے قصیدہ میں متواتر ہی رہے ان پانچوں قسموں سے ایک کو کسی دوسرے کے ساتھ جمع کرنا بھی درست نہیں اور یہ بھی نہیں ممکن کہ ان پانچ قسموں سے کوئی قسم پائی نہ جائے بلکہ چھٹی صورت ہو۔ ان بکھیڑوں کے سبب سے عرب کے قافیہ کی تعریف اُلجھن میں پڑ گئی۔ محقق علیہ الرحمہ نے قافیہ کی جو تعریف "نزدیک تر تحقیق" کہکر لکھی ہے وہ قافیۂ عرب و عجم دونوں کی جامع ہے مگر سمجھنا بڑی تفصیل کا محتاج ہے۔ روی و ردف و تاسیس و دخیل وغیرہ کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ فارسی و اردو والوں کو

ان بکھیڑوں کی ضرورت نہیں ہے۔
جو کلمات کہ متشابہتہ الاواخر ہیں۔ خواہ ایک ہی حرف اور اُس کی حرکت ماقبل کا تشابہ ہو جیسے در۔ بر۔ خواہ حرف بعینہ ایک ہی طرح کے حرکات و سکنات کے ساتھ پائے جائیں بشرطیکہ ان حروف میں کم سے کم پہلا حرف اصلی ہو۔ جیسے آزد۔ کازد جس میں سب حرف اصلی ہیں۔

چبانا۔ دبانا میں فقط پہلا حرف ب حرف اصلی ہے۔ کھولنے بولنے میں واو و لام دو حرف اصلی ہیں سردی زردی میں رے اور دال حرف اصلی ہیں۔

فارسی و اردو میں ایسے کلمات ایک دوسرے کا قافیہ کہلاتے ہیں۔
اس سے یہ نکل آیا کہ جبر کا قافیہ صبر ہے فخر و بکر ہرگز نہیں کہ تشابہ بعینہ مفقود ہے اور قاتل و عامل میں محض لزوم مالایلزم ہے ورنہ قاتل کا قافیہ بسمل کافی ہے اور تشابہ بعینہ بھی مقصود ہے یعنی قاتل میں ت ہے عامل میں میم ہے۔ اگر کوئی جُدا اور ہُدا اور خدا قافیہ کرے تو دال کا التزام لزوم مالایلزم ہے ورنہ دال کا حروفِ ضروری قافیہ میں شمار نہیں۔ اسی طرح یمین و ثمین و کمیں وغیرہ میں میم کا التزام شاعر کا امر اختیاری ہے البتہ اس طرح کے التزام سے قافیہ میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ سب مثالیں اُن قافیوں کی ہیں جن میں اس فن کے اعتبار سے سب حرف اصلی فرض کرلئے گئے ہیں۔ یہ وہم نہ کرنا چاہیئے کہ یمین و ثمین و ظہور و مشکور میں حرف یا و واو صرفی کی نظر میں حروفِ زائدہ ہیں۔ بے شک زائدہ ہیں لیکن فنِ عروض میں اُنہیں حروفِ زائدہ سے بحث کرتے ہیں جو حروفِ اصلیہ کے بعد زائد کئے جائیں مثلاً حاصلات و واقعات میں عرب کا شاعر بھی محض الف و ت کو حروفِ زائدہ میں شمار کریگا۔ گو الف فاعل بھی ان دونوں کلموں میں زائد ہے اُس کے زائد ہونے سے شاعر کو کچھ بحث نہیں ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ قافیہ میں ضرورت اسی طرح واقع ہوئی ہے اور عمل بھی اسی پر ہے۔
اب اگر حروفِ زوائد کے انکال ڈالنے کے بعد بھی قافیہ باقی رہے جیسے چب

دب - اس میں ب کو روی کہیں گے اور حرکت ماقبل کو توجیہ - کھول بول - سرد زرد میں ل اور دال بترتیب حرفِ روی ہیں اور واو و را بترتیب ردف و قید ہیں -

یعنی حروفِ اصلی کا حرفِ آخر روی ہوتا ہے آرد و کارد میں دال روی ہے نام و کام میں میم در و بر میں حرفِ ر - ہیچمدان کی رائے میں آزار و بازار میں رے روی ہے اور زے لزوم مالا یلزم - ہے ساز آرو ناز آر کے ساتھ بازار و آزار قافیہ معمولہ ہوگا جو عیوب قافیہ میں سے ہے

فائدہ - روی کے پہلے ایک یا دو ساکن ہوں تو روی کی طرح اُن کا بھی مکرر ہونا فارسی و اُردو میں لازم ہے اور روی کے بعد جو حروفِ زوائد ہوں اُن کا بھی مکرر ہونا لازم ہے غرض روی حروفِ اصلی کا آخر اور زوائد سے سابق ہوتا ہے -

حاصلات و واقعات میں حروفِ زوائد کے دور کرنے کے بعد حاصل و واقع میں قافیہ باقی نہیں رہتا بس اسے ایطا کہتے ہیں اور یہ مثل اسی کے ہے جیسے حاصل اور حاصل یا واقع اور واقع کوئی قافیہ کرے - یعنی حاصلات و واقعات حکمِ تکرارِ قافیہ میں ہے اور تکرارِ قافیہ ایطا ہے پس حاصلات و واقعات پر ایطا کا حکم ہوگا -

حاصلات و فاضلات میں لام روی ہے بعد حذفِ زوائد حاصل و فاضل قافیہ باقی رہتا ہے اس میں ایطا نہیں ہے آس الف اور ت کو وصل و خروج کہتے ہیں - مگر میں حروف زائدہ ہی کہنا بہتر سمجھتا ہوں کہ اس فن میں بلاضرورت بھی اصطلاحات بنالئے گئے ہیں - جیسے سکاکی نے "زبانِ مخترعہ" سے تعبیر کیا ہے -

بعض مصنفین کا یہ لکھنا کہ بعد حذفِ زوائد اگر روی مختلف ہوجائے تو ایطا ہے - تسامح سے خالی نہیں اس لئے کہ جب زوائد حذف ہوگئے اور تشابہ نہ پایا گیا تو اُن کے ساتھ ہی حرف روی بھی تو حذف ہوگیا - مثلاً کہا اور سنا میں الف زائد ہی تو روی تھا جسے حذف کر دیا اور کہ سُن باقی رہ گیا جس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ کہا اور سنا میں تکرارِ روی بیک معنی واقع ہوئی ہے جو حکم میں اعادۂ قافیہ کے ہے - اور کہا اور رہا میں بھی تکرارِ الف بیک معنی واقع ہوئی ہے مگر اس سبب سے کہ بعدِ حذفِ زائد کہہ اور رہ باقی رہتا ہے - جس میں ہ حرفِ روی ہے ان قافیوں میں ایطا نہ ہوگا - جن قافیوں میں

ایطا ہو وہاں تحقیقِ قافیہ نہیں بلکہ اعادۂ قافیہ ہے۔ اسی طرح اکفا میں تحقیقِ قافیہ نہیں بلکہ اشتباہِ قافیہ ہے جیسے ضبط کا قافیہ ثبت کریں ط اور ت کے قریب المخرج ہونے سے روی کا اشتباہ ہوتا ہے
قافیہ مرکب کا جزوِ مکرر بیک معنی اگر دور کردیں اور اس کے بعد تشابہ باقی نہ رہے۔ تو ایطا ہوگا۔ جیسے جادوگر و ستمگر اور اگر تشابہ باقی رہے تو ایطا نہ ہوگا جیسے ستمگر و صنمگر۔
"قافیہ کی یہ تعریف کہ وہ "مطابقتِ حرکت وسکونِ روی و ماقبلِ روی اور حرفِ روی ہے" موقوف ہے معرفتِ حرفِ روی پر اور روی کی یہ تعریف کہ" حرفیست مکرر کہ بنائے قافیہ بر اوست "، مبہم ہے۔ اس سبب سے کہ بنا سے مراد حروفِ اصلیہ میں کا حرفِ آخر ہے دوسرے مابعدِ روی کا لفظ بھی اس تعریف میں بڑھانا ضروری ہے۔ بوستان و ہندوستان میں واو حرفِ روی ہے مابعدِ روی چار حرفِ زائد ہیں بغیر ان کی مطابقت کے قافیہ کہاں ہو سکتا ہے؟ بوستاں کے ساتھ دوستاں کا قافیہ معمولہ ہوجائیگا قافیہ معمولہ میں حرفِ روی کی تعیین میں اشتباہ پیدا ہوجاتا ہے بوستاں میں حسبِ قاعدہ واو اور دوستاں میں ت روی ہوسکتی ہے، اس صورت میں تکرارِ روی میں خلل آتا ہے اسی وجہ سے اسے عیوبِ قافیہ میں شمار کرتے ہیں۔ بوستاں میں چار حرف زائد ہیں۔ دوستاں میں دو ہی حرف زائد ہیں اگر ت کو روی قرار دیں تو لفظ بوستاں میں ت زائد ہے۔ اگر واو روی قرار دیں تو دوستاں میں واؤ گو حرف اصلی ہے مگر حرفِ اخیر نہیں ہے۔ تیسری وجہ اشتباہ کی یہ ہے کہ الف و نون کو روی مرکب کہیں تو یہ بھی اس عیب سے خالی نہیں کہ بوستاں میں تو الف نون اب اصلی ہو جائیگا اور دوستان میں زائد اور روی کا حرف زائد ہونا ہی بعض کے نزدیک شائگاں ہے جیساکہ محقق نے فرمایا ہے۔
" شعرا از شائگاں احتراز کردہ اند تا بحدیکہ آں یک قافیہ کہ جائزست ہم نیاوردہ اند"
بوستان و گلستاں میں جزوِ مکرر کی تکرار بیک معنی ہوئی ہے بے شک ایطا ہے لیکن گلستاں و دوستاں میں جزوِ مکرر کی تکرار بیک معنی نہیں ہے اس سبب سے ایطا تو نہیں ہے مگر دوستاں میں الف و نون جمع کو حرفِ روی مرکب ماننا پڑیگا جسے شائگاں کہتے ہیں +
فارسی والے حرفِ قید کو لازم سمجھتے ہیں روی ساکن ہو یا متحرک۔ وہ صبر کا قافیہ فخر نہیں کرتے اور صبرش و فخرش بھی قافیہ نہیں کرتے۔ غرض" جب روی متحرک ہو تو روی سے

حسنِ تخیّل

میرا دماغ ایک وسیع ٹکسال ہے۔ جس میں ہر لمحہ و ہر لحظہ خیالات کے سِکّے ڈھلتے رہتے ہیں۔ اُن میں سے بعض کسی نوعمر حسینہ کے برقِ تبسّم کے مانند درخشاں ہیں۔ بعض کوئل کی درد واثر میں ڈوبی ہوئی نغمہ سنجیوں کی طرح دلکش ہیں۔ اور بعض جواہرات و یاقوت کے سے بیش قیمت ہیں ———— بعض کسی بے پروا و بے وفا محبوبہ کی اُڑتی ہوئی نگاہوں کے مانند ہلکے ہیں، بعض غم نصیب مہجور دلوں کی طرح بھاری ہیں۔ اور بعض حسن و شباب کے چلتے پھرتے سائے کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔

اِن سکّوں پر جو مہریں لگائی جاتی ہیں۔ اُنہیں میں پانیوں کی پرشور روانیوں میں، پہاڑوں کی سربلند چوٹیوں میں اور صحراؤں کی پُرسحر تنہائیوں میں تلاش کرتا ہوں اور مجھے کبھی ناکامی نہیں ہوتی بعض اوقات میری مُہر ٹوٹا ہُوا دل ہوتا ہے بعض اوقات کِھلا ہُوا چہرہ اور۔ بعض اوقات وہ آنکھیں جو نہ روتی ہیں نہ ہنستی ہیں۔ صرف اِدھر اُدھر دیکھتی ہیں۔

کئی سال گذر گئے۔ میں اُن مُہروں سے اُکتا گیا۔ میں نے کہکشاں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں میں، قوسِ قزح کے ناچتے ہُوئے رنگوں میں اور سمندر کی نیلگوں گرجتی ہُوئی لہروں میں تلاش کیا لیکن میری کوششیں سعیِ بے سود ثابت ہُوئیں۔ مجھے کوئی نئی مہر دستیاب نہ ہو سکی۔

یکایک اے میرے دل کی ملکہ! میرے سامنے تو آکر کھڑی ہوگئی۔ یاس نے اُمید کی صورت اختیار کر لی۔ اب ہر ایک سکہ جو میری ٹکسال سے تیار ہو کر نکلتا ہے۔ اُس پر تیری شکل کی مُہر لگی ہوتی ہے۔ اور جس پر وہ نہ ہو۔ اُسے میں واپس ٹکسال میں لوٹا دیتا ہوں۔ مجھے اب کسی نئی مہر کی ضرورت نہیں۔ تیری شکل وہ مہر ہے جو ہمیشہ نئی ہے۔ حالانکہ میرا دل محسوس کرتا ہے کہ تو ہمیشہ سے اُس کے پاس ہے۔

زمانۂ جنگ میں بم پھٹتے ہیں، ایامِ امن میں دل ٹوٹتے ہیں۔ میں یہ دیکھتا ہوں اور

سمجھ نہیں سکتا کہ دونوں میں سے خطرناک کون ہے۔

فلاسفر نے مجھے حیران و ششدر دیکھا اور اپنے مؤثر مخصوص انداز میں کہا۔ ایک بم پھٹتا ہے۔ تو بہت سی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ کیا سو دل ٹوٹنے سے ایک زندگی بھی برباد ہوتی ہے۔؟

خواب میں میں نے دیکھا، مجھے بم کا گولہ لگا۔ مگر وقت نے زخم پر مرہم کا کام کیا۔ زخم بھر گیا۔

میں اپنی راہ پر تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ کہ ایک دل پھٹا۔ اور اُس کا خون میرے کپڑے پر داغ بن کر گرا ـــــ اُسے چھٹانے سے دُنیا بھر کے سمندروں کا پانی بھی قاصر ہے

میں خواب میں بیدار ہوا۔

منطقی اور شاعر خدا کی تلاش میں روانہ ہوئے۔

مگر اُنہیں خدا نہ ملا۔ مایوس ہو کر دونو دوست واپس لوٹے۔

راستے میں ایک تاریک جنگل تھا۔ جس کی زمین کو صدیوں سے اِنسانی قدموں نے پامال نہ کیا تھا۔ وہاں دن کے وقت بھی شب تار کی سیاہی چھائی رہتی تھی۔ شاعر نے اُس اتھاہ تاریکی میں، اُس متروک سرزمین میں ایک ننھا سا پھُول دیکھا اور چلّا اُٹھا، یہ اُس کے قدموں کا نشان ہے۔ مگر منطقی کی آنکھیں بند تھیں ـــــ اُسے کچھ دکھائی نہ دیا۔

دور، فاصلے پر ایک پھوس کی کُٹیا سے، رات کی بڑھتی ہُوئی تاریکی میں ایک عابد کے گانے کی آواز آئی۔ شاعر کے دل کی گہرائی میں جھنکار کی صدائے خوشگوار گونج اُٹھی۔ اُس نے اپنی لمبی اُنگلی سے اُس فاصلے کی طرف اشارہ کیا اور پُر معنی طریق سے کہا۔ یہ اُس کی آواز ہے جو ہوا پر لہرا رہی ہے۔ مگر منطقی کے کان بند تھے ـــــ اُسے کچھ سُنائی نہ دیا۔

آفتاب اپنی نور و حرارت کی کرنوں کو سمیٹ کر تاریکیٔ غرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مگر اُس کا چہرہ دہکتے ہُوئے کوئلے کے مانند سُرخ تھا۔ شاعر نے اُس طرف رُخ کیا اور بولا یہ اُس کا جلال ہے۔ مگر منطقی دیوانوں کی طرح ساکت رہا۔ گرمی سے دونوں کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اور

اُن کی پیشانیوں سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ یکایک ہوا کا ایک سرد جھونکا اُن کے جسموں کے ساتھ ٹکرایا۔ گھبرائے ہوئے دماغ ہوش میں آ گئے۔ شاعر نے جھومتے ہوئے کہا۔ یہ اُس کا ہاتھ ہے جو میرے ماتھے کو چھو رہا ہے۔ مگر منطقی اب بھی تاریکی میں تھا۔

آسمان پر تارے نمودار ہوئے۔ دونو دوست گھر کو واپس لوٹے۔ شاعر نے چاروں طرف دیکھا، مگر اُسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ منطقی نے اُس سے دریافت کیا۔ وہ کہاں ہے۔ یکایک شاعر نے آسمان کی طرف سر اُٹھایا۔ اور چلّا کر کہا دیکھو اُس کی حسین آنکھیں مجھے، تمہیں اور ہر ایک چیز کو دیکھ رہی ہیں۔

منطقی جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا لیکن شاعر پر جذبے کا عالم طاری تھا۔

وہ خدا کی تلاش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مگر اُس کے پاس کھڑا ہوا منطقی اُس سے کتنا دور، کتنے فاصلے پر تھا۔

سُدرشن

کامیابی کا واحد راستہ ناکامی ہے۔ — اسٹیفنسن

دوسروں کی خدمت کرنا اپنی خدمت کرنا ہے۔ — ایمرسن

غریب آدمی کا خلوص و ایثار بھی خوشامد سمجھا جاتا ہے۔ — اکبر

جو کچھ بھی تم خیال کروگے خدا اُس کے برعکس ہے۔ — ذوالنون

نیک آدمی اپنی نیکی کو نہیں جانتا۔ کیونکہ اس میں نیکی بہت ہے — (ایک چینی)

تصدق حسین خالد بٹالوی

خیالات

اپنے ہر فعل کا اجر مجھے اِس دُنیا ہی میں مِل گیا! میں نے کبھی بھلائی نہیں کی کہ میرا دل اندر ہی اندر مسرت سے لبریز نہ ہوگیا ہو! ایسے وقت میں میرے نازک جذبات اِس طرح موجزن ہُوئے کہ مَیں اپنی دریا دلی کے ساتھ دُنیا بھر کی تنگ خیالی سے بالا بالا نظر آنے لگا۔ جرأت مجھ سے دامنگیر ہوگئی اور میری مشکل میں پڑی ہُوئی جان کو گردابِ بلا سے یہ کہتے ہُوئے بچا لائی کہ میں اُس جذبۂ پاک کی پروردہ ہوں جس کی پیشانی پر بحرِ ہستی کی موجوں اور اُس کے فلک بوس طوفانوں تک سے ذرا بل نہیں پڑتا! میں نے جان لیا کہ میرے خالق نے صرف اک چھوٹے سے فرض کے ادا ہونے پر اپنی خوشنودی کے ساتھ مجھے قوت و اطمینان کا انمول ہدیہ بھیجا ہے! اور اِس کے لئے مجھے برسوں چھوڑ ساعتیں بلکہ اک لمحہ بھی انتظار نہیں کرنا پڑا میں نہیں جانتا وہ کون برقی قاصد تھا جو اِس دل خوش کُن پیغام کو چشم زدن میں مجھ تک لے آیا، مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہُوا گویا دل کے کسی تاریک کونے میں شعاعِ نور کا پرتو پڑا جس سے یہ چشمۂ مستور بے اختیاری کے ساتھ بہہ نکلا اور اِک دریائے بے کنار بن گیا!

اِدھر میں نے کبھی نیکی سے اجتناب نہیں کیا کہ میرا ضمیر میرے اِس باغیانہ انحراف سے پاش پاش نہ ہو گیا ہو۔ میں نے اِس شکستگی کو اپنی خوش بیان تسلّیوں اور قہقہہ آمیز خوشیوں کے نیچے ہزار چھپایا اور چاہا کہ کسی طرح یہ راز میرے نفس پر بھی آشکار نہ ہو لیکن وہ بنائے زیست ٹُوٹ کر پُرزے پُرزے ہوگئی اور قدم قدم پر اپنے دلخراش افراط سے مجھے دیوانہ و وحشت زدہ بنانے لگی! ہاں بعض اوقات ایسا بھی ہُوا کہ میرے ضمیر نے کہنہ مشقی کے باعث اپنی کج ادائیوں کا صحیح احساس نہیں کیا لیکن پھر اس فروگذاشت کی عقوبت میں کسی اٹل قانون نے مجھے اک ملزمِ مفرور کی طرح آد بایا کہ سانس تک لینی دشوار ہوگئی! میرے دل نے گڑ گڑا کر اور چلّا کر دُعا مانگی کہ اَب اپنے طرزِ عمل کو ضرور اک نئے سانچے میں ڈھال لُونگا۔ کہتے ہیں اے خدا! تو صادق دلوں کی سچّی گذارش کو رد نہیں کرتا!" تو حقِ برحق نے آواز دی کہ میں نے سُنا اور قبول کیا!

لیکن اِس پر بھی میں ہوں کہ اُس کی چشم پوشی کو عدمِ نگہداشت پر محمول کر کے بھُول جاتا ہوں کہ ایک ہستی ہے جو میرے نیک و بد پر ہر لمحہ نظر رکھتی ہے اور باغِ حیات کے خوش نگہت پھُولوں اور مُرجھائے ہُوئے غنچوں کو اپنے نازک کانٹے میں تولتی رہتی ہے اور اِک ذرّہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتی!!

بشیر احمد

اب ہے کیوں پیکرِ بیجاں کی ادا پر مفتون — آخر اب کیوں نہیں ظالم تجھے پروائے حیات
انتظار اس کے لئے موت سے بڑھ کر ہے ترا[1] — آہ مجنوں تری مشتاق ہے لیلائے حیات
ذرّہ سے مہر فلک ہے متحرک ہر چیز — شرم اے مدعی رتبۂ والائے حیات
کون کہتا ہے کہ ہو اُٹھ کے خراماں یکدم — کچھ تو لیکن حرکت کر بتقاضائے حیات
خار افتادہ نہ ہو پڑھ گلِ خودرو کا ورق — دیکھ اندھا نہ بن اے بادیہ پیمائے حیات
سچ کہا ہے کہ برابر ہے مرا اور سوتا — بے حیائی ہے جو غافل کو ہو دعوائے حیات

جا سوئے کوئے خموشاں کہ نہیں قابلِ خواب
یہ تماشا کدۂ شورش و غوغائے حیات

جلوۂ قدرت

یہ جانفروز نظارے یہ رنگِ باغِ جہاں — یہ صبح و شام کے جلوے یہ دلفریب سماں
یہ فرشِ خاک، یہ گلکاریاں، یہ صحنِ چمن — یہ شمعِ انجمِ تاباں، یہ سقفِ چرخِ کہن

یہ کشتِ زار، یہ سبزہ، یہ وادیٔ گُل پوش — سکُونِ دشت، یہ صحرا کا منظرِ خاموش
فضائے دامنِ کہسار، یہ اوجِ کوہِ گراں — صفائے آئینۂ آب، جوشِ سیلِ رواں

یہ آفتابِ لبِ بامِ دستِ شامِ نورانی — یہ چرخ پر مہِ تاباں کی جلوہ افشانی
یہ شب کے پردے ہیں گوہر فشائیٔ شبنم — یہ نُورِ صبح، یہ تاروں کی محفلِ برہم

یہ سرد سرد ہوا، موسمِ زمستاں کی — یہ عہدِ گل، یہ فضا گلشن و بیاباں کی
نسیمِ صبح کے جھونکوں کی عطر افشانی — یہ طائرانِ نوازن کی زمزمہ خوانی

---

[1] الانتظار اشد من الموت۔

شبابِ فصلِ بہاری یہ جوشِ خندۂ گُل
یہ جامِ غنچۂ نوخیز رشکِ ساغرِ مُل
یہ جھلملاتے ہُوئے اوجِ چرخ پر تارے
سوادِ شام، بہارِ شفق کے نظّارے

یہ قطرہ بارئ ابرِ کرم، یہ دَل بادل
یہ کالی کالی گھٹائیں، یہ برق کی مشعل
فرازِ کوہ سے گرنا، یہ آبشاروں کا
اندھیری رات یہ پانی میں عکس تاروں کا

یہ مشتِ خاک، یہ رنگینئ بہارِ شباب
یہ چشمِ مست، یہ کیفیتِ خمارِ شباب
یہ بانکپن، یہ ادائیں۔ یہ جامہ زیبئ حُسن
یہ سوز و سازِ محبت، یہ دلفریبئ حُسن
یہ سب کرشمے ہیں کس کے؟ خدا کی قدرت کے
یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کی قدرت کے

برق دہلوی

جذباتِ عالیہ

علامۂ اقبال

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا
قسمتِ بادہ [illegible]ام است اینجا

گرامی

عشق را لاف مزن کار تمام ست اینجا
عشوہ مفروش کہ محمود غلام ست اینجا
حکمِ عشق ست کہ از اہلِ ریا بگریزیم
آنچہ بر شیخ حلال ست حرام ست اینجا
عقل را خطبہ مخواں، عقل ز خود بیخبر ست
نام را سکہ مزن ننگ ز نام ست اینجا
خانقہ نیست بسجادہ و تسبیح چہ کار
مجلسِ ماست ہمہ شیشہ و جام ست اینجا
بزمِ عشق ست سخن [illegible] بچشم و ابرو
خامشی چہرہ برافروخت کلام ست اینجا

معنئ بیخودئ عشق مپرس از واعظ
پختہ کار ست ولیکن ہمہ خام ست اینجا

گوہر سّرِ امامت ز نبوت خیزد
آنکہ سجادہ نشیں است امام ست اینجا

جامِ جم گیر کہ در میکدہ خوش گفت اقبالؔ[1]
قسمت بادہ باندازۂ جام ست اینجا

جلوہ افروز گرامی ست بخاکِ پنجاب
آفتاب ست ولے برلبِ بام ست اینجا

[1] لہ [illegible] ڈاکٹر اقبال

مرزا اعجاز دہلوی

صحنِ کعبہ نہ سہی۔ کوچۂ جاناں ہوتا
دل بہلنے کے لئے کوئی تو ساماں ہوتا

گر نہ تھی عشرتِ تمکینِ تعقل نہ سہی
اے جنوں رابطۂ دست و گریباں ہوتا

شعلۂ طور کے قابل جو نہ تھا تو دہ دل
شعلۂ آتشِ بہرام فروزاں ہوتا

گرمِ ناوک فگنی حسن ہے ہر چار طرف
کاش اس دل میں بھی اک حسن کا پیکاں ہوتا

نازشِ حسن کا ہر گام پہ ہے دامِ فریب
لطف ہوتا دلِ ہشیار جو ناداں ہوتا

ہے عبث شکوۂ بے مہرئ ابنائے زماں
کاش دنیا میں کسی کا کوئی اے جاں ہوتا

کاش لگتا کبھی اس نخلِ وفا میں بھی ثمر
کبھی احسان بھی شرمندۂ احساں ہوتا

قدر کھلتی تجھے بیدرد مرے نالوں کی
تیرے دل میں بھی جو کوئی غم پنہاں ہوتا

دیکھ لیتا جو گلِ ناز کا جلوہ اعجاز
پھر تو ہر تارِ نگہہ رشکِ گلستاں ہوتا

وحشتِ کلکتوی

دل ہنگامہ جُو ہے اور ہجومِ صد تمنا ہے
نہیں کھلتا کہ آخر خاص اس کا مُدعا کیا ہے

نہیں اک ذرہ بھی عالم میں جد و جہد سے خالی
کشاکش سعی کی ہے عام، گویا سب کو سودا ہے

تلاش آخر ہے کس کی باعثِ محویتِ عالم
سمجھ ہی میں نہیں آتا الٰہی ماجرا کیا ہے

جہاں کی دلفریبی ہائے گوناں گوں کا کیا کہنا
مگر جب غور سے دیکھو تو ہر نقش ایک دھوکا ہے

اُسی کا حق ہے جو ثابت کرے حق زورِ بازو سے
یہ لفظ دلفریب خلق معنے سے معّرا ہے

ضعیف از بسکہ ہے بنیاد فرقِ امتیازی کی
بہت مشکل ہے کہنا کون ادنےٰ کون اعلیٰ ہے

جبینِ شوق ہے اور سجدۂ محرابِ دل وحشت
یہ کس کا گوشۂ ابرو نہ جانے کارفرما ہے

تقریظات

فارسی آموز یا فارسی جدید۔ حجم دو سو چوالیس صفحہ۔ لکھائی چھپائی سر رشتہ تعلیم کے مطابق۔ کاغذ ولایتی قیمت ایک روپیہ مصنفہ میر حسین علی صاحب سابق اسسٹنٹ کونسل خراسان (ایران) جدید فارسی ترقی کرتے کرتے قدیم فارسی سے اس قدر مختلف ہوگئی ہے کہ اگر کوئی درہ نادرہ اور ابوالفضل پڑھا ہوا آج ایران میں جائے تو وہاں اسکی حیثیت ایک جاپانی سیاح سے زیادہ نہ ہوگی جدید فارسی میں ہزاروں انگریزی فرانسیسی اور ترکی الفاظ داخل ہوگئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان کے سر رشتہ ہائے تعلیم فارسی کورسوں کے لئے ایسی کتابیں مرتب کرائیں جو طالب علموں کو موجودہ فارسی سے روشناس کرا سکیں۔ فارسی آموز اس نہج پر اور اس غرض کے لئے تصنیف کیگئی ہے۔ اس کتاب کے تین باب ہیں پہلے باب میں چوبیس درس اور چھ مشقیں ہیں دوسرے باب میں سولہ حکایتیں اور سات مضمون ہیں تیسرے باب میں دس نقول دستاویزات اور چودہ نقول مکتوبات ہیں تمام حکایات اور درس روزمرہ کی بامحاورہ جدید فارسی میں لکھے گئے ہیں حکایات معنی خیز اور دلچسپ ہیں نقول دستاویزات تین حیثیت سے بھی قابل قدر ہیں مولف موصوف نے اپنے طویل قیام ایران میں شاہ ایران کے اُن فرمانوں کی نقول جو ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء تک ایرانی پارلیمنٹ کے استقرار و التوا کے متعلق جاری ہوئے حاصل کیں۔ آخر میں جدید فارسی کے ایک ہزار الفاظ کا فرہنگ ہے یہ کتاب تعلیم جدید کے اصول پر ترتیب دی گئی ہے۔ میر صاحب معاون کونسل خراسان کی حیثیت سے مدتوں ایران میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے فارسی میں اہل زبان کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ آپ نے اس کتاب میں الفاظ قدیم کے جدید تغیرات جدید محاورات۔ جدید طرز تکلم و تحریر کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کرکے فارسی دوست طالب علم کے لئے واقفیتِ زبان کا ذخیرہ پیش کر دیا ہے۔ ہم ممبرانِ سر رشتہ تعلیم پنجاب سے امید کرتے ہیں کہ وہ اسے داخل نصاب فرما کر مصنف کی محنت و جگر کاوی کی قدر کرینگے ۔

کتاب ملنے کا پتہ۔

میر امجد علی ہومزنگ۔ لاہور

النساء نظم و نثر کا ایک نسوانی ماہوار رسالہ جو زیر ادارت بیگم صاحبہ مسٹر ہمایوں میرزا بیرسٹرایٹ لاء و زیر نگرانی انجمن خواتین دکن ہمایوں نگر صغریٰ منزل حیدر آباد سے شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ تین روپے

اس رسالہ کو دیکھ کر ہمیں اپنی اس رائے میں ترمیم کرنی پڑی کہ

"اُردو کا کوئی نسوانی پرچہ ایسا نہیں جو کسی اعلےٰ تعلیمیافتہ خاتون کے مطالعہ کے لائق ہو"

النساء اک اپ ٹو ڈیٹ نسوانی رسالہ ہے قابل ترین خواتین اس رسالہ کی مضمون نگار ہیں مولانا محب حسین اڈیٹر معلم نسواں جنکی عمر کا ایک حصہ طبقۂ نسواں کی خدمات میں گذرا ہے۔ النساء کے مخصوص اہل قلم میں ہیں۔ اسکے علاوہ خود اڈیٹرس صاحبہ اعلیٰ تعلیمیافتہ ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان کی نسوانی دنیا میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں وہ بہت ہی مفید و گرانقدر کتابوں کی مصنف۔ نظم و نثر کی مشاق ملک و قوم کے درد میں شریک ہیں۔ النساء کی قابل فخر خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواتینِ ہند کو ملکی و قومی تحریکات میں حصہ لینے کی ترغیب دلاتا ہے۔ اسکے مضامین جذبات وطن میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں ضرورت ہے کہ اس قسم کے نسوانی اخلاقی و سیاسی رسالے ملک کی ہر خاتون کے مطالعہ میں ہوں ۔

شمس العلماء حضرت آزاد مرحوم کی تازہ ترین تصنیف نگارستانِ فارس جس میں شعرائے فارس کا تذکرہ آبِ حیات کے رنگ میں اُستاد رودکی سے بیکرواقف لاہوری تک لکھا ہے ہمارے پاس پہنچ چکا ہے۔ اسوقت مکمل تنقید نہیں ہو سکی۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں اس کمی کو پورا کر دیا جائیگا ۔

صبح وطن۔ پنجاب کے مشہور افسانہ نویس پنڈت سُدرشن جرنلسٹ کے بارہ ملکی و قومی افسانوں کا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ ملک کی موجودہ تحریکات کو دلچسپ افسانوں کے لباس میں اہل ملک کے لئے جاذب توجہ بنایا ہے حقیقت میں صاحب موصوف نے یہ ملک و قوم کی ایک گرانقدر خدمت انجام دی پیرایہ بیان سادہ سلیس دلکش اور بہت مؤثر ہے حجم دو سو صفحے کے قریب لکھائی چھپائی اچھی سرورق پر ایک دلکش رنگین تصویر ہے قیمت غیر مجلد ۱۲؍ سنہری جلد ۱؎ راما کرشنا گوالمنڈی لاہور سے طلب کریں

(تاجور)